

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

خواندنیوں کی آن لائن لائبریری

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی

OCTOBER
2016



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ماڈل: رانیا خان
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوتو گرافی: موسیٰ رضا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

صالحہ محمود

ایڈیٹرز

سعدی محمود جعفری، بلال جعفری

نائنہ امریکہ، فراز جعفری

E-Mail: frazjafr@pol.com

نائنہ UAE، عمیر عسلی جعفری

E-Mail: uspruhit@emirates.aol.ae

نائنہ لندن، شبانہ آصف خان

آرٹسٹ: چنید انصار

پاک سوسائٹی

پاک سوسائٹی
پاک سوسائٹی

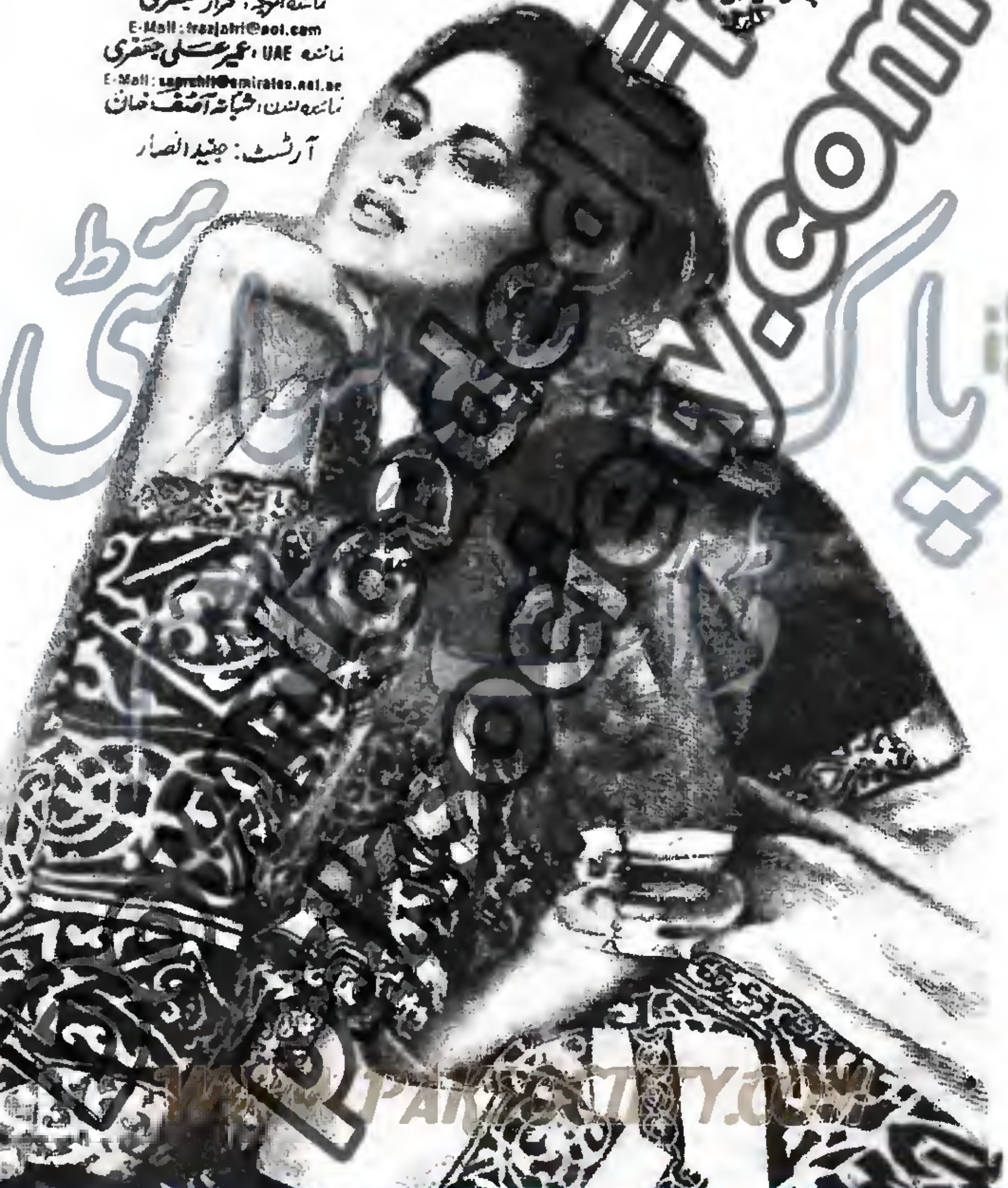
پاک سوسائٹی

پاک سوسائٹی

پاک سوسائٹی

پاک سوسائٹی

پاک سوسائٹی



WWW.PAKSOCIETY.COM

ناولٹ

۶۸ عائشہ فاروق اعتبارِ محبت
۱۳۰ مریم شیراز رشتوں کی ڈور

انٹرویو

۹ عیشہ نور عروہ

سلسلے وار ناول

افسانے

۸۲ فاطمہ خان ہے محبت کی گواہی کافی
۸۸ قرۃ العین اداسی پیرہن اپنا
۱۰۰ عائشہ ذوالفقار زندگی کے رنگ
۱۰۸ مریم فاطمہ مجھے چاہا تھا
۱۵۶ جویریہ بانو سوہنی
۱۶۰ صبا خان قسمت
۱۳۲ جتنا اصغر زرد پتوں کا موسم
۲۰۸ فرح ناز قربانی ذاتِ نمونہ
۲۰۲ حوریتہ سعد خوشبو کا حصار

۱۲ تھر اوں کی گلیوں میں عشق قمر شہزاد
۴۱۸ روٹائے عبدالقوم ویدہ غیرت نگاہ
۱۱۲ شازیہ مصطفیٰ زندگی، پھول، محبت، خوشبو

ناولٹ

۴۴ فریدہ فرید ہمیں مار گئی تیری چادر بیا
۳۲ شفاء ناز کوہِ عشق

اکتوبر 2016ء
جلد نمبر 20 شماره نمبر 10
قیمت 60 روپے

www.facebook.com/rida.digest

زرگالانہ بڈی ایجنسی جسٹری

720 روپے

34535726

پبلشر و ایڈیٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ ڈی بلاک 2۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

انتباہ

یادنامہ "ردائے دل" انجمن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے علاوہ کسی بھی قسم کی اشاعت یا کاپی رائٹ یا ڈراما یا ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار کسی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کرادے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ "پبلشر"۔

۲۴۶	صالحہ محمود	۷	سندیے	صالحہ محمود	روائے جنت
۲۵۴	ثریا اقبال	۲۳۲	کچن	صدف سعد	روا کی ڈائری
۲۵۷	شہلا مشائق	۲۳۲	سنگھار	شہلا مشائق	ذرا پھر سے کہنا
۲۳۴	نورین ملک	۲۳۹	اشعار	نورین ملک	خوشبو
۲۵۱	ادارہ	۲۳۶	دوستوں کے نام پیغام	نورین ملک	اس ماہ میں





الحمد للہ! عید الاضحیٰ کے شمارے کی بے حد پذیرائی ملی۔ اللہ کا شکر ہے۔ آپ سب کی محنتوں کا ردا ثمر ہے۔ ورنہ روا کے آتے ہی کئی شمارے وجود میں آئے لیکن جلد ہی وہ غائب بھی ہو گئے۔ یہ دیکھنا آپ کی نظروں میں سب کچھ ہوگا۔

الحمد للہ! ردا ہر قدم ہر مرحلے پر آپ کے تعاون سے آگے کی طرف بڑھتا ہی گیا۔ ہم نے کبھی اس کو اپنی کمائی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اپڈیج کے باوجود ہم کسی کے پیچھے نہیں بھاگے اور ہم نے نئے لوگوں کو ایک سمت میں ڈال دیا۔ لکھنے کا شوق میں نے لکھنے کی حد تک رکھا کہ میں دوسروں کو موقع دوں ان کو بناؤں جو کچھ میں نے سیکھا وہ سیکھاؤں۔ اس میں، میں کامیاب رہی۔ یاد رکھیے خود نمائی کا جذبہ کبھی اپنے اندر مت لائیے اپنی تسکین اپنی روح کے لیے لکھیے۔ یہ بات ہمارے استاد نے ہمیں بتائی تھی کہ شاعری کو خود نمائی کا جذبہ مت بنائیے گا سو ہم آج آپ سے شیئر کر چلے جو کچھ علم آپ کے اندر ہے وہ کوئی نہ آپ سے چھین سکتا ہے نہ آپ کا راستہ روک سکتا ہے۔ ورنہ کبھی ایک معمولی سی رائٹر آپ کے سامنے چیف ایڈیٹر بن کر سامنے نہ آتی جہاں کہیں بھی آپ لکھ رہے ہیں لکھتے رہیے۔ اس سوچ کے ساتھ کہ جو آپ ہیں وہ سامنے آئیں گی۔ خود ادارے کو آپ کی ضرورت پڑ جائے گی کہ آپ لکھیے۔

یہاں سفارش نہیں ہے بس ایک ترتیب اور ایمان داری کا عمل ہے۔ مسلسل محنت ہی انسان کو عروج پر لاتی ہے۔

لکھتے رہیے۔ آپ سند یہ ضرور لکھیے ردا گائیڈ کارنر میں ہم صرف نئے لکھنے والوں کو موقع دیتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کے لیے اہم بات یہ ہے کہ وہ ردا کے مستقل سلسلوں میں آتے رہا کریں اس سے انہیں لکھنے کی پختگی حاصل ہو جائے گی۔ مستقل سلسلے معلومات کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

آپی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ردا ڈائجسٹ 6 اکتوبر 2016ء

ادب و شہ

غضب کرنے اور مانگ کر لینے کا بیان

نکاح دوسرے آدمی کے لڑکے سے اس شرط پر کرتا ہے کہ وہ اپنی لڑکی کا نکاح اس کے لڑکے کے ساتھ کرے اور درمیان میں مہر مقرر نہ ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی آدمی اپنے بھائی کی لاش کو نہ لے۔ نہ مذاقا اور نہ حقیقت میں، پس جو آدمی اپنے بھائی کی لاش لیتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اسے واپس کرے۔“ (ترمذی۔ عن سائب بن یزید) (وضاحت: کوئی معمولی شے بھی نہ مذاقا اور نہ بیچ بیچ یعنی چاہیے اور کبھی غلطی سے بھی کوئی چیز لے لیں تو وہ چیز واپس کر دیں۔)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی ہاتھ نے جو مال ظلماً پکڑا اس کو اس نے واپس کرنا ہے (چاہے اسے دنیا میں دے دے چاہے آخرت میں)۔“ (ترمذی۔ عن سمرہ)

براء بن عازب کی اونٹنی ایک باغ میں داخل ہوئی۔ اس نے کھیتی کو خراب کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”باغ والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ دن میں اپنے باغ کی حفاظت کریں اور اگر رات میں چوپائے کھیتی کو خراب کریں تو چوپائے کے مالک اس کے ذمہ دار ہوں گے۔“ (مالک۔ عن حرام بن سعد بن حبیب)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی آدمی جانوروں کے پاس جائے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی نے ایسی بے آباد زمین کو آباد کیا جو کسی کی ملکیت نہ ہو وہ اسی کی ملکیت ہے۔ کسی کو دوسرے کی زمین میں کسی چیز کی کاشت کرنے کا حق نہیں ہے۔“ (ترمذی۔ عن سعید بن زید)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”شورو غل کرنا، گھڑ دوڑ میں دوسرا گھوڑا ساتھ لے جانا، اولاد بدلا کی شادی کرنا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ مال لوٹنے والا وہ ہم میں سے نہیں۔“ (ترمذی۔ عن عمران بن حصین)

وضاحت: گھڑ دوڑ میں ایک آدمی جو کھتا ہے کہ فلاں گھوڑا میرے گھوڑے سے سبقت لے جائے گا تو وہ اس کی رکاوٹ کے لیے ایک آدمی میدان میں کسی جگہ کو مقرر کرتا ہے کہ فلاں گھوڑا دوڑتا ہوا وہاں سے گزرے تو تمہیں زور سے شورو غل کرنا ہوگا اور شورو غل سے متاثر ہو کر وہ گھوڑا اپنی رفتار کو تیز نہیں رکھ سکے گا۔ یا ایک آدمی گھوڑا دوڑاتے وقت گھوڑے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا گھوڑا رکھتا ہے کہ اگر پہلا گھوڑا پیچھے رہتا نظر آئے گا تو اس کو چھوڑ کر وہ ساتھ والے گھوڑے پر سوار ہو جائے گا تاکہ مقابلہ میں کامیابی ہو۔

اولاد بدلا میں یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی لڑکی کا

(ترجمہ) "اے اللہ اس کے پیٹ کو سیر فرما۔"
(ترمذی۔ عن رافع بن عمرو غفاری)

شفعہ کا بیان

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"پڑوسی (گھریا زمین میں) شفعہ کا زیادہ حق دار
ہے۔ بشرطیکہ دونوں کا راستہ ایک ہو۔ اگر پڑوسی
موجود نہ ہو تو اس کا انتظار کیا جائے۔" (ابوداؤد۔
ترمذی، ابن ماجہ، عن جابر)

(وضاحت: ایک پڑوسی کو اپنی جائیداد
فروخت کرنے سے پہلے اپنے پڑوسی سے پہلے
پوچھنا چاہیے کہ آپ یہ خریدنا چاہتے ہیں یا نہیں
اگر وہ خریدنا چاہتا ہو تو پہلے اسے فروخت کرنا
چاہیے اگر وہ نہ خریدنا چاہے تو کسی اور سے رابطہ
کریں اور اگر راستہ الگ الگ ہو تو پھر یہ ضروری
نہیں ہے۔)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "گھریا
کاروبار میں شریک شفعہ کا زیادہ حقدار ہے اور
شفعہ ہر چیز میں ثابت ہے۔"

(ترمذی۔ عن ابن عباس)

(وضاحت: جب دو آدمی مل کر کوئی کاروبار
کریں یا کوئی جائیداد خریدیں پھر ان میں سے کوئی
آدمی اپنا حصہ بیچنا چاہے تو اپنے کاروبار میں
شریک بھائی کو پہلے بتائے اگر وہ خریدنا چاہے تو
اس کا زیادہ حق ہے اور وہ کسی اور کو بیچنے کی
اجازت دے تو پھر کسی اور کو بیچ سکتا ہے۔)

اجرت دینے کا بیان

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے
سے پہلے ادا کرو۔" (ابن ماجہ۔ عن عبد اللہ بن عمر)

اگر ان کا مالک موجود ہو تو اس سے اجازت طلب
کرے۔ اگر موجود نہ ہو تو 3 بار آواز دے اگر
جواب آئے تو اس سے اجازت حاصل کرے اور
اگر جواب نہ آئے تو جانوروں کا دودھ پی لے
لیکن اٹھا کر نہ لے جائے۔ (ابوداؤد۔ عن سمرہ)
(وضاحت: یہ حکم بھوک اور لاچاری کی
صورت میں ہے ورنہ کسی مسلمان کے مال کو اس کی
اجازت کے بغیر حاصل کرنا درست نہیں۔)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے غزوہ
حنین کے دن چند زرہیں (جنگی لباس) عاریتاً
(ادھار) حاصل کیں۔ میں نے پوچھا۔ "اے
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ اپنے قبضے
میں رکھنے کے لیے لے رہے ہیں؟" آپ صلی
اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: "نہیں عاریتاً یہ قابل
واپس ہوں گی۔"

(ترمذی ابوداؤد عن امیہ بن صفوان)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"عاریتاً لی ہوئی چیز کو واپس کیا جائے اور
(دودھ کے لیے حاصل کیا جانے والا) واپس
کیا جائے اور قرض ادا کیا جائے اور سرپرست
قرض ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔"

(ترمذی۔ عن ابی امامہ)

میں (ابھی چھوٹا لڑکا تھا انصار کی کھجوروں پر
پتھر پھینکتا تھا۔ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
پاس لایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:
"اے لڑکے! تم کھجور کے درختوں پر پتھر کیوں
پھینکتے ہو؟" میں نے جواب دیا۔ "کھجوریں
کھانے کے لیے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا: "پتھر مت پھینکو جو نیچے گری ہوئی ہوں اب میں
کھا لیا کرو پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا کی

Downloaded From Paksociety.com



ملاقات

عاشبہ نور

عروہ

☆ آنرز کیا ہے۔
☆ شوبز کی طرف کیسے آنا ہوا؟
☆ میں اور ماورا اسلام آباد سے ایک میگزین شو کرتے تھے۔ ایوننگ میں۔ وہیں سے کام کا آغاز ہوا اور پھر ڈیفرنٹ چینلز نے اپروچ کیا تو کام کا سلسلہ چل نکلا۔
☆ وہ ڈراما جو وجہ شہرت بنا؟
☆ ”اڈاری“ جو آپ لوگ آج کل دیکھ رہے ہیں۔
☆ آپ نے اڈاری میں مخصوص لہجے میں اپنے ڈائلاگ بولے ہیں تو اس کے لیے آپ نے خود محنت کی یا ڈائریکٹر نے آپ کو ایسا کرنے کے لیے کہا؟
☆ سیراں کا کردار گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی کا کردار تھا جس کے ماں باپ گانے وغیرہ گاتے تھے تو

خوب صورت چہروں کی بھیڑ میں اپنی منفرد شناخت بنانے عروہ نے بہت جلد اپنا ایک نمایاں مقام بنا لیا ہے۔
آج کل آپ ان کو ”اڈاری“ ڈرامے میں ”سیراں“ کے کردار میں دیکھ بھی رہے ہیں اور سیراں بھی رہے ہیں، ان سے ایک دلچسپ ملاقات آپ سب کی نذر۔

☆ آپ کا نام؟

☆ عروہ، پیار کا نام بھی یہی ہے۔

☆ تاریخ پیدائش و مقام؟

☆ 2 جولائی 1991ء کراچی۔

☆ فیملی ممبر؟

☆ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔

☆ تعاقبی قابلیت؟

رواڈ آنسٹ 9 اکتوبر 2016ء

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک

سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

بہت معصوم ہوتے ہیں ان کے ساتھ ہونے والے
مظالم تو ہر ذی ہوش شخص کو دکھی اور متاثر کرتے ہیں۔
چلیں اب کچھ لائٹ سی باتیں ہو جائیں۔

☆ فلموں میں آنے کا کیا ارادہ ہے؟
☆ جی میں ایک فلم کر چکی اور بہت جلد آپ لوگ مجھے
بڑی اسکرین پر پھر دیکھ سکیں گے۔

☆ کھانے میں کیا پسند ہے؟
☆ میں کھانے کی شوقین ہوں فاسٹ فوڈ سے لے کر
دسی سب شوق سے مگر اعتدال میں کھاتی ہوں۔

☆ اس کا مطلب ہے آپ فٹنس کا خیال رکھتی ہیں؟
☆ جی بالکل! میں اپنی فٹنس کا خیال رکھتی ہوں اور جم
بھی جاتی ہوں ایکسرسائز کر لیتے۔

☆ آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
☆ خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے اتنا پیارا بنایا
ہے (ہنستے ہوئے)۔

☆ ذہانت متاثر کرتی ہے یا خوب صورتی؟
☆ مردوں میں ذہانت اور خواتین میں خوب صورتی۔
☆ اڈاری کافی بیک کیسٹا آپ کو؟

☆ بہت زیادہ اچھا جہاں بھی جاؤں سب مجھ سے
اڈاری کی باتیں کرتے ہیں۔
☆ اگر میک اپ نہ ہوتا؟

☆ تو مجھے کوئی ٹینشن نہ ہوتی کہ خدا کا شکر ہے بنا
میک اپ بھی اچھی لگتی ہوں۔
☆ فیشن سے دلچسپی؟

☆ بہت زیادہ ہے اور پھر جس فیلڈ میں ہوں اس میں
فیشن سے اپ ڈیٹ رہنا پڑتا ہے۔ ویسے میں عام
روٹین میں جینز کے ساتھ کوئی بھی ٹی شرٹ ویئر کرتی
ہوں۔

☆ شو بزنس کے بارے میں رائے؟
☆ مجھے تو اس فیلڈ میں بہت مزا آ رہا ہے اور انسان
خود اپنے یا میرا ہوتا ہے۔ ماحول یا براڈ فیشن نہیں۔ آپ
اپنے ہیں تو سب اچھے ہیں آپ اچھے نہیں تو آپ کو کوئی

میں نے بھی کوشش کی اپنے گھر میں کام کرنے والی میڈ
کے لب دلچے کو نوٹ کیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی
خواتین کو بخور دیکھا اور ان کا مشاہدہ کیا تبھی میں
”میراں“ کا مخصوص لوجہ بولنے میں کامیاب ہوئی اور
ڈائریکٹر صاحب کی محنت بھی شامل تھی تبھی میراں کا
کردار اتنا بھر پور نکل کر آیا۔

☆ آپ کے ساتھ بشری انصاری بھی ہیں اڈاری میں
تو ان سے کیا سیکھا؟

☆ وہ ایک وراثت ادا کارہ ہیں ان سے ہم جو نیر زکو
بہت زیادہ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک تو ان کی نیچر اتنی
سوئیٹ ہے کہ دوست بندہ ان کے پاس بیٹھ جائے بس
ان کا ہو جاتا ہے اور میں نے بھی ان سے بہت کچھ
سیکھا۔ میراں کے کردار کو جاندار بنانے میں میراں کی
ماں یعنی بشری آئی کی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کے
ڈائلاگ کا انداز اتنا نیچرل ہوتا ہے کہ آپ بھی پھر اپنا
100 پرسنٹ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆ آپ کو یقین تھا کہ میراں کا کردار اتنا مقبول ہوگا؟
☆ مجھے یقین تو نہیں تھا مگر ہاں اتنا پتا تھا کہ
”اڈاری“ ایک حقیقی اسٹوری پر ڈرامہ ہے اور پھر اس کا
ٹاپک کافی حساس ہے اور عورت کی مظلومیت کے گرد
گھومتا ہے تو بس مجھے اس کردار اور اس ڈرامے کی
اسٹوری نے متاثر کیا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ سب لوگ
اسے پسند کر رہے ہیں۔

☆ آپ کو نہیں لگتا کہ یہ ٹاپک کافی بولڈ تھا؟
☆ بالکل بولڈ تھا مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ یہ ہمارے
معاشرے میں کہیں نہ کہیں ہوتو رہا ہے ناں بھی رائٹرنے
لکھا اور پھر ہم کب تک نظرس چراتے رہیں گے ایسے کم
سے کم لوگوں کو آگہی تو ملے گی ناں۔ آپ یقین کریں
اکثر خواتین مجھ سے ”کشف“ کے بارے میں پوچھتی
ہیں کہ کیا واقعی وہ ادارہ خواتین کی ہیلب کرتا ہے۔
ہمارے معاشرے میں مسائل بہت اور وسائل کم ہیں۔

☆ آخر کب تک ہم یونہی نظرس چراتے رہیں گے۔ بچے تو

سال تک کوئی ارادہ نہیں۔

اچھا نہیں لگے گا۔

﴿﴾ کفرحان سعید کے ساتھ آپ کو پر فارم کر کے کیسا لگا؟
☆ (ہنتے ہوئے) بہت اچھا اور فرحان کے سیٹ پر
ہونے کی وجہ سے کمفرٹ لیول بہت ہائی ہو گیا تھا۔

﴿﴾ مزا جاکسی ہیں؟
☆ مزا جانا میں ہنس مکھ ہوں مگر اگر غصہ آجائے تو پھر
بہت برا آتا ہے۔

﴿﴾ انٹرنیٹ سے دلچسپی؟
☆ مجھے تو بہت زیادہ ہے اور میں اپنے بیچ کے ذریعے
اپنے فینز کو اپنے نیو پروجیکٹ کے بارے میں اپ ڈیٹ
کرتی رہتی ہوں۔

﴿﴾ کھانا ڈاننگ نیبل پر کھانا پسند ہے یا سٹریو خان پر؟
☆ مجھے تو ڈاننگ نیبل پر کھانا پسند ہے اور ہمارے
ہاں ہمیشہ سے ڈاننگ نیبل پر ہی کھانا کھایا جاتا ہے۔

﴿﴾ ماڈلنگ اور اداکاری میں آپ کو کیا زیادہ پسند ہے؟
☆ ویسے تو دونوں شعبے اچھے ہیں مگر مجھے زیادہ مزا
اداکاری کر کے آتا ہے کہ اس میں اپنی ذات سے الگ
آپ کسی اور کردار کو پر فارم کر رہے ہوتے ہیں تو دلچسپ
لگتا ہے۔

﴿﴾ چاند دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
☆ کہ یہ اتنا خوب صورت ہے اور اس کی روشنی کتنی
دلکش ہے۔

﴿﴾ چٹنٹھی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟
☆ زیادہ تر سو کر یا پھر آؤٹنگ وغیرہ کر کے۔

﴿﴾ محبت کے بارے میں خیال؟
☆ محبت ایک خوب صورت جذبے کا نام ہے اور محبت
بنا زندگی ادھوری ہے۔

﴿﴾ پسندیدہ چینل؟
☆ ہم نی وی۔

﴿﴾ تہوار مناتی ہیں؟
☆ جی ہاں بہت شوق سے کہ یہ ہمارے مذہبی تہوار
ہیں اور پھر سب سے ملنا جلنا ہو جاتا ہے ورنہ ہم تو اپنے
کام میں اتنے بڑی ہوتے ہیں کہ رشتے داروں وغیرہ
سے ملنا جلنا ہوتا ہی نہیں۔

﴿﴾ پسندیدہ سواری؟
☆ کار۔

﴿﴾ آج کی سب سے بہتر شوق سے کہ یہ ہمارے مذہبی تہوار
ہیں اور پھر سب سے ملنا جلنا ہو جاتا ہے ورنہ ہم تو اپنے
کام میں اتنے بڑی ہوتے ہیں کہ رشتے داروں وغیرہ
سے ملنا جلنا ہوتا ہی نہیں۔

﴿﴾ پہلی ملاقات پر کیا کہتی ہیں؟
☆ اس کی ڈرائنگ اور بات کرنے کا انداز۔

﴿﴾ آپ دونوں ہمیشہ ایک ہی پروفیشن میں ہیں تو کبھی
جیلنسی فیل ہوئی؟
☆ نہیں ایسا ابھی تک تو کبھی نہیں ہوا ہم دونوں ہمیشہ
آپس میں بہت فرینڈلی ہیں اور اپنی ہر بات ایک
دوسرے سے شیئر کرتے ہیں۔

﴿﴾ تنقید برداشت کرتی ہیں یا؟
☆ (سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے) دیکھیں! اگر
تنقید مثبت ہے تو ضرور توجہ سے سنتی ہوں مگر اگر بے مقصد
ہو تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی ہوں۔

﴿﴾ اگر مالی ووڈ سے آفر ہوئی تو؟
☆ فی الحال تو میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے وہاں جا کر
کام کرنے کا۔ کوئی بہت اچھی آفر ہوئی تو سوچوں گی۔

﴿﴾ بہت خوب صورت ہے اور خدا کی نعمت ہے اس
لیے بھر پور طریقے سے گزارنی چاہیے۔

﴿﴾ اچھی اور بری عادت بتائیں؟
☆ اچھی عادت بہت پر خلوص ہوں اور بری عادت
غصے کی تیز ہوں۔

﴿﴾ شہرت، محبت اور دولت میں سے کیا لینا پسند کریں گی؟
☆ پہلے محبت، پھر شہرت اور دولت کی اتنی خواہش نہیں
خدا کا کرم ہے بہت دیا ہے اس نے۔

﴿﴾ شادی کا کب تک ارادہ ہے؟
☆ میری ماما کا بس حیلے تو فوراً پکڑ کر میری شادی کروا
دیں۔ پرائیسی میں کچھ کام کرنا چاہتی ہوں تو اس کے ایک دن

سلسلے وار ناول

صحرانوں کی انگیبوں میں محبت

غٹوئی نے اپنی ماما کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور جو اذیت میں اٹھا رہی ہوں وہ آٹھ سال سے ہے ماما! میرا ڈر و خوف میرا اعتماد، میرا بھرم یہاں تک کہ میری شخصیت اس آٹھ سال کی بچی کے اندر گھٹ گھٹ کر مر چکی ہے جسے میں لاکھ کوششوں کے باوجود بھی زندہ کرنا چاہوں بھی تو نہیں کر سکتی آج تک آپ کے علاوہ کسی کو



دوست کسی کو ہمراہ نہیں بنایا اس ڈر سے کہ کہیں وہ میرا مذاق نہ اڑائے مجھ سے ہمدردی نہ کرے اور یہی سب میں نہیں چاہتی۔

”صرف اپنے بارے میں سوچتی ہو میں تمہارے ڈیڈو کبھی ان کے بارے میں بھی سوچا ہے ہم تمہیں اس طرح دیکھ دیکھ کر کیسے جیتے ہیں اگر ہنتے ہیں بولتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ روتے نہیں یا ہمیں غم نہیں ہے سب سے بڑا غم سب سے بڑا روگ تم ہو ہمارے لئے مگر تمہیں اس کی رتی بھر پرواہ نہیں میں جانتی ہوں اس آٹھ سال کی بچی میں تمہاری شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے مگر چندا کبھی کبھی حقیقت کو نظر انداز بھی کرنا پڑتا ہے ورنہ ہماری زندگی جہنم بن جائے گی جانے میرے اور تمہارے ڈیڈو کی زندگی کتنی ہے آج ہیں کل نہیں اس کے بعد.....“

”خدارا ماما! اس طرح تو مت کہئے۔“ غنوی تڑپتی ہوئی سبرینہ کے گھٹنے پکڑ کے بیٹھی تھی سبرینہ کی آنکھوں

قسط نمبر 2



میں بھی اپنی لخت جگر کو دیکھ کر ایک سمندر ہلکولے لیتا تھا جو آج سارے بندھ توڑ بیٹھا تھا۔

”یہ بھی ایک سچ ہے جو آتا ہے اسے جانا بھی پڑتا ہے۔“

”تو پھر ممدعا کیجئے میں آپ لوگوں سے پہلے مر جاؤں۔“

”غٹوئی۔“ سبرینہ نے صہج کے اسے اپنے سینے سے لگایا تھا۔

”کیوں اور دکھ دیتی ہو؟ ٹھیک ہے نہیں کرنی نا شادی مت کرو مگر آج کے بعد ایسی واہیات بات منہ سے بھی

مت نکالنا۔“ دونوں ایک دوسرے سے لگی اپنا دکھ اپنا غم ہلکا کر رہی تھیں۔ سبرینہ نے اس کے سر پر شفقت بھرا بوسہ لیا اور دل سے اس کے آگے کے لئے دعا نکالی تھی۔

☆☆☆☆

ڈی ایس پی سید اذکار علوی اپنی جیب سے مفرور انہ چال چلتا ہوا اندر اپنے آفس میں داخل ہوا تھا، پٹھے سے تو وہ میجر تھا مگر ایک کیس کے سلسلے میں اس کو یہاں کراچی بلوایا گیا تھا جسے وہ ہینڈل کر رہا تھا ابھی کچھ ہی ہفتے پہلے اس نے یہاں کا چارج سنبھالا تھا سارے چھوٹے بڑے آفیسرز اس کی شخصیت اس کے رعب دیدنے کی وجہ سے ذرا سوچ سمجھ کر ہی بات کرتے تھے سید اذکار علوی کے بیٹھتے ہی انسپکٹر ذاکر حیات ایک فائل لے کر اندر داخل ہوا تھا۔

”سبرینہ...“ اس نے پہلے سید اذکار علوی کو سلوٹ کیا تھا اور پھر وہ فائل جو اس کے ہاتھ میں تھی سید اذکار علوی کے آگے ٹیبل پر رکھ دی تھی۔

”ہوں... سٹ۔“ اس نے انسپکٹر ذاکر حیات کو سامنے چیر کر بیٹھنے کا اشارہ دیا تھا سید اذکار علوی نے فائل کھولی سامنے کسی ہوش اڑا دینے والی دو شیزہ کی تصویر تھی جو شاید کسی بھی زائد و طالب کا ایمان با آسانی بہکا سکتی تھی۔

”سر یہ از ایلا ہے ایک کلب سگر مگر میں نے جب اس کی انکوائری کی تو پتہ چلا یہ صرف سگر ہی نہیں بلکہ امیرو رئیس لڑکوں کو اپنے حسن کے جان میں پھنسا کے ان کا بہت سا بینک بیلنس اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر لیتی ہے اس کے علاوہ یہ کم از کم پندرہ سولہ سال کی لڑکیوں کو گڈ نیپ کرواتی ہے ان کو نیند کے ایسے بے ہوش کر دینے والی انجکشن یا کپسول دیتی ہے کہ ان لڑکیوں کو کبھی نہیں پتہ ہوتا وہ کیا کر رہی ہیں اور پھر ان کی ایسی ایسی واسیات موویز خود بنا کر انہیں بلیک میل کر کے ان سے اپنا کام نکھواتی ہے یا تو ان لڑکیوں کو سوچ دیتی ہے یا پھر ان کے جسم کا کوئی سا بھی حصہ کاٹ کر ڈرگز رکھ کر انہیں کہیں سپلائی کر دیتی ہے، شکل سے خوبصورت حسین ترین اور معصوم رکھنے والا چہرے کا دوسرا رخ نہایت ہی گھناؤنا اور کراہیت زدہ ہے لڑکیوں کی خرید و فروخت ڈرگز اسمگلنگ جیسے کام میں ملوث ہے از ایلا... اس کے پیچھے اتنے بڑے بڑے ہاتھ ہیں کہ کوئی اس پر ہاتھ ہی نہیں ڈال سکتا کیونکہ کوئی ثبوت یہ چھوڑتی ہی نہیں ہے۔“ سید اذکار علوی نے بغور سنتے ہوئے اگلا صفحہ پلٹا تھا۔

”اور سر یہ ہے اینٹق واحدی اسمگلنگ اور لڑکیوں کی سپلائی کا سب سے بڑا بیوپار اور از ایلا کا بوائے فرینڈ جو بھی کام ہوتا ہے یہ دونوں برابر کے حصے دار ہیں معصوم لڑکیوں کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کرنا اینٹق واحدی کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے وہ کسی کو بھنگ بھی نہیں پڑنے دیتا کب اور کیسے اپنا کام دیکھا دیتا ہے ہر ہفتے اس کے دو تین ٹور پاکستان سے باہر لگتے رہتے ہیں مگر آج کل یہ لاہور گیا ہوا ہے اب یہ وہاں کیوں گیا ہے اس کا پتہ نہیں چلا۔“

”اور از ایلا کہاں ہے؟“

”وہ تو ہمیں ہے کراچی میں۔“

”وہ کیوں نہیں گئی؟“

”بسرا! بھی تک اس کا بھی پتہ نہیں چلا ہے۔“

”اوکے۔“ اس نے ایک اور صفحہ پلٹا جہاں خالی تصویر منہ چڑا رہی تھی۔

”یہ کون ہے؟“

”بسرا! یہ تصویر سہد وڑائچ کی ہے جسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا صرف نام ہی نام سنا ہے اس کی پہنچ بھی بہت اوپر تک ہے یہ باہر بیٹھ کر کام کرواتا ہے اس کا پتہ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا یہ کہاں اپنی رنگین راتیں گزارتا ہے اور کہاں سہانے دن۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”بسرا! میرا مطلب تھا کہ از ایلا اور انیق واحدی جوڑکیاں ایکسپورٹ کرتے ہیں سب سے پہلے یہ سہد وڑائچ انہیں چیک کرتا ہے سمران نو عمر لڑکیوں کے ساتھ یہ وہ کام کرتا ہے کہ بھاریاں یا تو خود کشتی کر لیتی ہیں یا پھر جو مرنے سے ڈرتی ہیں وہ ہر روز مرنی ہیں یہ ان خوبصورت لڑکیوں کی بولیاں لگواتا ہے اور جو نہیں مانتی انہیں منہ مانگے بغیر بولی کے بھی بیچ دیتا ہے سر میری تو اللہ سے دعا ہے یہ سہد وڑائچ میرے ہاتھ لگ جائے میں اس کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا اس نے حوا کی بیٹیوں کو مذاق بنایا ہوا ہے میں اسے زندہ جلا دوں گا ایسی موت دوں گا کہ ہر روز موت مانگے گا وہ بھی نہیں ملے گی۔“ اس نے سید اذکار علوی کو اس کی جذبات کی قدر تھی۔

”تمہیں موقع ملے گا اذکار کچھ دن اور صبر کرو ورنہ چاہے کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ ہو مگر سچائی اور اللہ کے قہر کے آگے گھٹنے ٹیک ہی دیتی ہے۔“ اس نے نیکسٹ صفحہ آگے کیا تھا۔

”یہ خاتون کون ہیں؟“

”یہ نیتابانی ہے جس کا کوئی ٹیکٹ صرف از ایلا سے ہے جوڑکیاں کسی کام کی نہیں ہوتیں ان لوگوں کے لئے وہ انہیں نیتابانی کو بیچ دیتی ہے۔“

”اچھا۔“ سید اذکار علوی نے بغور اس عورت کو دیکھا تھا۔

”ایک خبر اور ہے سر آج کل کوئی عابد جوفا ہے جسے از ایلا نے لڑکیاں سپلائی کرنی ہیں۔“

”یہ عابد جوفا کہاں ہے اور کون ہے؟“

”اس کا ٹھکانہ بھی سہد وڑائچ کی طرح ہی ہے کبھی کسی ملک تو کبھی کسی شہر مگر سننے میں آیا ہے یہ آج کل تھائی لینڈ گیا ہوا ہے مگر خبیث کہتا ہے کہ پاکستان میں جو حسن چنے چنے پر پھیلا ہوا ہے وہ اسے کہیں اور کسی اور ملک میں دیکھنے کو نہیں ملا ہے اور اب اسے پاکستان سے لڑکیاں چاہئیں جن کی وہ منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہے۔“

”انہیں لڑکیاں لا کر کون دیتا ہے؟“

”سلمان۔“

”یہ سلمان کون ہے؟“ سید اذکار علوی کے گرے کانچ میں سرخ ڈورے ابھرنے لگے تھے۔

”از ایلا کا خاص ملازم..... سر یہ بہت بڑا ایک گروپ ہے جو بہت بڑے پیمانے پر آرگنائزیشن کا کام کر رہا ہے ان پر اگر ہاتھ ڈالا یا انہیں بیزا تو ان کے جیل میں جانے سے پہلے جیل برصغیر کے سپر ز پہلے ہی رکھے ہوتے ہیں۔“

”پھر تمہارا کیا خیال ہے کیا کرنا چاہئے ان کے ساتھ“۔ سید اذکار علوی نے قابل بند کر کے انپکٹر ڈاکر حیات کو دیکھا۔

”ان کا دفتر..... سارا قصہ ہی ختم“۔

”مگر نی الحال بڑی مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے ضروری ہے کہ چھوٹی مچھلیوں کو پکڑا جائے۔ ویسے ایک بات بتاؤ اتنی اندر تک کی انفارمیشن تم نے اکٹھی کیسے کیس؟“ وہ کچھ حیران بھی ہوا۔

”سر پلیز مائنڈ مت کیجئے گا یہ ایک راز ہے مگر میں آپ کو بتاؤں گا ضرور مگر ابھی نہیں ان لوگوں کو پکڑنے کے بعد“۔

”چلیں جیسے آپ کی مرضی“۔

”سر! اتنی دیر ہوگئی آپ کو آئے کچھ گرم منگوادوں“۔ ڈاکر حیات کو پر سلی سید اذکار علوی بہت پسند آیا تھا اس کا خیال تھا کہ آج کل جو ہمارے پاکستان یا کراچی میں ہو رہا ہے اس میں بہت جلد سدھا آئے گا سید اذکار علوی کوئی معمولی انسان نہیں تھا فوج میں میجر تھا اور بہت بڑے عہدے پر فائز تھا اس کے علاوہ اس کے دادا سید آغا شہباز علوی بھی ایک وقت میں بہت بڑے آفیسر رہ چکے تھے جن کے نام سے ہی دشمن کا پتہ تھے وہ جہاں جاتے کرائم صاف کر دیتے تھے کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی ان کے آگے سراٹھانے کی ان کی سزا بھی ایسی تھی کہ مجرم کا رواں رواں کانپ اٹھتا وہ تھر تھراتے ہوئے ایک ایک راز اگل دیتا پھر تو سید اذکار علوی ان کا پوتا تھا اپنی قوم اپنے وطن پر جان نثار کرنے والا ایک جانبازا سپاہی۔

☆☆☆☆

رات کے دس بجے سید اذکار علوی گھر میں داخل ہوا تھا گھر کیا وہ تو کوئی عالیشان محل تھا کسی کے خوابوں کی تعبیر ہر چیز فرشتہ اعلیٰ و عمدہ ایک سے ایک گاڑی کے نیو ماڈل کھڑے تھے پورج میں سید آغا شہباز علوی کو چونکہ باغبانی کا حد سے زیادہ کریز تھا بلکہ یوں کہنا غلط نہیں کہ انہیں پودوں سے عشق تھا ہر رنگ کے پھولوں سے انہوں نے اپنا باغ سجایا ہوا تھا یہ ان کی زندگی میں روز کا معمول تھا کہ وہ صبح و شام اپنے وسیع و عریض لان کو ایک سے دو گھنٹے لازمی پانی دیتے تھے وہ اپنے وقت کے ایک جان ناز سپاہی ایک بہادر فوجی تھے جس میدان میں بھی کود جائیں دشمن کا خاتمہ کئے بنا رہ نہیں سکتے تھے کیپٹن سید آغا شہباز علوی اپنے سرکل میں بہت فینس تھے لمبے چوڑے مضبوط جسم والے پروقاری شخصیت کے آگے سارے آفیسرز دُوب سے جاتے تھے ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا ان سے محبت کرتا تھا جدی پشتی رئیس ہونے کے باوجود غرور و تکبر نام کو نہیں تھا ان کی اتنی زمینیں تھیں دولت کی ریل پیل تھی کہ اگر سات پشتیں بھی بیٹھ کر کھائیں تو ان کے دولت کے خزانے میں کمی نہ ہو اللہ نے انہیں جتنی عزت دولت اور شہرت نوازی تھی اللہ نے ان سب آسائشوں کے ساتھ انہیں ایک دکھ ایک روگ ایک غم بھی دیا ہوا تھا وہ اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھ کر اس امتحان میں پورا اترنے کی کوشش کرتے تھے۔ سید آغا شہباز علوی کے دو بیٹے تھے سید رحمن علوی اور سید فرحان علوی سید رحمن علوی کی شادی تو انہوں نے اپنی پسند سے کر دی تھی مگر وہ اذکار کی پیدائش کے وقت ہی اللہ کو پیارے ہو گئے سید رحمان علوی چونکہ سید آغا شہباز کی طرح ہی فوج میں تھے ایک جنگ میں انہیں شہید کر دیا گیا دکھ کے ساتھ انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ ان کے بیٹے نے وطن کی خاطر اپنی جان دی اذکار کو پانچ سال کی عمر میں ہی لندن کے بورڈنگ میں ڈال دیا گیا تھا سید آغا شہباز علوی کے دوسرے بیٹے سید فرحان علوی اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی کے بالکل برعکس نکلے وہ ایک بگڑے رئیس تھے پیسوں کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ان کا شوق تھا وہ سید آغا شہباز علوی اور سید رحمان علوی کی عادتوں سے الگ تھے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریبنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Liked Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

لک وائز بھی الگ تھے نہایت ہی خوبصورت نیلی نیلی جیل جیسی بڑی آنکھیں گولڈن سے بال بالکٹ انگریز لگتے تھے یہی وجہ تھی کہ کتنی لڑکیاں ان پر مرتی تھیں انہیں پسند کرتی تھیں کلب پارٹیز، گرل فرینڈز شاپنگ بس یہی سب ان کا شوق تھا بھی سبھی تو سید آغا شہباز علوی نالاں بھی ہو جاتے تھے مگر سید فرحان علوی کو منانے کا فن آتا تھا، مگر ایک روز انہوں نے تو جیسے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا کام کیا تھا، کسی طوائف سے شادی کر لی تھی اور اسے گھر بھی لے آئے تھے کافی دن لگے تھے سید فرحان علوی کو سید آغا شہباز علوی کو منانے میں رطابہ سید فرحان علوی کی بیوی بہت اچھی ثابت ہوئی تھیں ان کے خاندان کے لئے۔ اگر سید فرحان علوی حسن ووجاہت کے مالک تھے تو رطابہ بھی حسن و خوبصورتی میں کم نہیں تھیں یہی وجہ تھی کہ ان کی اپنی سگی ماں سنیتا بانی رطابہ کے ہو شربا حسن کو کیش کرانا چاہتی تھیں ان کی خوبصورتی سے کروڑوں اربوں کمانا چاہتی تھیں مگر رطابہ تھی کہ اسے ان سب کاموں سے نفرت تھی سنیتا بانی کے پیار ڈانٹ مار سے وہ ان کی بات نہیں مانتی تھی، کتنی ہی بار وہ گھر کے اس شور شرابے والے ماحول سے بھاگنا چاہتی تھی مگر ہر بار ناکامی اس کا منہ چڑانی تھی سنیتا بانی کے خاص آدمی اس پر نظر رکھتے تھے یہ تو اس پر قسمت مہربان ہوئی کہ ایک دن کوٹھے پر سید فرحان علوی چلا آیا تھا اس کی نظر رطابہ پر پڑی تو یہ ایک دو ملاقاتیں محبت پھر عشق اور پھر آخر میں کورٹ میرج کا رنگ لے آئیں سنیتا بانی تو جلے پیر کی بی کی طرح اپنے کمرے میں پھرتی رہتی بس یہی سوچتی کہ کس طرح سید فرحان علوی سے بدلہ لیا جائے حالانکہ سید فرحان علوی نے ایک بھاری خطیر رقم سنیتا بانی کو دی تھی مگر وہ بھی کہ شاید سید فرحان علوی نے ایک رات گزارنے کی رقم دی ہے۔ فون کی گھنٹی کالی، ریس سے بچ رہی تھی سید آغا شہباز علوی انہی ابھی آفس سے آ کر بیٹھے تھے سید فرحان علوی اور رطابہ کو انہوں نے ہنی مون ٹور پر سونز رینڈمیج دیا تھا انہوں نے فون اٹھایا۔

”ہیلو“

”آغا صاحب! آپ کا بیٹا ہماری محفل سے سب سے قیمتی ہیرا چرا کر لے گیا ہے جس کی قیمت انمول ہے۔“

”کیا کو اس سے کون ہو تم؟“ سید آغا شہباز علوی فون کے اس پار سنیتا بانی کو پوچھنے نہیں تھے اور یہ ان دونوں کی پہلی ٹیلی فونک گفتگو تھی سنیتا بانی کے بولنے کے انداز سے وہ سمجھ گئے کہ یہ ہی رطابہ کی والدہ ہیں اور پھر یہ ہر روز کی بات تھی ہر روز سنیتا بانی کی فون پر دھمکیاں وہ سنتے اور ہوا میں اڑا دیتے تھے وہ بہت ہلکا لے رہے تھے اس کیس کو وہ سمجھ رہے تھے کہ سنیتا بانی ایک لاپٹی عورت ہے کچھ لاکھ روپے دیں گے اور اس کا منہ بند ہو جائے گا مگر یہ سب صرف ان کی سوچ تھی ان کے تو وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ سنیتا بانی اپنے انتقام کے لئے اتنی اندھی ہو جائے گی کہ سید آغا شہباز علوی کو اتنا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑے گا وہ ایک آری آفیسر تھے جو چھ ماہ پہلے ہی ریٹائر ہوئے تھے اس وقت بھی وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھے ہی دی پر کوئی نیوز سن رہے تھے اور جو چھ ماہ اس نیوز میں بتایا گیا ان کے اوسان خطا ہو گئے سید آغا شہباز علوی کے بڑے بیٹے اور بڑی بہو کی ایک کار ایکسیڈنٹ میں موت ہو گئی۔ فون کی گھنٹی بجی انہوں نے اپنا سیل فون اٹھایا۔

”میں نے کہا تھا نا آغا صاحب! مجھے اگر رطابہ نہیں ملی میں کچھ بھی کر جاؤں گی۔“ سنیتا بانی کی مکروہ آواز جیسے آغا شہباز علوی کے کانوں میں پگھلا سیسہ ڈال رہی ہو۔

ابھی بڑے بیٹے بہو کا نم ہکا بھی نہیں ہوا ان کے قبروں کی مٹی سوکھی بھی نہیں تھی کہ ایک اور دل دہلانے والی خبر نے ان کو پورا ہلا کر رکھ دیا تھا ان کے پیرزمن سے اکھاڑ دینے تھے رطابہ اور سید فرحان علوی اپنی دو سالہ بیٹی بریزے کے ساتھ سید آغا شہباز علوی کو تھانے پاکستان آگئے تھے وہ انہیں سر پر راز دینا چاہتے تھے مگر ان کا

سر پر اتر خود انہیں ہی نہیں سید آغا شہباز علوی کو بھی کتنا بھاری پڑے گا یہ وہ نہیں جانتے تھے اگر سید آغا شہباز علوی کو معلوم ہوتا تو وہ انہیں یہاں آنے سے روک دیتے یا پھر ان کی حفاظت کے لئے کچھ کرتے مگر کیا کر سکتے ہیں تقدیر کے آگے ہر شخص بے بس ولا جار ہو جاتا ہے۔ رطابہ اور سید فرحان علوی کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا رطابہ سے شادی کا بھاری خمیازہ بھگتنا پڑے گا یہ ان کے علم میں نہیں تھا۔

”میری پوتی کہاں ہے؟“ سید آغا شہباز علوی کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی تھی اپنی ہی نظروں کے سامنے انہوں نے ان بچوں کی لاشیں دیکھی تھیں انہیں کھو دیا تھا بریزے کو وہ ہر روز لپٹ لپٹ کر دیکھتے تھے انہیں لگتا بریزے کے اندر ان کی جان ہے اتنا پیار انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں اور پوتے سے نہیں کیا جتنا انہیں اپنی پوتی سے محسوس ہوتا تھا وہ سید فرحان علوی کی بیٹی تھی جس کی انہوں نے ہر جائز و ناجائز فرمائش پوری کی تھی۔ سنیابائی کے فون نے سید آغا شہباز علوی کے رہے رہے اوسان بھی خطا کر دیئے تھے۔

”آغا صاحب بہت خوبصورت ہے آپ کی پوتی آخر کو رطابہ کی بیٹی ہے ظاہر ہے ماں اتنی حسین باپ اتنا خوبصورت تو دونوں کا رنگ و روپ تو چرائے گی نا ابھی اتنی خوبصورت ہے تو بڑی ہوگی تو چار چاند لگیں گے اس کی جوانی و خوبصورتی کو جو دام میں رطابہ سے وصول نہیں کر سکی وہ دام میں بریزے سے وصول کروں گی۔“

”سنیابائی۔“ سید آغا شہباز علوی بری طرح دباڑے تھے سنیابائی کے ان بازاری لفظوں نے گویا ان کے شراروں میں لاوا بھر دیا۔

”چیخو مت آغا صاحب! سنیابائی ان سے زیادہ بری طرح چیخی تھی۔“

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ رطابہ کو مجھے واپس کر دو مگر تم نے میری ایک نہیں ہی ایک طوائف کو چیلنج کیا تھا تم نے آغا صاحب جیکے سے ان دونوں کو باہر بھیج دیا اور سمجھے کہ ہمیں کچھ خبر بھی نہیں ہوگی ارے ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن سکتے ہیں ریس میں دوڑنے والی گھوڑی کس نسل کی ہے وہ بتا سکتے ہیں پھر تو یہ میری اپنی سگی اولاد ہے۔“ سنیابائی نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

”خیر میں رطابہ کو یہاں لے بھی آتی اسی بازار میں جہاں سے تمہارا بیٹا اسے لے کر گیا تھا مگر کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن اس کی قیمت تمہاری سیر زادی سے وصول کروں گی طوائف کے اس بازار میں ہر روز اس کی نیلائی ہوگی بریزے میں سید خاندان کا لہو دوڑتا ہے نا اب تم دیکھنا میں اس کو شہرت و بدنامی کی آخری منزل تک لے کر جاؤں گی کہ امراؤ جان ادا نے بھی کیا نام کمایا ہوگا۔“ اس کا ایک ایک لفظ جیسے سید آغا شہباز علوی کا سکونٹا کر رہا تھا وہ ان کا پہلا ہارٹ ایچک تھا جو انہیں اسپتال پہنچا گیا تھا مگر انہیں جینا تھا اپنی بریزے کے لئے جینا تھا زندگی کا آخری مقصد تھا بریزے کو اس گندگی سے واپس نکالنا جو جانے اب کہاں ہوگی۔ آج بریزے کو ان سے بچھڑے اٹھارہ سال ہو گئے مگر کچھ پتہ نہیں کہاں ہے وہ کون سا ایسا کونا جگہ نہیں تھی جہاں بریزے کو دھوٹا نہ ہو سید آغا شہباز علوی نے اپنا سارا اثر و رسوخ ساری طاقت لگا دی مگر بریزے کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ سنیابائی نے اسے کہاں چھپا کے رکھا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

سید اذکار علوی آفس سے آ گیا تھا فریش ہو کر وہ ڈائمنگ نیبل پر آیا ملازم نے کھانا دیا تھا۔

”فادو نے کھانا کھایا؟“

”نہیں صاحب جی! آج انہوں نے صبح ناشتہ کیا تھا وہ بھی ٹھوڑا سا اس کے بعد کسی کا فون آیا وہ جب سے

ہی کمرے میں بند ہیں نہ دو پہر کا کھانا کھایا نہ ہی دوائی لی آج کی۔ عبدال نے پورے دن کی رواد نشاؤں تھی سید اذکار علوی نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں تم یوں کرو تھوڑی دیر بعد کافی بنا لینا میں دادو کو لے کر آتا ہوں۔“ سید اذکار علوی سید آغا شہباز علوی کے بیڈروم کی طرف بڑھا تھا اس نے دو تین دستک دی مگر اندر سے جواب ندر دڑوہ سمجھ گیا آج کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے وہ ہولے سے دروازہ کھولتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

”دادو!“ سید آغا شہباز علوی سامنے رانگ چیر پر بہت ہی اداس غم زدہ سے بہت ہی گہری سوچ میں بیٹھے تھے انہوں نے سید اذکار علوی کے اندر داخل ہونے اور اس کے پکارنے پر کوئی نوٹس نہیں لیا تھا وہ خود ہی آگے بڑھا اور ان کے قدموں میں آ بیٹھا تھا۔

”دادو۔“ اس نے سید آغا شہباز علوی کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ سید آغا شہباز علوی چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

”جی..... مگر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں آج صبح سے نہ کچھ کھایا نہ ہی دوائی لی جانتے ہیں کہ ڈاکٹر نے کتنی سختی سے کہا ہے کہ ایک ٹائم کی بھی دوا مس نہیں ہونی چاہئے۔ وہ بہت فکر مند ہو گیا تھا۔“

”فکر مت کرو بہت ڈھیٹ ہوں ایسے نہیں مروں گا جب تک میری بریزے میرے پاس نہیں آجاتی مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“

”اللہ نہ کرے دادو آپ کو کچھ ہو۔ نہایت تڑپ کے اس نے سید آغا شہباز علوی کو دیکھا تھا۔“

”اذکار۔“ سید آغا شہباز علوی نے بہت آس بہت امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پکارا تھا جو اسے بہت شدت سے محسوس ہوا تھا۔

”جی دادو!“

”میری آخری خواہش سمجھ کر میری یہ خواہش پوری کرو بیٹا۔“

”دادو! آپ پلیز اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہیں مت کریں مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“

”اور اس سے زیادہ تکلیف مجھے لمحہ۔ لمحہ۔ بل۔ بل۔ ہونی ہے جب اپنی بچی بریزے کا سوچتا ہوں تو۔“ چند موتی ان کی بوڑھی آنکھوں سے ٹوٹ کر سید اذکار علوی کی ہاتھ کی پشت پر گرے تھے۔

”اذکار! میری بریزے کو میرے پاس لے آؤ۔“

”میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے نام میں آپ کی بریزے کو آپ کے پاس ضرور لے کر آؤں گا۔“

”مگر کب..... جب سینٹا بانی اسے ایک مشہور کالج گرل بنا دے گی جب میرے پاس لاؤ گے اسے۔“ یکدم سے وہ بھڑکے تھے۔

”دادو۔“ سید اذکار علوی نے دکھ بھری نظروں سے سید آغا شہباز علوی کو دیکھا تھا۔

”آج صبح سینٹا بانی کا فون آیا تھا آج اس نے پیسوں کا تقاضا نہیں کیا بلکہ اس نے آج میرے پیروں تلے سے زمین نکال دی میرے سر سے آسمان سرکا دیا تھا۔“

”کیا بکواس کی ہے اس خبیث عورت نے۔“ سید اذکار علوی کبھی بھی سینٹا بانی کا نام اپنی زبان پر نہیں لاتا تھا بلکہ اس کا نام لینا بھی اپنی توہین سمجھتا تھا اس کے ذکر سے اس کی آنکھوں میں چنگاریاں ہی بھرنے لگتی تھیں

خون میں شرارے دوڑے لگتے تھے۔

”اس نے کہا ہے وہ بریزے کو سب سے بڑی کال گرل بنائے گی اسے اس جگہ پہنچا دے گی جہاں سے واپسی کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے جہاں اسے کسی کی آواز سنائی نہیں دے گی، اذکار بریزے میرے فرمان کی بیٹی ہی نہیں ایک سید زادی بھی ہے اس کی رگوں میں سیدوں کا خون دوڑتا ہے وہ عورت اسے مٹی میں روند دے گی اور بھی، تو عجیب عجیب وسوسے دل میں ڈرو خوف کنڈلی مارتے ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں جو وہ کہہ رہی ہے ایسا کر بھی چکی ہے اللہ نہ کرے۔“ سید آغا شہباز علوی کے جسم میں سرسراہٹ سے ہونے لگی ایک جھرجھری سے لی تھی۔

”اللہ نہ کرے دادو۔“ یہی بات دل سے سید اذکار علوی کے دل سے نکلی تھی، مگر کبھی کبھی اس کا دل بھی ڈرجاتا تھا کہ کہیں ایسا ہونہ جائے۔

”تم کچھ کرتے کیوں نہیں ہواذکار؟“

”دادو ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ایک ہونہار پولیس انسپکٹر ڈاکر حیات اس کیس کی انکوائری کر رہے ہیں ان شاء اللہ بہت جلد بریزے کا بھی پتہ چل جائے گا۔“

”مگر کب آئے گا وہ دن اذکار!“ وہ مڈھال مڈھال سے ہولے تھے۔

”بہت جلد دادو! ابرائی چاہے کتنی ہی بڑی ہو مگر اچھائی کے آگے بالآخر ایک نہ ایک دن دم توڑ ہی دیتی ہے اور اس خبیث عورت کا تو میں ہی نہیں اللہ رب العزت بھی وہ حال کرے گا کہ لوگوں کے لئے عبرت کا نشان بن کے رہ جائے گی بس ایک بار بریزے مل جائے جو میں ابھی تو نہیں جانتا کہ اسے کہاں چھپا کے رکھا ہوا ہے مگر جس دن وہ میرے ہاتھ لگ جائے گی اس دن اس خبیث عورت کا آخری دن ہوگا، بہت سے حساب میرے اس کی طرف نکلتے ہیں دادو اپنے ماں باپ کا اور فرمان چاچو کا حساب، بس آپ میرے لئے دعا کیا کیجئے۔“ اس نے نرم ملامت نظروں سے سید آغا شہباز کو دیکھا تھا۔

”میری دعا میں ساری میری بچی بریزے اور اپنے بیٹے اذکار کے لیے ہی تو ہیں۔“

”آپ بریزے سے بہت پیار کرتے ہیں نا دادو؟“

”ہاں بہت زیادہ، کیونکہ میری بچی میرے پیار میری توجہ سے محروم رہی ہے۔“ سید اذکار علوی سید آغا شہباز علوی کا موڈ بحال کرنے میں کامیاب رہا تھا اور پھر کچھ اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے دونوں نے مل کے کھانا کھایا سید آغا شہباز علوی کو میڈیسن کھلا کے اس نے انہیں سکون کی گولی دے کر سلا دیا تھا اور خود اپنی اسٹڈی روم میں آ گیا تھا یہ اس کا روز کا معمول تھا کہ سونے سے پہلے کچھ گھنٹے وہ مطالعہ ضرور کیا کرتا تھا۔

☆☆☆☆

”ہائے باؤ جی کیسے ہو؟“ ابراش عسکری جو اپنی گاڑی سے باہر نکل رہا تھا اک دم سے چونک کر رہ گیا تھا بیچھے پلٹ کر دیکھا۔

”تم۔“ چہرے پر معمولی سی ناگواری تھی۔

”آہائے باؤ جی تمہیں ابھی تک میرا نام نہیں معلوم ہوا سحر بانو نام ہے میرا۔“ سحر بانو نے اپنے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی تھی۔

”تم سحر بانو ہو یا ایکس داٹے زبیدہ... آئی ڈونٹ نو، مگر جب تم میرا نام سننے پر توجہ نہ کرے لگتے ہو دل

چاہتا ہے تمہارا گلا ہی دبا دوں۔“ ابراہن عسکری نے دانت کھینچ کے اسے گھورا تھا مگر سحر بانو بھی اپنے ہی نام کا تھا پوری بیٹی نکال کر قبضہ لگایا تھا۔

”سچ باوجی! مجھے تمہارا اس طرح مجھ پر غصہ ہونا بالکل برا نہیں لگتا، بلکہ مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے جب تم مجھ سے یوں لڑتے جھگڑتے ہو۔“ سحر بانو اپنے دونوں ہاتھوں کو ہی نہیں اپنے پورے وجود کو لہرا لہرا کے ابراہن عسکری سے بات یوں کر رہی تھا جیسے دونوں میں بہت اندراستینڈنگ ہے۔

”کیا بکواس ہے یہ۔“ ابراہن عسکری سچ معنوں میں تپ کر رہ گیا تھا۔ گاڑی کے اندر زنیہ کب سے ان دونوں کی نوک جھونک دیکھ رہی تھی اس نے بغور اس کھڑے خواجہ سرا کو بھی دیکھا جو اپنا نام سحر بانو بتا رہا تھا اس نے ڈارک اورنج رنگی سوٹ پہنا ہوا تھا جس پر چوڑے گونے کا کام کیا گیا تھا سر پر دوپٹے کو اوڑھا ہوا تھا اس طرح کے ماتھا پورا چھپا کے دوپٹے کو کانوں کو پیچھے اڑسا ہوا تھا ڈارک میک اپ ڈارک اورنج لپ اسٹک میں پورا تیار کھڑا وہ ابراہن عسکری سے لہک لہک کر بات کر رہا تھا زنیہ کو جہاں اسے دیکھ کر کراہیت ہی محسوس ہوئی وہیں اپنے بھائی ابراہن عسکری کے چہرے کی بے زاریت دیکھ کر ترس کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آئی تھی۔ سحر بانو کی اچانک نظر گاڑی کے اندر بیٹھی زنیہ پر پڑی تھی۔

”ویسے باوجی تو بڑے عیش کرتا ہے کل گاڑی میں کوئی اور لڑکی تھی اور آج۔“

”جسٹ شٹ اپ یہ میری بہن ہے۔“ اس سے پہلے کہ سحر بانو مزید آگے کچھ بولتا ابراہن عسکری نے اس کی بات ہی کاٹ دی تھی۔

”ارے نہیں بھی تیری بہن ہماری بہن۔“

”جی نہیں میری بہن صرف میری بہن ہے تمہاری نہیں، مگر تم نے خود کو آئینے میں دیکھا ہے۔“ ابراہن عسکری کو سحر بانو کے وجود سے اس کے چہرے سے شدید کھن محسوس ہوئی تھی اس کے چہرے پر اس قدر غرور تھا مگر سحر بانو نے اس کا کوئی ٹوٹس نہیں لیا تھا۔

”اگر تمہارے مذاکرات ختم ہو گئے ہیں تو میں گاڑی سے نکل آؤں باہر۔“ اندر بیٹھی زنیہ نے طنزیہ نظروں سے ابراہن عسکری کو دیکھا ابراہن عسکری نے زنیہ کو چونک کر دیکھا پھر سحر بانو کو گھورتا ہوا فرنٹ ڈور کھولا زنیہ باہر نکل آئی تھی۔

”سلام باجی جی!“ سحر بانو نے ہاتھ کو ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے تھوڑا جھک کر زنیہ کو سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام!“ زنیہ نے بغیر اس کی طرف دیکھے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکال کر سحر بانو کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”یہ لو یہ رکھ لو۔“

”شکریہ باجی اللہ تجھے خوش رکھے تیری مراد پوری کرے۔“ سحر بانو نے وہ نوٹ لے کر فوراً سے اپنے چھوٹے سے سرخ پرس میں رکھ لیا تھا۔

”اچھا باوجی اب میں چلتا ہوں زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“ اس نے ایک مسکراہٹ ابراہن عسکری کی طرف اچھالی۔

”اللہ نہ کرے جو میری تم سے اب ملاقات ہو۔“ اس نے سلگتا ہوا جواب دیا تھا۔

”تم ہر بار یہی کہتے ہو مگر تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی۔“ سحر بانو اسے ایک آنکھ دبا کر دیکھتا ہوا وہاں سے

پلٹ گیا اور اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔ ابراش عسکری سحر بانو کی اس حرکت پر تپ کر رہ گیا چہرہ غصے کے مارے خون چھلکانے لگا تھا۔

”اتنی باتیں اس سے کر لیں مگر اتنا نہ ہوا کہ جیب سے کچھ روپے ہی نکال کر اس کو دے کر اسے چلتا کرتے مگر نہیں تم تو اس سے مزہ لے رہے تھے شاید۔“ زنیہ نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پر مزاح انداز میں اسے چھیڑا تھا ابراش عسکری نے رخ موڑ کر نہایت گھور کر زنیہ کو دیکھا تھا۔

”تمہیں میری شکل سے لگتا ہے کہ میں سحر بانو سے مزہ لے رہا تھا۔“ ابراش عسکری کے سحر بانو کہنے پر زنیہ کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

”اب تم کیوں ہنسی ہو۔“

”کچھ نہیں اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی کہ تمہیں اس کا نام تک یاد ہو گیا ہے۔“ زنیہ کی ہنسی نہیں رک رہی تھی ابراش عسکری کچھ خفیف سا ہو کر رہ گیا تھا۔

”اچھا زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے اب اندر چلو ہم ویسے ہی لیٹ ہو گئے ہیں موم ڈیڈ کب کے بجائے گئے ہیں اور تمہیں سنی کا خیال نہیں آ رہا جو یہاں کھڑی فضول گوئی کر رہی ہو۔“

”ہاں بزنس کی ساری باتیں تو تم اس سحر بانو سے کر رہے تھے نا۔“ زنیہ پھر جملہ اچھالتی ہوئی آگے بڑھی۔

”ارے ہاں دیکھو ذرا گاڑی میں داخل رہ گیا ہے وہ لیتے ہوئے آنا۔“ زنیہ آہتی ہوئی آگے بڑھی اور دروازے کی تیل بجائی ابراش عسکری اس کے حکم پر تپتا ہوا گاڑی کی سمت بڑھا۔

”وہ حکم تو ایسے دیتی ہو جیسے پانچ سال بڑی ہو۔“

”پانچ سال بڑی نہیں تو کیا ہوا پانچ منٹ بڑی ہوں مگر ہوں تو تم سے بڑی۔“ زنیہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی کیونکہ چوکیدار نے دروازہ کھول دیا تھا۔

”خیریت تو ہے اتنی دیر لگا دی تم دونوں نے۔“ رشنا قیصر اپنی گرجے ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

”کچھ نہیں مام آپ کو تو پتہ ہے اس کراچی شہر میں ابراش کی اس قدر گرل فرینڈز ہیں کہ ہر موٹر پر ہیلو ہائے کرتی ہوئی ملیں گی۔“ زنیہ رشنا قیصر کا ہاتھ تھامتھی ہوئی آگے بڑھی اور سامنے سے آئی ہوئی امبرین کے گلے سے لگی۔

”ہیلو آئی! کیسی ہیں آپ؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں مگر آپ لوگوں نے آنے میں اتنی دیر لگا دی۔“ امبرین نے اس کے رخسار پر پیار کرتے ہوئے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور اس سے پہلے زنیہ کی زبان پھر سے اشارت ہو جاتی ابراش عسکری نے پھولوں کا بو کے ان کی طرف بڑھا دیا۔

”پہلی برتھ ڈے امبرین آئی۔“

”ادہ تھینک یو مائی چائلڈ۔“ امبرین نے وہ پھولوں کا بکے لے کر پہلے اس کی دلفریب خوشبو کو اپنے اندر جذب کیا پھر پاس رکھے گا کورز پر رکھے والٹز میں اس کو سجا دیا۔

”مام! ڈیڈ اور انکل نظر نہیں آ رہے سنی بھی نہیں دکھ رہا۔“ زنیہ نے ادھر ادھر متلاشی نظریں گھمائیں۔

”سنی قیصر اور عرفان بھائی کو لے کر باہر گیا ہے۔“ رشنا نے جواب دیا۔

”میکنڈ وٹلڈ۔“ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”یقیناً کچھ نئی فرمائش ہوگی۔“

”ارے بیٹا! ان بچوں کی فرمائش پر وگرا مز کبھی ختم نہیں ہوں گے۔“ امبرین نے اشنا کو دیکھا اتنے میں سنی بھاگتا ہوا زئیرہ کے پاس چلا آیا اس کے ہاتھ میں چار پانچ شاپر کے بیگ تھے۔

”مئی یہ دیکھیے عفتان تانوں نے مجھے کتنے سارے ٹو اس خرید کے دیئے ہیں۔“ وہ ایک ایک شاپر سے سارے ٹوائز نکال نکال کر زئیرہ کو دکھا رہا تھا۔

”سنی بری بات ہے آپ کے پاس پہلے ہی کیا کم ہیں ٹوائز جو عفتان انکل کو پریشان کیا۔“

”زئیرہ بیٹی! بچوں کے پاس جتنے بھی ٹوائز ہوں انہیں کم ہی لگتے ہیں۔“ عفتان ترمذی آرام وہ صوفے پر براجمان ہوئے تھے۔

”ویری گڈ سنی بابا! ہر تھوڑے امبرین آنٹی کی اور گفٹ خود وصول کر رہے ہو۔“ امراش عسکری کے چہرے پر سنی کو دیکھتے ہی خوشی آ جاتی تھی اس نے سنی کو اپنے پاس لیا اور خوشی خوشی اس کے ٹوائز دیکھنے لگا۔

”امراش ماما! وہاں پر اتنے سارے ٹوائز تھے جی چاہ رہا تھا سب لے لوں۔“

”میری جان! شاپ پر بھی اتنے سارے ٹوائز نہیں ہوں گے جتنے آپ کے بیڈروم میں بھرے پڑے ہیں کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں شازل سے بولوں گا کہ جب تم اپنی نبوی کی جاب سے ریٹائر ہو جاؤ تو صدر میں کھلونوں کی دکان کھول لینا۔“ امراش عسکری نے زئیرہ کو مسکراتے ہوئے چھیڑا تھا۔

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ زئیرہ نے اپنے ہاتھ کا مکا بنا کے اس کے بازو پر مارا۔

”ارے ہاں زئیرہ بیٹا! شازل کیسے ہیں کب آ رہے ہیں؟“ امبرین نے پوچھا۔

”امبرین آنٹی! آج صبح فون آیا تھا شازل کا وہ کہہ رہے۔“

”کہ سنی کے سارے ٹوائز سنبھال کے رکھنا میں آ کر صدر میں اچھی سی دکان کھولوں گا۔“ امراش عسکری نے ہنستے ہوئے زئیرہ کی بات گانتے ہوئے کلزا جوڑا تھا۔

”مام! دیکھ رہی ہیں آپ اسے مار کھائے گا یہ میرے سے۔“ زئیرہ کی ایک عادت تھی شازل کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا نہیں سن سکتی تھی۔

”چھوڑو ناتم جانتی تو ہو ایسا ہی کھلنڈ رامزاج ہے اس کا۔“ رشنا قیصر نے زئیرہ کو سمجھایا۔

”اور کیا اس کی طرح شازل وہاں کوئی گریڈ فرینڈ زبنا نے تھوڑی گئے ہیں کام کر رہے ہیں ہمارے ملک کی حفاظت کے لیے گئے ہیں۔“

”بھئی ہمیں کیا پتہ ملک کی حفاظت کے لیے گئے ہیں یا.....“

”یا کسی سحر بانو سے دوستی کرنے گئے ہیں۔“ اوپر سے آتے سبکیگین حیدر ترمذی نے پر مزاح انداز میں کہتے ہوئے امراش عسکری کو مسکرا کے دیکھا امراش عسکری خاموش ہو گیا۔

”اب کیوں بولتی بند ہوگئی۔“ زئیرہ نے اس کے بازو پر چنگلی بھری۔

”سنی یہ تو بہت زبردست ہے یہ چلتا کیسے ہے۔“ امراش عسکری سنی کے کھلونوں میں لگ گیا۔

”کیا بچوں کے کھلونوں میں گئے ہوئے ہو بیٹا سنی آپ وہاں جا کر اپنے کھلونوں سے کھیلا۔“ سبکیگین حیدر

ترمذی نے سارے شاپرہ سنی کو بچڑائے اسے ڈرائنگ روم سے منسلک اس چھوٹے سے کھلے حصے کی طرف بیٹھا دیا جہاں صرف ایک کارپٹ بچھا ہوا تھا۔
 ”ہاں تو کیا کہہ رہے تھے۔“

”امبرین یہ تینوں بیٹھے گئے اب کھانا شاید لیٹ نائٹ ملے آپ یوں کریں کھانا لگا دیں۔“ عفان ترمذی نے امبرین کو چاہ سے دیکھا جو آج بہت اچھی اور پروقاری لگ رہی تھیں۔
 ”جی بہتر، مگر عفان یہ قیصر بھائی صاحب کہاں رہ گئے۔“

”انہیں دروازے پر ہی واک کرتے کچھ ان کے بزنس کے جاننے والے مل گئے وہ بس آتے ہی ہوں گے آپ جب تک کھانا لگا دیجئے اتنے وہ بھی آ جائیں گے اور میں نے زنگر بیف برگر وین خان کو دے دیئے تھے وہ بھی لگا دیں سنی کو بھی بلا لیں۔“
 ”جی.....“ امبرین کھڑی ہو گئیں۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں بھابی!“ رشنا قیصر مسکراتی ہوئی ان کے ساتھ ہو گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں نیپلن کھانا لگا دیا گیا تھا۔

”کل ہمارے جامعہ میں پارٹی فنکشن ہے تم بھی آرہے ہو۔“ امراش عسکری نے بریانی کا ایک چمچہ منہ میں بگڑتے ہوئے سبکیٹکین کو دیکھا۔

”یار! بہت مشکل سے میں کچھ کھہ نہیں سکتا۔“
 ”کوئی مشکل نہیں ہے کل صبح کیا رہ بچے میں تمہارا ویرٹ کروں گا۔“ امراش عسکری نے حتمی فیصلہ بنا دیا تھا۔
 ”اوکے۔“ سبکیٹکین حیدر ترمذی نے کباب کی ڈش اس کے آگے بڑھائی۔ زنجیرہ سنی کو زبردستی زنگر اور فریج فراز کھلا رہی تھی کیونکہ اس کا سارا دھیان اسے نئے آنے والے کھلونوں کی طرف تھا۔ چوہدری قیصر عسکری اور عفان ترمذی کی اپنی بزنس ٹاک کرکٹ کی باتیں تھیں جبکہ امبرین اور رشنا قیصر کی شاپنگ کی طرف توجہ تھی۔

☆☆☆☆

”آج پھر ٹھڈے.....“ دسترخوان پر سب بیٹھے تھے شہیر حسن نے سالن کا ڈھکن ہٹایا جہاں ٹھڈے کا سالن اس کا منہ چڑا رہا تھا اس نے ڈھکن کو زور سے بند کر دیا۔
 ”اماں ہر روز کوئی نئی سبزی کبھی لوکی، کبھی بیٹکن تو کبھی بھنڈی حد ہوگئی ہے اماں۔“ شہیر حسن کے چہرے پر غصے کی پرچھائی تھی۔

”بری بات ہوتی ہے دسترخوان پر بیٹھے کر رزق کی یوں بے ادبی کرنا اللہ کونا گوار لگ سکتا ہے۔“ بلقیس آراء کو شہیر حسن کی یہ حرکت سخت ناپسند آئی تھی۔

”اچھا اور اللہ کو یہ ناگوار نہیں گزرے گا کہ میں ہر ماہ دس ہزار روپتا ہوں اس پر مہینے میں صرف ایک بار گوشت کھانے کو ملتا ہے۔“ اجیارہ نہایت دکھ سے شہیر حسن کا رویہ دیکھ رہی تھی۔

”سیرا نہیں کم از کم دعا کا ہی خیال کر لیں ابھی شادی کو چھ ماہ بھی نہیں ہوئے اور وہ بے چاری ہر روز وال سبزی کھاتی ہے، کیا سوچتی ہوگی کہ ہمارے گھر میں وال سبزی کے علاوہ کچھ پکتا ہی نہیں۔“ شہیر حسن کی نظر پاس بیٹھی دعا پر پڑی جو یہاں لے میں سے ٹینڈے کا سالن نکال کر کھانے لگی تھی چہرے پر اس قدر مصومیت تھی جیسے اس جیسا صبر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

”پہلی بات تو یہ کہ دعا ایسا کچھ نہیں سوچے گی۔ کیونکہ وہ بھی اپنی اماں کے گھر کوئی مرغ مسلم نہیں کھاتی تھی اور نہ ہی کوئی من دسلوئی آسمان سے اتر کے آتا تھا۔“ بلقیس آراء نے دعا کو طنز یہ نظروں سے دیکھا وہ جانتی تھیں کہ شہیر حسن اگر اس وقت اپنے اندر کی بھڑاس نکال رہا ہے تو وجہ اس کی یہی اس کی بیوی دعا ہے دعا نے تپ کر پہلو ہی بدل لیا اور جو نوالہ شہیر حسن کو دیکھانے کے لئے کھا رہی تھی کڑوا زہر لگ رہا تھا۔

”اور دوسری بات کہ تم مجھے ہر ماہ دس ہزار دیتے ہو دس لاکھ نہیں اور دس ہزار دے کر سمجھتے ہو اپنی ساری ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گئے۔“ بلقیس آراء کا فی دن سے یہ تماشا دیکھ رہی تھیں آج انہوں نے سوچا شہیر اور دعا کا دماغ ٹھکانے لگا ہی دیں۔

”جس میں سے پانچ سے چھ ہزار سارے بل میں نکل جاتے ہیں، بجلی اور کیبل کا زیادہ ہے اور اس کی وجہ سے تمہاری بیوی جو ہر دم نی وی کے آگے بیٹھی سارے ڈرامے کلمیں دیکھتی ہے اور اگر لوڈ شیڈنگ ہو تو اس میں جو تم نے اپنی بیوی کے لئے یو پی ایس لگوایا ہے اس میں وہ سارا ناٹم اپنا سوا بل چارج کر کے جانے کیا کیا دیکھتی ہے۔“

”اماں! اس کا مطلب ہے آپ سارا وقت مجھ پر نظر رکھتی ہیں۔“ دعا تو روہا سی ہو گئی اور یہ ڈرامہ وہ شہیر حسن کے سامنے ہی کرتی تھی۔

”نظر نہیں رکھتی تمہارے شوہر کو دس ہزار کا حساب دے رہی ہوں جو آج وہ بیٹھا مجھ کو طعنہ مار رہا ہے دس ہزار کا۔“

”اماں چھوڑیں نا۔“ اجیارہ نے بلقیس آراء کے بازو پر ہاتھ رکھا، شہیر حسن کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا غم و غصے کی شدت سے۔

”نہیں کیوں چھوڑوں پورا حساب دینے دو۔“ بلقیس آراء نے اجیارہ کا ہاتھ اپنے بازو سے جھٹکا تھا۔

”یہاں اس گھر میں کچھ کہنا ہی گناہ ہے نہیں کھانا مجھے کھانا۔“ شہیر حسن سے جب کچھ بن نہ پڑا تو وہ غصے سے دسترخوان سے اٹھا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا اپنے بیدروم میں جا کر دروازے کو اتنی زور سے بند کیا کہ اجیارہ نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا دعا نے بھی روٹی کا نوالہ چھوڑا اور کھڑکی ہو گئی، بلقیس آراء کو غصے سے گھورتی ہوئی شہیر حسن کے پاس چلی آئی تاکہ اس کی برین واشنگ اور کر سکے۔

”کیا ضرورت تھی بھائی کے منہ لگنے کی دیکھا شہیر بھایا اور دعا بھابی دونوں بغیر کھانا کھائے دسترخوان سے اٹھ کر چلے گئے۔“ اجیارہ کو بھی کھانا کھانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”تم کیوں ان کی فکر میں گھلتی ہو دفعہ کرو تم کھانا کھاؤ۔“ بلقیس آراء کی آنکھوں میں نمی تھی انہوں نے اجیارہ کی پلیٹ میں سالن نکال کر روٹی اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے وہ روٹی واپس ہاٹ ہاٹ میں ڈال دی۔

”لو پھر میں بھی نہیں کھاتی۔“ بلقیس آراء نے اپنی پلیٹ آگے کو کھسکا دی، اجیارہ نے بے چارگی بھری نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔

”اماں! تم دعائی کھاتی ہوں رات کی؟“

”اگر آج ہمیں کھانی تو میر نہیں جاؤں گی۔“

”اللہ نہ کرے اماں! جو ہمیں کچھ ہو۔“ وہ تڑپ کے ان کے قریب آئی تھی اور روہا سی ہو کر ان کے

کندھے پر اپنا سر نکال لیا تھا، بلقیس آراء کو اپنے رویے کا شدت سے احساس ہوا تھا، اجیارہ کا دل دکھا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”اچھا چل بہت میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی بھلا تمہیں یوں اکیلا چھوڑ کے جا سکتی ہوں پہلے تمہاری شادی کروں گی تمہیں تمہارے سسرال بھیج کے پھر سکون سے قبر میں جاؤں گی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اجیارہ کو بوسہ دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”اماں! پھر اٹی بات۔“ وہ ناراضی سے بولی۔

”اب نہیں کرتی یہ لو آج میرے ہاتھ سے کھانا کھاؤ۔“ اماں نے لاڈ و دلار سے اسے کھانا اپنے ہاتھوں سے کھلایا تھا ان کا خود کا تو دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ان کے بیٹے نے نہیں کھایا مگر اجیارہ کی خاطر مجبوراً کھانا پڑا۔

”اچھا سنو! کل زینت تمہارے لیے ایک بہت اچھا رشتہ لے کر آئے گی لڑکے کا اپنا گھر اپنا گاڑیوں کا شو روم ہے آج زینت نے مجھے تصویر دکھانی ہے لڑکا بھی بہت اچھا ہے خوبصورت سا میں نے تو کہہ دیا زینت کو کہ یہ رشتہ میری بیٹی کے لیے ہی لگوانا اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ لڑکے والوں کو تم بہت پسند آئی ہو۔“ کھانا کھانے کے بعد اجیارہ نے دسترخوان سمیٹا اور اپنے بلیقیس آراء کے لیے گرم گرم چائے بنا لے آئی۔

”مگر اماں! میں تمہیں اکیلا چھوڑ کے کہیں نہیں جانے والی۔“

”دشش۔“ بلیقیس آراء نے فوراً ڈپٹا۔

”بدشگون کی باتیں مت کرو رشتہ بہت بہترین آیا ہے میں منع نہیں کروں گی اگر ایک ہفتے میں بھی وہ بوگ شادی کا بولیں گے میں کر دوں گی۔“

”اماں! میں تمہیں بوجھ لگنے لگی ہوں۔“ اجیارہ نے افسردگی سے کہا۔

”نہیں میری جان! مگر ہم اس حقیقت سے بھی نظر نہیں چھین سکتے کہ میری زندگی سے میری سانبوں کی ڈور کب ٹوٹ جائے تمہارا بھائی اور بھانجی ایسے نہیں ہیں جن پر میں بھروسہ کر سکوں۔“ بہت زیرک سوچ تھی ان کی۔ اجیارہ کی تو قطعی سمجھ میں نہیں آئی مگر ہاں وہ اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ ہماری ماں جو سوچتی یا جو کہتی ہے اپنی اولاد کے لئے یقیناً بہت سے راز چھپے ہوتے ہیں ان میں جنہیں وہ اپنی اولاد سے بعض اوقات شیئر نہیں کرنا چاہتی۔

”پتہ نہیں اماں! تم کیا بول رہی ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

”اچھی تمہیں کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا ابھی نہیں جب میری عمر کو پونچھو گی جب سب سمجھ آ جائے گا اب بہت رات ہو گئی ہے صبح اٹھنے ہی سب سے پہلا کام یہ کرنا کہ وہ جو کاشن کا انیمیر ایڈری سوٹ دھانی اور فیروزہ لاکر دیا تھا اس کو استری کر کے پینل کر دینا شام کو وہی پہننا ہے۔“ بلیقیس آراء بہت خوش تھیں اس رشتے کو لے کر وہ تو دسترخوان پر شہیر اور دعا کو بھی بتانا چاہ رہی تھیں مگر بد مزگی ایسی ہو گئی کہ چپ کر گئیں۔ اجیارہ نے بنور بلیقیس آراء کو مسکراتے دیکھا اور چائے کا کپ لے کر کچن میں رکھنے چلی آئی۔

”اتنی دیر کر دی میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“ دعا کی جھنجھلاتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی تھی اجیارہ نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔

”ارے یار! اتنی لمبی لائن لگانی پڑی اتنا رش تھا جیسی دیر ہو گئی۔“ یہ شہیر حسن تھا جس کے لب و لہجے میں اپنی بیوی کے لئے پیار لگاؤٹ چاہت تری سب کچھ تھا اس کے ہاتھ میں بڑا سا شاپر تھا جس میں دو تین بڑے بڑے ڈبے تھے۔

”اچھا اب موڈ خراب مت کرو بروسٹ اور برگر ٹھنڈا ہو جائے گا تو سارا مزہ خراب ہو جائے گا۔“

”ٹھیک کہتے ہیں چلیں جلدی سے کمرے میں آ جائیں“ دعا نے وہ شاپر جھپٹنے کے سہانے انداز میں شہیر سے لے لیا تھا۔

”دعا! اجیارہ کو بھی بلا لو وہ بھی کھانے لے گی اسے Metro کا برگر بروسٹ بہت پسند ہے۔“ شہیر کے لہجے میں

اجیارہ کے لئے محبت جاگتی تھی۔
 ”خدا کے لئے شہیر! آپ میرا موڈ خراب مت کریں اور ویسے بھی اماں اور اجیارہ نے کھانا کھالیا ہے وہ کھانا کھا کے سو بھی گئی ہوں گی۔“

”اچھا..... چلو پھر ہم کیوں بھوکے رہیں۔“ دونوں اپنے بیڈروم میں چلے گئے تھے۔ لیکن میں کھڑی اجیارہ کا دل سے ن صرح دکھا آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بیوی کے لئے اتنی چاہت و محبت اور جو ماں نو ماہ اپنی کوکھ میں رکھ کے اسے جنم دیتی ہے پھر اتنی تکلیف وہ مرحلے سے گزر کے اسے پیدا کرتی ہے اسے پالتی پوستی ہے اس ماں کے لئے شادی ہوتے ہی یہ بیٹے آنکھیں کیوں پھیر لیتے ہیں لہجہ کیوں بدل جاتا ہے رویے کیوں اکھڑے اکھڑے ہو جاتے ہیں۔ اجیارہ نے نہایت تکلیف سے ان کا بہرہ رزہ رکھا تھا اور اپنے آنسو صاف کرنی اماں کے پاس آگئی تھی جو دو والی کھا کے سو گئی تھیں۔

☆☆☆☆

”مما.....“ خاقان ترمذی اور سرینہ دونوں اس وقت ٹی وی پر کوئی نیوز دیکھ رہے تھے غنوی اپنے اور ان دونوں کے لئے کافی کا بھاپ اڑاتا لگ لگے کر آئی تھی اور نیپل پر رکھ دیا تھا۔

”ارے غنوی بیٹی! آپ ابھی تک سوئی نہیں۔“ سرینہ نے اپنے پڑ مردہ چہرے پر خوشی بھری مسکراہٹ بجاتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ دیا غنوی بھی مسکراتی ہوئی ان کے پہلو میں آ بیٹھی تھی۔

”بھئی مجھے تو اس وقت کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی جو میری بیٹی نے میرے سامنے گرما گرم لاکر رکھ دی۔“ خاقان ترمذی نے بنشاش لب و لہجے میں کہتے ہوئے بھاپ اڑاتا کافی کا لگ اٹھا لیا تھا۔ غنوی نے بخور ان دونوں کو دیکھا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ان دونوں کا بنشاش لب و لہجہ خوشی بھری مسکراہٹ سب اسے دکھانے کے لیے ہے ورنہ وہ دونوں اس کے لیے کتنا فکر مند کس قدر پریشان ہیں کیا وہ جانتی نہیں تھی مگر وہ اب اپنے عزیز ترین والدین جان چھڑ گئے والے ممما ڈیڈ کو مزید کوئی دکھ کوئی پریشانی میں دے گی اس نے بہت سوچ سمجھ کر ایک فیصلے پر مہر ثبت کرتے ہوئے دونوں کو خوش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو میری جان؟“ سرینہ نے غنوی کے مصحوم سے چہرے پر سوچ تیز پر نظر ڈالی تھی۔
 ”جی..... کچھ نہیں۔“ وہ چونک کر رہ گئی۔

”مما.....!“ غنوی نے سرینہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
 ”بولو ممما کی جان۔“

”میں شادی کے لئے راضی ہوں آپ جس رشتے کی بات کر رہی تھیں انہیں اوکے کر دیجئے۔“ سرینہ تو جیسے خوشی سے نہال ہی ہو گئیں مگر انہوں نے پھر سے تصدیقی نظروں سے غنوی کو دیکھا کہ آیا کہیں ان کے سننے میں کچھ غلط تو نہیں ہے جو کہ غنوی نے محسوس کر لیا تھا۔
 ”آئی ایم سیریس ممما!“

”بیٹا غنوی! مگر آپ ہماری وجہ سے اس رشتے کے لیے حامی بھر رہی ہیں تو بیٹا آپ پر کوئی زبردستی نہیں ہے آپ کی اپنی زندگی ہے اپنی خوشی سے گزارئے رہا شادی والا معاملہ تو آپ جب اپنی رضامندی دل سے دیں گی تو وہ بھی ہو جائے گی مگر دباؤ میں آ کر کوئی ایسا فیصلہ مت کریئے جس کے لیے بعد میں آپ کو پراہتم ہو، ہمیں

صرف آپ کی خوشی و درکار ہے۔ خاقان ترمذی نے کانی کا ایک گرم سب کے کرواپس ٹیبل پر رکھ دیا تھا ان کا سارا دھیان غنوی اور سبرینہ کی جانب تھا، غنوی کا شادی کے لئے راضی ہونا سبرینہ کا خوشی سے نہال ہونا مگر کہیں ایسا تو نہیں وہ اپنی خوشی کی خاطر اپنی لخت جگر کے ساتھ کوئی نا انصافی کر رہے ہیں بے شک انہوں نے بارہ سال سے غنوی کے معاملے میں چپ ساوہ لی تھی مگر ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنی اکلوتی پیاری معصوم بیٹی سے بے پرواہ بے خبر رہے ہوں اس کی شادی وہ بھی چاہتے تھے مگر اپنی مرضی غنوی پر مسلط کر کے زبردستی اس کی شادی کروا کے غنوی کے اعتماد اس کی شخصیت کو مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے غنوی کی شادی کے لئے رضامندی دینے پر وہ چپ نہیں رہے تھے۔ غنوی نے نم آنکھوں سے خاقان ترمذی کو دیکھا تھا وہ اپنے رب کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا جو اسے اتنے اچھے چاہنے والے ماں باپ دیئے تھے جو صرف اس کی خوشی میں خوش رہنا جانتے تھے۔

”آئی لو یو ڈیو!“ غنوی سبرینہ کے پہلو سے اٹھی اور خاقان ترمذی کے قدموں میں جا بیٹھی تھی۔
 ”آئی لو یو ٹو اینڈ آئی پراؤڈ آف یو مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے اور اپنے رب کا شکر گزار بھی کہ اس نے اتنی فرمانبردار بیٹی میرے نصیب میں دی ہے۔“ خاقان ترمذی نے جھک کر غنوی کے بالوں پر بوسہ لیا تھا سبرینہ نے نم آنکھوں سمیت شفقت سے غنوی کو دیکھا تھا۔

”ڈیڈو! یہ سچ ہے کہ میں اس رشتے کے لئے دل سے راضی ہوں۔“ غنوی نے خاقان ترمذی کے دونوں ہاتھوں کو تمام کران پر بوسہ لیا تھا۔
 ”غنوی“

”مما! اب کوئی بات نہیں میں واقعی بہت خوش ہوں۔“ غنوی نے سبرینہ کے کہنے پر ہاتھ رکھ کر مزید آگے نہیں کچھ بولنے سے روک دیا تھا۔
 ”مگر میری شرط ایک اور بھی ہے۔“

”وہ کیا...؟“ خاقان ترمذی اور سبرینہ نے بیک وقت کہا تھا۔
 ”وہ یہ کہ کل کی اینول پارٹی میں آپ دونوں میرے ساتھ جامعہ چلیں گے۔“
 ”اوکے ڈن۔“ سبرینہ نے تفروراً حای بھری تھی۔

”مگر مائی چائلڈ! میری طرف سے ڈن نہیں ہے۔“ خاقان ترمذی نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کے کہا۔
 ”کیوں ڈیڈو؟“ اس نے بچوں کے سے انداز میں کہا تھا۔

”وہ اس لئے کہ کل ہمارے آفس میں ایک ڈبلی گیشن آ رہا ہے وہ میٹنگ بھی بہت اہم ہے اور آپ تو جانتی ہیں کہ مجھے ان سب شور شرابے سے الجھن ہوتی ہے مگر آئی پرومیس کہ میں آپ دونوں کو رات کو جامعہ سے پک کر لوں گا نا صرا اور میری طرف سے ”پرل“ میں ایک شاندار ڈنر بھی۔“

”اٹ از ناٹ فیئر ڈیڈو! آپ جتنی تیزی سے ناراض کرتے ہیں اس سے کہیں جلدی منا بھی لیتے ہیں۔“ غنوی نے اپنے شفیق باپ کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تھا۔
 ”اس لئے کہ آپ ہم سے خفا نہ ہوں۔“ انہوں نے غنوی کی چھوٹی سی ناک دبائی۔

”اب ایسا ہے کہ کانی تو بالکل ٹھنڈی برف ہو گئی مینے میں بھی مزہ نہیں آئے گا۔“
 ”نو پرابلم ڈیڈو! میں ہم تینوں کے لیے دوسری گرما گرم کانی بنا کے لاتا ہوں۔“ غنوی مسکراتی ہوئی ٹرے اٹھاتی کھن میں چلی آئی تھی۔ غنوی کے جانے کے بعد سبرینہ نے اپنا سیل فون اٹھایا۔

”اب یہ آپ کیا کرنے لگی ہیں؟“ خاقان ترمذی کا اشارہ ان کے ٹیل فون کی جانب تھا۔
”میں سارہ کو فون کر رہی ہوں اور اسے غنوی کی شادی کے لئے رضامندی دینے کی خوشخبری سنانے لگی تھی۔“ سبرینہ کے چہرے پر خوشی کے سارے رنگ تھے۔

”سبرینہ! آپ کو لگتا ہے کہ آپ ٹھیک کر رہی ہیں؟“ خاقان ترمذی نے سبرینہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا، غنوی کی رضامندی سے وہ بھی بہت خوش ہوئے تھے مگر دل میں کہیں یہ سوال بھی اٹھا تھا کہ اپنی خود غرضی میں وہ غنوی کے ساتھ کوئی نا انصافی نہ کر جائیں۔

”خاقان! آپ کے دل و دماغ میں جو بھی خدشات وہم یا سوالات ہیں وہ سب ہیں تو بالکل درست مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سب لامعنی ہیں ہمیں ہماری بیٹی کو ایک خوشیوں بھری آسائشوں سے مکمل زندگی دینی ہے جس میں وہ اپنے دن و رات بھر پور بغیر ڈرے اعتماد کے ساتھ گزارے اور غنوی کے لئے رافع ثانی سے بڑھ کر مجھے کوئی نہیں لگتا، میں رافع ثانی سے پرستی مل چکی ہوں وہ ایک سعادت مند فرمانبردار خوش شکل اور بہترین انسان ہیں جو ہماری غنوی کے لئے بیٹھ ہیں۔“

”اؤکے! اگر آپ مطمئن ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بس ایک ذرا سی ریکویسٹ کہ غنوی سے ایک بار اڈیشنل سے پوچھ کر پھر سارہ کو جواب دے دیجئے گا۔“

”ٹھیک ہے آپ کی خواہش سر آ نکھوں پر۔“ سبرینہ مسکرا دیں اور سیل فون واپس ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ خاقان ترمذی اور سبرینہ کے چہرے پر زندگی سے بھر پور خوشی بھری چمک سی جیسے غنوی کو جتنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆☆

”کم آن ڈارلنگ۔“ ازبیلانے پیچھے پلٹ کر دیکھا ذکی وہیں دروازے پر رک چکا تھا یہ ریڈ لائن ایریا تھا یہاں کی طوائف زادیاں دور دور تک مشہور تھیں اپنے ہوشربا حسن اپنی قاتلانہ اداؤں، جان لیوا قصے، پیروں میں بندھے گھنگھرو کی جھنکار کی وجہ سے یہاں بڑے بڑے امیر زادے بگڑے رئیس و ڈیرے سب یہاں اپنا دل بہلانے آتے تھے۔ ذکی نے ازبیلانے کے بھکتے عریاں حسن کو بخور دیکھا تھا اور منہ پر مسکراہٹ سجائے اندر داخل ہوا تھا۔

”ہائے۔“ وہاں کتنی ہی لڑکیاں ذکی کو دیکھ کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ”آہ“ بھر کے رہ گئی تھیں کچھ کے تو سینے پر سانپ بھی رینگ گئے تھے ازبیلانے کے ساتھ ذکی کو دیکھ کر۔

”ازبیلانے! تو لڑکیاں لے کر آتی ہے یہاں کیا خوبصورت اور ڈھنگ لڑکوں کی سپلائی کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔“ ایک لڑکی نے جس نے بڑی مہارت سے خوبصورت سامیک اپ کیا ہوا تھا اس نے ازبیلانے کو طنزیہ نظروں سے دیکھا اور پھر لپائی نظروں سے ذکی کو دیکھنے لگی تھی ازبیلانے کا قبضہ بڑا چاندرا تھا۔

”تو باز نہیں آئے گی اپنی حرکتوں سے شبنم!“ ازبیلانے کو اس کی طنزیہ بات بالکل بری نہیں لگی تھی بلکہ وہ تو اب اس کو انجوائے کرتی تھی اس کی حاسدانہ طبیعت اس کی جلیسی اس کی طنزیہ اور زہریلی کڑوی باتوں پر ہنستی تھی۔
”کیا کریں اپنا تو کام ہے جہاں خوبصورت اور چارمنگ مرد دیکھو اپنا کام نکلاؤ۔“ شبنم دو قدم ذکی کے پاس بڑھی تھی اور بخور اس کے گرے کانچ میں جھانکنے لگی تھی۔

”مگر میری جان! یہاں نواشری کا بورڈ لگا ہوا ہے، کیونکہ یہ ٹام کرومیرا ہے۔“ ازبیلانے بڑے اعتماد سے ذکی کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

”اچھا۔“ شبنم واپس دو قدم پیچھے ہٹی اور ایک اونچا مگر طنزیہ بھر پور قبضہ لگایا تھا جیسے اس کا مذاق اڑا رہی

www.paksociety.com
ہو، شبنم کی یہ بلی کی کوئی ایک روم تک تو رہی ہی ہوگی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔
”نسم سے ازیلا تو مذاق بہت اچھا کرتی ہے۔“

”کیا مطلب ہے تیرا؟“ ازیلا کی کمان جیسی ابرو اچکی تھیں۔
”مجھے نہیں یاد ہے یہی بات تو نے اپنی واحدی کے بارے میں کہی تھی۔ وہی بے غیرت کم ذات جو یہاں اس جگہ کبھی اپنے دن تو کبھی اپنی راتیں رنگین کرنے آتا ہے۔“ کس قدر نفرت تضحیک تھی اس کے لب و لہجے میں اپنی واحدی کے لیے ذکی تو نا اچھی کی کیفیت میں کبھی شبنم تو کبھی ازیلا کو تکتے لگا تھا۔
”کیا بکواس ہے یہ؟“ ازیلا صبح معنوں میں کڑ بڑا کے رہ گئی۔ شبنم کی فضول بات ضرور تھی مگر اس کے لیے ایک کڑوا سچ بھی اور اس کے اس کڑوے سچ کی وجہ سے ذکی اور ازیلا کی دوستی پر فرق آسکتا تھا جو ازیلا کو قطعی برداشت نہیں تھا۔

”چل تیری نظر میں بکواس ہی سہی یہ کڑوا سچ۔“

”وہی تو کہاں دفع ہو رہی تھی؟“

”مجھے نہیں پتہ تھائی لینڈ سے عابد جوفا آیا ہے اسی کی خدمت گزاری کے لئے سینا بانی مجھے بھیج رہی ہے۔“
”عابد جوفا؟“ ازیلا نے یہ نام دھیرے سے دہرایا تھا، مگر تیز ترین سماعت رکھنے والی شبنم کے کانوں سے محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔

”ہاں عابد جوفا..... اب دیکھنا یہاں کی سب سے ہاٹ اینڈ سیکسی ہوشر باحسن رکھنے والی صرف ایک میں ہی تو ہوں ورنہ سینا بانی تجھے نہ بھیج دیتی۔“ شبنم نے بہت کچھ اچھے بتایا تھا۔
”شبنم“ پیچھے سے سینا بانی کی چٹکھاڑنی آواز ابھری تھی۔ شبنم نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا وہ یہیں اس کے پاس آ رہی تھیں۔

”تو ابھی تک یہیں پر ہے گی نہیں۔“

”بس جا ہی رہی تھی وہ اور اتنے میں ازیلا مکرانی“ شبنم نے طنز یہ مسکراہٹ سمیت ازیلا کے فن چہرے کو دیکھا تھا۔
”اچھا اب جا جلدی نیچے عابد جوفا کا ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔“ سینا بانی نے کرخت آواز میں اس کو حکم دیا۔
شبنم نے ترچھی نظروں سے سینا بانی کو دیکھا اور پھر ذکی کی طرف بڑھی۔

”کبھی آنا ہمارے پاس بھی آپ کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔“ اور پھر بالوں کو جھٹکا دیتی ایک طنز یہ مسکراہٹ ازیلا کی طرف اچھالتی آگے بڑھ گئی۔

”اس کی زبان حد درجہ پتلی کی طرح چلنے لگی ہے کاشی کیوں نہیں ہو؟“ ازیلا کے خوبصورت چہرے پر غصے کے رنگ واضح نمایاں تھے۔

”چل دفع کرتی کیوں اس کا غم پالتی ہے سن کر رفع دفع کیا کر سالی ہے بھی تو خوبصورت ٹھیک ٹھاک کام آتی ہے۔“ سینا بانی کے لب و لہجے میں شبنم کے لیے فخر بول رہا تھا۔

”تم بھی ٹھیک کہتی ہو اچھا یہ تاؤ عابد جوفا آیا ہے تم نے مجھے بتایا نہیں۔“
”اب کیا ساری باتیں نہیں کر لے گی کھڑے کھڑے اندر چل۔“ سینا بانی کی نظر خاموش سے ذکی پر پڑی۔

”یہ وہی ہے تیرا نام کروڑ؟“
”تم جانتی ہو ہر ایرے فیرے کو میں اپنے ساتھ لے گوتی بھرتی بھی نہیں ہو۔“ ازیلا نے چاہت سے ذکی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



”ہاں ہاں میں سب جانتی ہوں ایسے ہی تو مجھے تم دونوں پر فخر نہیں ہے۔“ سنیتا بانی کا اشارہ شبہم کی جانب تھا۔
”اچھا اب تو بتا دو عابد جو فنا کا کیا قصہ ہے خیریت وہ یہاں کراچی کیا کرنے آیا ہے۔“ ازبیلہ نے بغیر رہ بھی نہیں سکتی تھی۔

”جانتی ہوں تیری عادت جانے بغیر رہ بھی نہیں سکتی۔“ وہ مکروہ ہنسی کے ساتھ بولی تھیں۔
”جب جانتی ہو تو کیوں سنسن رکھتی ہو۔“

”جو لڑکیاں تو نے یہاں بھجوائی تھیں عابد جو فنا خود انہیں یہاں دیکھنے آیا ہے اور جو پسند آئیں گی انہیں اپنے ساتھ لے جائے گا اور جو نہیں تو جاتی ہیں وہ یہاں ہمارے ہاں کی زینت بن جاتی ہیں لوگوں کا اسیر زادوں کا دل بہلاتی ہیں۔“

”وہ تو ہے۔“ ازبیلہ مسکرا دی۔

”چل آندر ایک نئی لڑکی کو ٹرین کر کے اس کو آج محفل کی زینت بنایا ہے۔“
”کوئی والی؟“

”ارے وہی جسے ایڈمی سینٹر کے روڈ سے اٹھایا تھا بڑی خوبصورت سی ہے گوری جی تو دیکھ تو سارے بگڑے رئیس اس پر اپنی دولت لٹا رہے ہیں اور کتنوں نے تو مجھے ایڈونس رقم بھی دے دی ہے۔“ سنیتا بانی کے لہجے میں لالچ بول رہا تھا۔ وہ تینوں محفل رقص میں داخل ہوئے ذکی نے بغور لڑکی کو دیکھا جو نہایت زبردست رقص کر رہی تھی ذکی تو حیران ہی رہ گیا بلکہ دنگ بھی وہ لڑکی کوئی بارہ سال کی ہوگی ازبیلہ نے بھی اس کو ناچتے ہوئے دیکھا اور ان سب لوگوں کو جن میں کچھ ساٹھ ستر سال کے آدمی تھے تو کچھ بیس پچیس سال کے خاندانی بگڑے رئیس جو اس لڑکی کے رقص پر عیش کر رہے تھے اور اس کے لہراتے دوپٹے کو کھینچ بھی رہے تھے۔

”سنیتا بانی! غلطی سے پابھول سے بھی اس لڑکی کو کسی کے ساتھ بھیج مت دینا۔“ ازبیلہ نے کہا۔

”کیوں نہیں سمجھوں دیکھ تو آہی جب ایک جھلک پر یہ سب اپنی دولت بچھا کر رہے ہیں تو جب سمجھوں گی تو اچھا خاصا پیسے کا۔“ کس قدر لالچ تھا سنیتا بانی میں ہوس بھی پیسے کی۔
”پاگل ہوئی ہو تم یہ لڑکی ابھی بارہ سال کی ہے۔“

”کہہ تو تو ٹھیک رہی ہے۔“ سنیتا بانی نے ازبیلہ کو برسوج نظروں سے دیکھا تھا۔

”چل بیٹھ.....“ وہ تینوں وہیں سفید چاندنی پر بیٹھ گئے۔

”اب بتا یہاں کس کام سے آئی تھی۔“

”میں تو انہی لڑکیوں کے لئے آئی تھی Skype پر عابد جو فنا کو دیکھاتی مگر وہ خود ہی یہاں آ گیا تو میرا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“

”تم اپنی سناؤ سید آغا شہباز علوی سے بات ہوئی؟“

”دشش.....“ سنیتا بانی نے فوراً سے اس کا ہاتھ دبا کر آنکھوں کے اشارے سے اسے آگے کچھ بولنے سے منع کر دیا اور ایک اشارہ ذکی کی موجودگی کی طرف بھی کیا۔

(باقی آئندہ)

”خدا کے لیے چھوڑ دو میرا بیچھا خود بھی شکوں سے جیواور میرا بھی سکون پر بادرت کرو۔ مجھے نفرت ہے تم سے تمہارے بدکار چہرے سے بے پناہ نفرت۔“ یہجانی انداز بے رحم لہجہ آواز بھی کہ کوئی بے درد ضرب جوائنتے بٹھتے جاگتے سوتے اس کے کانوں میں گونج کر ہمدقت اسے ذہنی اذیت سے دوچار کیے رکھتی تھی۔ اس وقت وہ ٹرائیکو لائز کے زیر اثر بمشکل چند گھنٹے ہی سو پایا تھا کہ وہ زہر آلود لہجہ اور بے درد الفاظ ایک بار پھر اس کی سماعتوں سے ٹکرا کر دل و دماغ میں طوفان برپا کرنے لگے۔ کمرے میں شدید ٹھن کا احساس ہوتے ہی اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں پاس پڑاپانی کا گلاس حلق میں انڈیلنے کے بجائے خود پر گرایا اور اسی اضطراب کی ہی کیفیت میں کمرے سے باہر نکلا۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں رسٹ داچ کی جانب اٹھیں۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ ریٹ داچ سے نگاہ پھسلی تو اسے اپنے ننگے پیر دیکھ کر جاگڑ کا خیال آیا۔ وہ مڑا اور سفید جاگڑ باتھ میں لیے باہر آ گیا۔ فلیٹ لاک کرنے کے بعد وہ وہیں بیٹھیوں پر ٹک گیا اور غائب دماغی کے عالم میں جھک کر جوگڑ پہنے لگا۔ کسے باندھتے ہوئے اس نے دوبار سر اٹھا کر ادھر ادھر لوگوں کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے کی ناکام کوشش کی اور پھر اسی

مکمل ناول

ثناء ناز

خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھیاں اتر گیا۔ تیخ بستہ دسمبر کی اس سوگوار شام میں ہر ذی اپنے جو بن پرتھی۔ وہ نو جوان سلپنگ ڈریس پہنے ہوئے تھا۔ بڑھی ہوئی شیواڑے اڑے سے بال اس تیخ بستہ شام سے بھی زیادہ سرد منجھد لگا ہیں۔ وہ اپنے حلیے سے بے نیاز ارد گرد کی پروا کیے بنا بس چلا جا رہا تھا۔ راستے میں اودر کوٹ اور گرم سویٹرز میں بلبوس اکا دکا نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک اچھی سی نظر ان لوگوں پر ڈالی اور بے تاثر سا چلتا ہوا اپنے حلیے کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا جہاں گرم جرابوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس نے دوسری نظر ٹھنڈ میں منجھد ہوتے اپنے سرخ ہاتھوں پر ڈالی، جہاں کوئی دستا نہ موجود نہ تھا اس نے سر پر بھی کوئی گرم ٹوپی نہیں پہنی تھی۔ وہ واحد سلپنگ ڈریس میں بلبوس تھا مگر پھر بھی ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کے دل و دماغ پر بوجھ بڑھ رہا ہو، یہ اس کا وہم تھا یا حقیقت وہ جان نہیں پایا مگر سخت سردی کے باوجود بھی اسے اپنا آپ مکمل طور پر شدید پسینے میں شرابولگا۔ سوسائٹی سے نکلنے ہی نو جوان نے اپنے قدموں کی رفتار مزید بڑھادی۔ سامنے کشابرم مورل تھا اس مورل کے پیچھے کئی پہاڑ تھے۔ اگلے کچھ لمحوں میں اس نے اپنے آپ کو سامنے موجود پہاڑوں کی طرف بے خود سا بھاگتے ہوئے محسوس کیا۔

”مجھے تم سے نفرت ہے بے پناہ نفرت۔“ بے درد انداز ظالمانہ مسکراہٹ اس کے کانوں میں مسلسل گونج رہی تھی۔ ان آوازوں سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ کہیں دور بہت دور بھاگ جانا چاہتا تھا، جہاں کوئی مسکراہٹ کوئی آواز کوئی احساس ندامت اس کا پھجانہ کر سکے۔

”میں مجرم نہیں ہوں خدا کے لیے مجھے معاف کر دو یا پھر وہ لگاتار لوٹا دو جہاں میں تھا۔ جہاں دور تک تمہاری



پر چھائی بھی موجود نہیں تھی۔ وہ ایک ٹوٹے ہوئے تھے۔ کی مانند گھنٹوں کے بل پتھروں پر جھکا ہوا کانوں پر ہاتھ رکھے خود تری کے عالم میں چیخ رہا تھا۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ جس تک وہ اپنی آواز پہچانا چاہتا ہے وہ اس کے آس پاس نہیں بھی موجود نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ ٹوٹا ہوا اس کا بے بس لہجہ تھا۔ آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر برسے تو آسمان بھی اس کے دکھ میں شریک ہونے کی غرض سے برسنے لگا۔ بارش کی شدت جتنے آنسوؤں کی شدت کو مات دینے لگی تو اس نے واپس جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ سخت بارش، گھپ اندھیرے اور شدید دھند کے باوجود ہانپتا کانپتا فلیٹ میں داخل ہوا۔ چیخ کرنے کے بعد اس نے ٹی وی آن کرنے کے ساتھ ساتھ بیئر آن کیا اور سائیڈ ٹیبل پر بڑی انرجی ڈرنکس کا اسٹاک ایک کے بعد ایک کر کے ختم کرتا چلا گیا۔ ٹی وی پر بلیک ساڑھی میں لپٹا ہوا ایک چہرہ نمودار ہوا۔ اس ایک چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے لیے بانی ہر شے ساکن ہونے لگی اور باغی سوچوں کا احاطہ ایک بار پھر ماضی کی بے رحم گلیوں میں قدم رکھنے کو بے قرار ہوا۔ سسکیاں، آہیں، درد، چیخ و پکار، کہیں زندگی کے ختم ہونے پر ماتم کرتے اور کہیں زندگی کی نوید ملنے پر خوشی سے جھگمگاتے چہرے۔

☆.....☆

وہ زوردار ڈکے سامنے چاروں اطراف پھیلے وسیع و عریض لان کے ایک کونے پر پڑے بیچ پر تنہا خود میں بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں افراتفری کے عالم میں ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے ان گنت لوگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑا بیٹھوچ اور جوس کالگ ویسے کاویا بڑا تھا۔ آنسوؤں کی ایک لکیر اس کے اداس زرد چہرے پر واضح تھی۔ سرخی مائل آنکھوں کے گرد پھیلے گہرے حلقے ایک الگ داستانِ غم سنار سے تھے، جیسے وہ بہت دنوں سے مسلسل رو رہی ہو۔ ہوا کے زور پر آنکھلیاں کرتی بے ترتیب بالوں کی ٹیس بکھی اس کے اداس چہرے کا احاطہ کرتی تو کبھی پیچھے کی جانب چلی جاتی۔ کبھی بھی کہیں دور سے ایسبولینس کا سائرن بجتا سنا دیتا تو وہ دل تھام کر خود میں مزید سمٹ جاتی۔

زاوہ لپنڈی کے عشی جیسے میں موجود اس اسپتال میں بتائی جانے والی ہر شام اس کے لیے یہی درد بھرے لوازمات لے کر اتر کرتی تھی۔

”سروش تم یہاں بیٹھی ہو میں کب سے تمہیں ویننگ روم میں ڈھونڈ رہا تھا، اب کیسی طبیعت ہے خالہ جان کی؟“ ارسل نے اسے اس ویران کونے میں تنہا بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔

”ماما! ابھی تک کوڑے میں ہیں وارڈ میں موجود مریض دیکھ کر میرا دم گھٹ رہا تھا۔ اس لیے میں یہاں کھلی فضا میں چلی آئی، بیٹھیں آپ۔“ وہ سائیڈ پر ہو کر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”تم بہت بہادر ہو جو اتنا سب کچھ بنا کسی کا سہارا لیے تنہا نہیں کر رہی ہو۔“

”جب اللہ کا ساتھ حاصل ہے تو ان عارضی سہاروں کی کیا ضرورت، بس دعا کیجیے گا وہ میرا حوصلہ یونہی بڑھائے رکھے۔“ وہ ماتمی سا مسکراتی ہوئی کھوٹی کھوٹی سی بولی۔

”مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ آئی تو تھوڑا مشکل ہو گا مگر تمہیں بڑی ہمت اور صبر کے ساتھ میری بات سنی ہوگی۔“ ارسل نے پچکچاتے ہوئے کہا۔

”بات تو مجھے بھی آپ سے کرنی تھی خیر پہلے آپ کہیے۔“ وہ سامنے کھڑی ایسبولینس کی جلتی بجھتی ریڈ لائٹ پر نظریں گھاڑے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

www.paksociety.com
”نہیں پہلے ختم ہوا ہو سکتا ہے میری بات سننے کے بعد تم مجھ سے کوئی بات نہ کرنا چاہو“ اس نے ازلی ضاف کوئی سے جواب دیا۔

”آپ مجھے ڈرارے ہیں؟“ سروش نے اپنی نگاہوں کا زاویہ بدلا۔
”نہیں میں تمہیں حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہا ہوں بتاؤ کیا بات ہے۔“
”ارسل! وہ ماما چاہتی ہیں جتنی جلدی ممکن ہو ان کی میجر سرجری سے پہلے ہمارا نکاح ہو جائے۔“ وہ جھجکتے ہوئے ماں کی خواہش زبان تک لاپائی۔ اس ایک لمحے میں اسے محسوس ہوا تھا کہ کسی لڑکی کے لیے خود اپنی شادی کی بات کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

”آئی ایم سوری مگر اب ایسا ممکن نہیں رہا۔“ اس نے اپنا سر مزید جھکاتے ہوئے کہا۔

”کیوں پاسمیل نہیں رہا؟“ سروش نے جواز جاننا چاہا۔
”لو خود دیکھ لو۔“ ارسل نے مہرون اور گولڈن ویلوٹ میں لپٹا ایک نفیس سا ویڈنگ کارڈ اس کی جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام رہی۔

”پڑھ لو پتا چل جائے گا؟“ ارسل نے بیگانگی دکھانے کی کوشش کی۔

”یہ... یہ تو آپ کی شادی کا کارڈ ہے۔“ وہ بے یقینی سے کہہ پائی۔

”ہاں یہ میری شادی کا کارڈ ہے۔“ اس نے اس کی بے یقینی پر تصدیق کی بے درد مہر لگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”تم تو جانتی ہو ابو ہماری مگنی سے کبھی خوش نہیں رہے، اب انہوں نے زبردستی میری شادی اپنے مرحوم بھائی کی اکلوتی بیٹی سے طے کر دی ہے۔ ابا کہہ رہے تھے ان کے بھائی کی کروڑوں کی جائیداد ہے۔ یہ ساری جائیداد خاندان میں ہی رہے تو بہتر ہے اور ان کے نزدیک ناشا کے لیے مجھ سے بہتر Match موجود نہیں تھا۔“ اس نے اپنی چچا زادکانام لیتے ہوئے وضاحت دی۔

”میں نے اور اماں نے بہت کوشش کی ابا کو منانے کی مگر تم تو جانتی ہونا ان کی ہر بات پتھر پر لکیر ہوا کرتی ہے حالات چاہے جیسے بھی ہوں وہ اپنے فیصلے سے کبھی نہیں ہٹتے۔ اماں بہت شرمندہ ہیں ان میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ خالہ کا سامنا کر پاتیں جیسی مجھے اپنا پڑا۔“ وہ دھیرے سے اسے حقائق سے آگاہ کر رہا تھا۔
”ارسل! تم مذاق کر رہے ہونا؟“ جانے کیا بات تھی دل و دماغ اس قدر بے ہودہ مذاق کو حقیقت سمجھنے سے

عاری تھے۔

”نہیں سروش! یہی حقیقت ہے ابانے دھمکی دی ہے اگر کسی نے ان کے فیصلے کی مخالفت کی تو وہ خودکشی کر لیں گے۔“ وہ بے بس تھا۔

”میں تمہاری مگنی تر ہوں۔ آج سے نہیں پچھلے 18 سالوں سے۔“ اس نے چیختے ہوئے ارسل کو یاد کروانے کی کوشش کی۔

”تمہیں ایک میل کے لیے خیال نہیں آیا کہ میرا کیا ہوگا میرا تھا ہی کون تم لوگوں کے سوا جواب تم یہ رشتہ بھی ختم کرنے آگئے ہو۔“ آنسو پلکوں کی باڑ میں آٹھ رہے۔

”امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ اندر آئی سی یو میں پڑیں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہیں اور تمہیں نیا رشتہ جوڑنے کی پڑی ہے تم لوگ اس قدر ظالم کیسے ہو سکتے ہو، مانا کہہ رہی تھیں وہ جلد از جلد تمہارا نکاح کرنا

چاہتی ہیں۔ میں کس منہ سے جاؤں گی ان کے پاس کیا جواب دوں گی۔ دیکھو پلیز ابھی رک جاؤ، ابھی یہ رشتہ ختم
ست کروور نہ میری ماں یہ صدمہ سہہ نہیں پائے گی۔“ وہ بے یقینی کے عالم میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا کر رہی تھی۔
”ابا کے فیصلے کے آگے میں مجبور ہوں سروش مجھے معاف کر دینا۔“ وہ مزید عاجز ہوا۔
”ہونہہ.....!“ وہ بے بسی سے مسکرائی اس کی مسکراہٹ بڑی اداس اور رلا دینے والی تھی۔

”تم سب نے اس موڑ پر آ کر میرا ساتھ چھوڑا ہے جب مجھے تم لوگوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ خیر کیا
کیا جائے دنیا مفاد پرست جو ظہری۔“ وہ گردن ہلا کر خود ہی اپنی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہنے لگی۔
”اب تم جاؤ یہاں سے میں نے تم سب کو معاف کیا۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے پاؤں ہاتھ کی
تیسری انگلی میں موجود رنگ اتاری جو حالہ نے اسے ڈگری کمپلیٹ ہونے پر بڑے چاہ سے پہنائی تھی اور ارسل
کے ہاتھ میں تھما دی۔

”میں بے بس ہوں۔“ وہ جذباتی ہوا۔

”میں سمجھتی ہوں۔“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے سرد مہری سے بولی۔

”سروش! کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کال کر لینا۔“

”نہیں ارسل! جب وہ آزمائش میں ڈالتا ہے تو چٹان سا صلہ بھی عطا کر دیتا ہے۔ اس کا شکر ہے اس نے
سروش درانی کو کسی کا محتاج نہیں بنایا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ دو دن بعزای کی سر جری ہے۔ ہو سکتے تو دعا کر دینا۔“
وہ ٹوٹے ہوئے دل کی کرچیاں سینے ہوئے تیزی سے مڑی تو آنسوؤں کا طوفان چھلکنے کو بے قرار ہوا۔ اسے
سنگے خونی رشتوں سے اس قدر خود غرضی کی امید نہیں تھی اور شاید کسی کو بھی نہیں ہوا کرتی۔ ارسل جا چکا تھا۔ وہ پلٹ
کر دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے پکارنا نہیں چاہتی تھی، وہ کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ زندگی میں بہت سے درد
بہت سے ستم ہمیں ان چاہیے ملتے ہیں۔ ایک بار اچانک اور پھر ایک کے بعد ایک طویل سلسلہ کبھی نہ رکنے والا
سلسلہ، اس عالم میں سروش کو کچھ اور نہ سوجھا تو وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوٹ پوٹ کر رو پڑی۔ جیسے اللہ
سے اپنے رشتے داریوں کی اس قدر بے اعتنائی برتنے پر شکوہ کناں ہو۔ پچھلے تین ہفتوں سے وہ ماٹرنل اسپتال
میں تنہا خوار ہو رہی تھی ان تین ہفتوں میں اس کے تینوں ماموؤں نے اپنے عالیشان محلات سے نکل کر بہن کی
خیریت معلوم کرنے کے لیے 3 منٹ کی بھی تکلیف نہیں کی تھی۔ ہاں چھوٹے ماموں نے ایک دو بار فون کرنے
کی زحمت ضرور کی تھی۔ وہ تنہا تھی اور اسے تنہا ہی آزمائشوں کو جھیلنا تھا اور یہ بات وہ کافی عرصہ پہلے جان چکی
تھی۔ زندگی ہمیشہ جذبات کے سہارے نہیں گزرتی، کبھی کبھی جذبات کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں داخل
ہونا پڑتا ہے، سمجھنا پڑتا ہے، آگے بڑھنا پڑتا ہے، اس نے دنیا سے امید لگانا چھوڑ دی تھی وہ ایک در پر سر جھکانی
تھی اور اس ایک در نے اسے صبر اور حوصلے کا پیکر بنا دیا تھا۔ دسمبر کی اس اداس شام جانے وہ کون سی کڑیاں تھیں۔
کون سے رابطے تھے جو دنیا کی بھیڑ میں سوگواری کی چادر اوڑھے اپنوں کے بھلا دینے پر آنسو بہاتی، اس تن تنہا
لڑکی کو یہاں سے کوسوں دور برف کی وادی میں پہاڑوں کی چٹانوں سے شکوہ کرتے آنسو بہاتے ایک اپنے کو
بھول جانے کی کوشش میں ہلکان اس کوہ پیا سے ملاتے تھے جو غم ہجر سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ درد کس کو نہیں ملتا اور
درد کا احساس کسے نہیں ہوتا۔ درد سب کو ہوتا ہے بس ہر ایک کے درد کی نوعیت الگ ہوتی ہے۔



یہ جنوری کی ایک سرد شام تھی۔ سرور ہیلٹ سینے، اسپورٹس ڈریس میں بلوس واٹس جو گزرتیوں میں اڑ سے

www.paksociety.com

وہ 17/18 سال لڑکا جس کی آنکھیں جنوری کی صبح سردی سے بھی زیادہ سرد تھیں اپنی لکڑی بائیک پر سوار ہو کر گھوڑے کو مات دینے پر تلا ہوا تھا۔ پھر نی سے دائیں بائیں ریش انداز میں ڈرائیو کرتا دھڑا دھڑا گاڑیوں کو اوور ٹیک کرتا ہوا وہ ملتان کی پرہجوم ٹریفک کو قدرے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے رہ جانے والے موٹر سائیکلوں پر سوار اپنے دوستوں کو ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا اور آگے پیچھے دیکھے بغیر اسی برق رفتاری کے عالم میں بائیک کا اگلا پھیپہ اوپر اٹھا دیا۔ موٹر سائیکل سواروں نے ستائش آمیز نگاہوں سے ہوا کی سی رفتار سے بائیک اڑاتے اس نوجوان کو دیکھا اور ہونٹک کرتے ہوئے اس کے پیچھے آنے لگے۔ یونہی خطرناک انداز میں ڈرائیو کرنے کے بعد اس نے پہلے اپنا ایک ہاتھ ہینڈل سے الگ کیا پھر دوسرا اور پھر دونوں ہاتھوں کو فولڈ کر کے نیچے رکھتے ہوئے تکیہ بنایا اور زن کی رفتار سے ٹریفک سگنل بریک کر گیا۔ ٹریفک پولیس کے اہلکار بھی اسے روکنے کے بجائے الٹا اس جان لیوا کرتب پر داد دے کر اس کا حوصلہ مزید پختہ کیا کرتے تھے۔ اپنے پوائنٹ پر پہنچ کر وہ سیدھا ہوا اسی برق رفتاری سے بائیک چلاتے ہوئے اچانک بریک لگائی، چرچانے کی آواز کے ساتھ بائیک کے ٹائر ایک دم رکے تھے۔ وہ بائیک سے اترا، ہیلمٹ اتار کر سائیڈ پر رکھا اور بیش قیمت سگار کے کش لیتا ہوا وہیں کھڑا بہت پیچھے رہ جانے والے دوستوں کا انتظار کرنے لگا۔ اگلے کچھ لمحوں میں چاروں بائیکس کے بعد دیگرے اس کے سامنے آئیں۔

”واؤ بڈی کمال کر دیا تو نے اسی خوشی میں آج کی باری کیو پارٹی میری طرف سے۔“ کاشف اپنی بائیک سے اتر کر سیدھا اس کی طرف لپکا۔

”یار گلہان تو ہارنا کب سیکھے گا؟“ سعد نے اس کے کندھے پر دھبہ رسید کرتے ہوئے کہا تو اس کی سرد مہر آنکھیں کوئی تاثر دئے بنا ایک دم چمک اٹھیں۔

”سچ گلہان! ہماری ترسرت ہی رہے گی تجھے ہارنا دیکھنے کی۔“ میر نے حسرت بھری آہ بھرتے ہوئے صدا لگائی۔

”آخر ہمیں بھی تو ہماری جیب خالی کروانے کا موقع ملنا چاہیے کیوں دوستو؟“ زبیر نے بلند و بالا آواز میں دوسروں کو متوجہ کیا جواب سگریٹ سلکانے میں مصروف تھے۔

”بالکل ٹھیک کہا تو نے۔“ بوکی باری نے زبیر کی بات کی فوراً تاکید کی تھی۔

”اوکے ٹھیک ہے۔ کیا یاد کرو گے کس سٹی سے پالا پڑا ہے آج کی پارٹی وہ ہیوی ڈرکس میری طرف سے۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے مزید لا پرواہی کا تاثر دیا۔

اور اگلے پون گھنٹے میں وہ شہر کے مہنگے ترین ریسٹورنٹ میں بیٹھے گلہان کی طرف سے پے (Pay) کیے گئے ان پیسوں کی دعوت اڑا رہے تھے جو بابا نے صبح اسے اپنے خون پسینے سے کمائی گئی حلال کمائی میں سے اکیڈمی کی فیس ادا کرنے کے لیے دیئے تھے۔

☆.....☆

اگست کی تہتی صبح سورج کی چبھتی کرنیں کھڑکی کے پردوں میں سے جھپکتے ہوئے اس کے تاریک کمرے میں روشنی بکھرنے کے ساتھ ساتھ اس کی گہری نیند میں بھی خلل پیدا کر رہی تھیں۔ کمرے میں پڑی ہر شے ایک تو اتر کے ساتھ اپنی جگہ پر موجود تھی۔ سامنے موجود بڑی ونڈو میں سے لان کا سرسبز منظر تھوڑا تھوڑا جھلک رہا تھا۔ اس ونڈو کے ساتھ اس کا ویل آرگنائزڈ اسٹڈی ٹیبل موجود تھا۔ اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ دیوار میں موجود الماری میں اس کی نصابی، غیر نصابی اردو اور انگریزی کی کتابیں ایک ترتیب کے ساتھ بڑھی ہوئی تھیں۔ کتابوں کی کولیکشن

رداؤ ایجنٹ [39] اکتوبر 2016ء

بتاتی تھی کہ اس کمرے کا رہائشی لٹریچر کا کافی حد تک دلدادہ ہے۔ سامنے والی دیوار کے ایک کونے میں اس کا میوزک سسٹم اور آڈیو ویڈیو کیٹس کی ایک لامحدود تعداد موجود تھی۔ کمرے کی باقی دیواروں پر اس نے اپنے ایڈ ونچر ٹریس کے فوٹوز چسپاں کر رکھے تھے۔ کمرے کے تیسرے کونے میں پڑے اسٹینڈ پر اس نے اپنی ہاکی اور رائٹس کو بڑی ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ اسٹینڈ کے ساتھ پڑا باکس مینٹے ترین فٹ بالز سے بھرا ہوا تھا۔ وہ فٹ بال کلب کا کیپٹن تھا اور باقی تمام کھیلوں میں بھی اسے خاصی مہارت حاصل تھی۔ اسی اسٹینڈ کے اوپر والے حصے میں مختلف سپر ز سے جیتی گئی اس کی ٹرافیوز اور شیلڈز موجود تھیں۔ اگلے کونے میں اس کے جگمگی دوست سعد کی طرف سے دیا گیا۔ الیکٹریک گٹار پڑا تھا جسے وہ یونہی کبھی کبھار دل بہلانے کی غرض سے استعمال کیا کرتا تھا۔ کمرے کے کسی بھی حصے میں ڈسٹ کا موجود نہ ہونا اس نوجوان کی نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ سوائے سائڈ ٹیبل پر بکھری ہوئی چیزوں اور بیڈ پر پڑے لیب ٹاپ موبائل فون اور چند ایک کپنیوں، سم کارڈز کے سائڈ ٹیبل کے پاس الٹش ٹرے پڑی تھی اور اس کمرے کے ارد گرد بکھری سگریٹ کی راکھ اور سنگاپور سے منگوائے گئے سگار بے ترتیب پڑے تھے۔ کانی دیر یونہی بے قراری کے عالم میں کروٹیں بدلنے کے بعد بالآخر اس کمرے کے لیکن نے اسٹینڈ کا فیصلہ کیا۔ سامنے والی گھڑی نے دس بجے کا الارم بجایا تو وہ کسمکاتا آنکھیں ملتا ٹھٹھا کھڑا ہوا۔ آنکھوں میں اترتی سرخی اس بات کی چشم دید گواہ تھی کہ وہ لیٹ نائٹ سونے کا عادی ہے۔ ہم مدہوشی کے عالم میں لڑکھڑاتا ہوا فریٹس ہونے کی غرض سے وہ اٹیچڈ واٹس روم کی جانب بڑھا ہی تھا کہ یک دم بیدار پڑے ساکت موبائل نے کسی نازک حسینہ کی مانند چلتے ہوئے اس کے بڑھتے قدم جلد کر دیے۔ وہ جی بھر کے بد مزہ ہوا۔ واپس پلٹنا اور اس نے جھک کر اپنی دھن میں تھرکتا موبائل فون اٹھایا۔ اسکرین پر کوئی نمبر چل بچھ رہا تھا۔

”جانے کون جاہل لوگ ہیں جو علی ایچ فون کرنا شروع کر دیتے ہیں۔“ اس نے کڑھتے ہوئے سوچا اور بس کا بٹن دبا کر موبائل کان سے لگا لیا۔

”ہیلو گلہان! فوراً جناح کلب پہنچ۔“ فون میں سے ابھرنے والی آواز وسیم کی تھی یا پھر اقبال کی وہ غنودگی کے عالم میں پہچاننے سے قاصر رہا۔

”کیوں کیا آنت آگئی ہے؟“ اس نے مزید کڑھتے ہوئے چلا کر جواب دیا۔

”یار! اپنے کلب کی اسٹور کمرے کے ساتھ لڑائی ہو گئی ہے تو فوراً نکل۔“

نیند کی دیوی پل بھر میں اڑن چھو ہوئی تھی کون سی لڑائی کون سا کلب اس نے وجہ جانے بغیر فون بند کیا۔ اس وقت وہ شارٹ اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ جوتے پیروں میں اڑ سے اور دو چھینٹے منہ پر مار کر اپنی مخصوص ہاکی اٹھائی، جسے وہ اکثر اسے حالات میں استعمال کیا کرتا تھا اور باہر کی جانب چل دیا۔

”دیکھو گلہان! آج میرے پوٹیکل کیریئر کا ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ آج کے دن میں تمہاری کوئی بد تمیزی برداشت نہیں کروں گا۔“ سکندر درانی جو ابھی نئے نئے چیئر مین سلیکٹ ہوئے تھے، اسے ہاتھوں میں ہاکی تھامے باہر نکلتا دیکھ کر زور سے چلائے اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ذات میں مگن ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بائیک زن سے لے اڑا۔

☆.....☆

اگست کی تہتی منہ بہر پولیس اسٹیشن کے باہر اس وقت کھلائی گئی تھی ہر طرف انفرانٹری اور بھاگ دوڑ کا عالم تھا۔ 19،20 سال کے وہ کوئی بارہ تیرہ لڑکے تھے جنہیں اس وقت شی ٹھانہ کے دم گھٹتے حالات میں بند کیا

گیا تھا۔ گلہان سکندر درانی ان سب سے الگ تھلگ ایس ایچ او کے کمرے میں سر جھکائے کھڑا تھا اور سکندر درانی اسے غضب ناک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ کمرے کا واحد چنگھا آہستہ رفتار میں برائے نام چل رہا تھا۔ سخت پسینے میں شرابوراس کی اسپورٹ شرٹ پر جگہ جگہ خون اور مٹی کے داغ لگے ہوئے تھے۔ شدید ہاتھ پائی کے نتیجے میں لگ جانے والی خراشیں اس کے چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں پر واضح تھیں۔ اس کے بے ترتیب بالوں میں مٹی انکی ہوئی تھی، جب کہ خاصی زوردار ضرب لگنے کے باعث ناک سے خون اب تک بہ رہا تھا۔ جسے وہ ہاتھ میں پکڑے سفید رومال سے وقفے وقفے سے صاف کر رہا تھا۔ اس کی سرد مہر آنکھوں میں اب بھی بے چینی اور اضطراب کے سائے دوڑ رہے تھے۔ ملتان کے جانے مانے مشہور اسنوکر کلب اور جناح کلب کے درمیان کئی دنوں سے چلنے والی ہلکی پھلکی جھڑپ آج باقاعدہ ہاتھ پائی تک آ پہنچی تھی۔ گلہان سکندر درانی اور اس کی ٹیم نے مل کر نہ صرف اسنوکر کلب کے ممبران کو زخمی کیا تھا بلکہ بلڈنگ میں گھس کر خاصی توڑ پھوڑ بھی کی تھی۔ جو اب اسنوکر کلب کے صدر نے جناح کلب کے تمام ممبران اور خصوصاً کیپٹن گلہان سکندر درانی کے خلاف رپورٹ درج کروادی۔ پولیس کی ناقص کارروائی کے باوجود بھی اگلے 30 منٹ میں سبھی لڑکے پولیس کنبھڑی میں تھے مگر ایس ایچ او صاحب کے سکندر درانی سے پرسنل تعلقات کی بدولت گلہان کو ایک بار پھر آسانی سے رعایت دی جا چکی تھی۔

”درانی صاحب! سمجھائیے اس کو اس عمر میں غصہ مانتے ہر سجا کر گھومنا زیب نہیں دیتا۔ خیر سے آپ کا ایک نام ہے پورے شہر کے لوگ آپ کی عزت کرتے ہیں یہ نہ ہو گلہان کی ان حرکتوں کی وجہ سے کل کو لوگ آپ پر انگلی اٹھاتے پھریں۔“ ایس ایچ او صاحب نے حقیقت بتلاتے ہوئے انہیں مشورے سے نوازا۔

”جی میں کوشش کروں گا آئندہ اس کی وجہ سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہو۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولے تھے۔

”میں امید کروں گا آئندہ تم ایسی کوئی حرکت پھر سے نہیں دہراؤ گے۔“ ایس ایچ او نے گلہان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک پرامید سا تاثر دیا اور ہاتھ میں پکڑی فائل درانی صاحب کے سامنے رکھ دی۔

”آپ یہاں ساکن کر دیں۔“ اس نے مزید کہا۔

”اگر اجازت ہو تو اب ہم جاسکتے ہیں؟“ تمام فارمیٹی پوری کرنے کے بعد درانی صاحب نے فائل ٹیبل پر رکھتے ہوئے اجازت طلب کی۔

ایس ایچ او صاحب مصافحہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”چلو گلہان! وہ سختی سے بولے۔“

”بابا! آپ یقین کریں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔“ اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

”حکومت، مجھے اس ٹاپک پر مزید کوئی بات نہیں کرنی۔“ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ اسے شوٹ کر دیتے،

جس کی وجہ سے آئے روز انہیں لوگوں کے سامنے تماشایا پڑتا تھا۔

☆.....☆

ستمبر کی خوشگوار صبح۔

”ملتان بورڈ میں پہلی پوزیشن واویلا تم نے کمال کر دیا۔“ وسیم نے خوشدلی سے تقریباً چیختے ہوئے کہا تھا۔

”بڑے عمدے سے تم نکلے یا تم۔“ شہریار بھلا کب بچھے رہنے والا تھا۔

”پڑھ پڑھ کر ہم ٹیپ جاتے ہیں اور آخر پر پوزیشن تم لے اڑتے ہوئے“ ارسل خواں گروپ کا سب سے

مختی اسٹوڈنٹ تھا اپنے ریماڈکس دینے لگا۔

”پار! تمہیں پڑھتے تو کبھی دیکھا نہیں پھر یہ پوزیشن۔“ علی کچھ کچھ متحس ہوا۔

”خیر بہت مبارک ہو۔ اب ٹریٹ تیار رکھو۔“ آجا کر بات پھر ٹریٹ والے نقطے پر آرکی تھی۔ سب لڑکے اس وقت درانی ہاؤس کے ویل فرنش ڈرائنگ روم میں جمع اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ جب کہ وہ بنا کوئی تاثر دیئے کم صم بیٹھا موبائل پر کوئی میسج کرنے میں مگن تھا۔ وہ پڑھائی میں سیریس نہیں تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا وہ ٹاپ کرے گا اس بات کا اندازہ اس کے فرشتوں کو بھی نہ تھا۔ وہ ٹاپ کر چکا ہے۔ اس بات سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنے دوستوں سے مبارک باد وصول کر رہا تھا۔ یہ بات بھی اس کے لیے کوئی غیر معمولی نہ تھی۔ ہر فنٹ بال ٹورنامنٹ کے بعد وہ سب ایسے ہی اس کے ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہوتے تھے اور وہ ایسے ہی ان سب سے مبارک باد وصول کیا کرتا تھا۔ پراسکول لیول سے نکل کر یکدم بورڈ لیول پر چھا جانا یہ اس کے لیے نیا تجربہ ضرور تھا۔ جو اس کے باقی تمام دوستوں کو حیرت اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کچھ ایسا ہی بے یقینی کا عالم اس کے ماں باپ کا تھا وہ سگریٹ پیتا تھا۔ اس پر انہیں اعتراض تھا۔ وہ ڈرائنگ روم لیتا تھا، وہ اس بات سے انجان تھے۔ وہ کبھی کبھار محض ٹیسٹ بدلنے کی غرض سے ڈرگز بھی چکے لیا کرتا تھا۔ یہ بات بھی ان کے علم میں نہ تھی۔ وہ آئے دن اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے انہیں پریشان کرنا تھا۔ وہ فکرمند تھے وہ مین بار پولیس کسٹڈی میں جا چکا تھا۔ انہیں اپنی تربیت پر شرمندگی ہوتی تھی۔ وہ ہر مہینے گرل فرینڈ بدلتا تھا یہ بات بھی تشویش زدہ تھی مگر آج وہ پوری طرح سے نہال تھے گلہان سکندر درانی پری انجینئرنگ میں کامیابی نے مسٹر اینڈ مسز درانی کے دل میں پنے والے سبھی خدشات مٹا دیئے تھے۔ آج پہلی بار انہیں اپنے بیٹے پر فخر محسوس ہوا تھا۔ آج پہلی بار ان کی نگاہوں میں گلہان سکندر درانی کے لیے ستائش ابھری تھی۔

☆.....☆

”ہائے سویٹ ہارٹ! تم نے تو کمال کر دیا اب کبل رہے ہو؟“ یہ میسج اس کی سولہویں گرل فرینڈ کی طرف سے آیا تھا۔ صبح سے اب تک وہ اس کے کئی میسج ریسیو کر چکا تھا۔ میسج پڑھ کر ڈیلیٹ کرنے کے بعد اس نے اپنا موبائل فون پینٹ کی جیب میں اڑھا اور گھر میں آئے تمام مہانوں سے معذرت کرتے ہوئے بیٹرو دیکھنے چلا گیا۔ جہاں اس کی ڈریم گرل بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بیٹرو کا اس قدر شوقین تھی نہیں رہا تھا مگر پچھلے تین مہینوں سے ایک نوجوان اداکارہ ماہا ملک کے سحر میں جکڑا مسلسل چلا آ رہا تھا۔ وہ جتنے ناز خرے دکھلائی تھی گلہان درانی کے دل میں اس کی طلب اتنی ہی بڑھتی تھی۔ اب تک ان دونوں میں خاصی علیک سلیک ہو چکی تھی۔ وہ اسے کئی بار ہائی کوالٹی کے برانڈ ڈرپرفورمز اور دوسرے شائف گفٹس کر چکا تھا۔

وہ حاضرین کا ایک بڑا مجمع تھا جو بڑی بے تابی سے شو شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ سوائے ایک دو سیٹ کے باقی کی سبھی سیٹس فل ہو چکی تھیں اچانک ہال تاریکی میں ڈوب گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ پرفارمنس شروع ہونے والی ہے۔ ہر ایک پر سحر طاری کرنی مدھم روشنی میں پردے کی آڑ سے شیٹون کی بلیک ساڑھی میں لپٹا، گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح مہکتا ایک قاتلانہ حسن دعوت عام دیتا ہوا نمودار ہوا اور اپنی دل فریب اداؤں کے وار سے اسٹیج پر جو ہر دکھلاتا حاضرین محفل کے ساکت ہوتے دلوں پر غلبہ پانے لگا۔ اس حسن مجسم کے سامنے آنے کی دیر بھی کہ گلہان کو اپنا سانس تقریباً رکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ آج طے کر کے آیا تھا کہ قدرت کے اس حسین شاہکار کو جان دل سنا کر ہی لو لے گا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد شوختم ہوا تو ہاں تالیوں کے شور سے کونج اٹھا۔ ہاں میں موجود وہ جان مچھل دوسرے مردوں سے تحسین وصول کرتی آنکھوں سے تیر چلاتی خود چل کر اس کے پاس آئی اور ایک تراڑا سا کاغذ اس کے ہاتھ میں تھما کر بونہی اٹھلاتے ہوئے آگے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ حواس باختہ دم بخود سا اس جانب دیکھتا رہا جس جانب وہ گئی تھی اور تب تک دیکھتا ہی رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ پیپر پر ماہا ملک کا فون نمبر لکھا تھا۔ گھر آتے ہی جو پہلا کام اس نے کیا تھا وہ تھا ماہا کو کال کرنے کا۔ نیل جا رہی تھی اور مسلسل جا رہی تھی اس کے دل کی دھڑکنیں بے اختیار منتشر ہوتی چلی گئیں۔

”بڑی ویر کی مہربان آتے آتے۔“ چوٹی گھنٹی پر فون اٹھایا گیا۔ اسپیکر میں سے اس کی سریلی آواز ابھری تھی۔ منتشر ہوئی بے ترتیب دھڑکنوں کی روانی میں ایک بل کے لیے ٹھہراؤ آیا تھا۔

صنف نازک کو محض وقت گزاری سمجھنے والا گلہان سکندر درانی زندگی میں پہلی بار صنف نازک کے سامنے بے بس ہوا تھا۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا۔ جیسے اس کے سارے الفاظ کہیں کھوسے گئے ہوں۔ پہلی بار اس کے شاربپ مانند نے کام کرنا بند کیا تھا۔

”سبارک ہو بھئی سنا ہے تم نے بورڈ میں ٹاپ کیا ہے۔“ مسکراتی ہوئی آواز میں کہا گیا۔

چوری چھپے دل میں پروان چڑھنے والی محبت کی بیٹکیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر عام پروان چڑھنے لگیں تو تھیں نہیں ہونے والی ملاقاتیں شاپنگ مالز اور ریٹورنس تک آسپین۔ گلہان سکندر درانی کی لسٹ میں موجود سولہ گرل فرینڈز کی جگہ اب ایک ماہانے لے لی تھی۔ دل دھڑکتا تھا، سانسیں چلتی تھیں پر نام صرف ماہا ملک کا ہوتا تھا۔ محبت اس کی ذات پر کچھ اس انداز سے اثر انداز ہوئی تھی کہ ساری دل لگی ساری چاہت محض ایک شخص کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کہتے ہیں ناہر عمل کامنفاقت عمل ضرور ہوتا ہے اس کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

پہلے وہ صنف نازک کو کھلونا سمجھا کرتا تھا مگر اب وہ خود لا شعوری طور پر صنف نازک کے ہاتھوں کھلونا بن رہا تھا استعمال ہو رہا تھا۔ مہنگے ترین کفٹنس آئے دن شاپنگ کوئی بھی خواہش ایسی نہ گئی جو ماہا ملک نے کی ہو اور گلہان درانی نے اسے پورا نہ کیا ہو۔

☆.....☆

”ماہی! میں اپنی زندگی میں کبھی کسی کے لیے مخلص نہیں رہا، کبھی کسی کو دل کے اتنا قریب نہیں آنے دیا مگر تم واحد ہو جو میرے جینے کی وجہ بن چکی ہو۔ پلیز ماہی مجھے توڑ مت دینا مجھے ٹوٹنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ اس وقت وہ دونوں ماہا کے فیورٹ ریٹورنٹ میں بیٹھے ڈنر کر رہے تھے۔ جلتی بھجتی روشنی میں ڈی جے کی جانب سے پلے کی جانے والی رومانٹک دھن محبت کرنے والے دلوں کو مزید دھڑکار رہی تھی۔ ماہا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر وہ پل بھر میں جذباتی ہوا تھا۔

”چل لنگے اپنے پیار کی ڈور اتنی نازک تھوڑی ہے جو آسانی سے ٹوٹ جائے یقین نہیں ہے کیا مجھ پر؟“ اک ادائے بے نیازی سے اس نے اپنا آپ چھڑایا تھا۔

”تم ہی تو ہو جس پر یقین ہے مجھے۔“ وہ جنوں کی شدتوں کو اپنے لہجے میں سمجھ کر بولا۔

”تو پھر بے فکر رہ۔“ وہ قاتلانہ انداز میں مسکرائی۔

”میں اسلام آباد جا رہا ہوں اسٹڈی کے لیے پاپائے ادھر یونیورسٹی میں میرا ایڈمیشن کروا دیا ہے۔ اب انشاء اللہ انجینئر بن کر لوٹوں گا تم میرا انتظار کرو گی نا؟“ اس نے امید کے موتی لہجے میں سمو کر پوچھا۔

”لو بھئی یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھلا پوچھنے والی میں انتظار نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا۔“

”تم میری سپورٹ ہو۔“ وہ مزید جذباتی ہوا۔

”میں ہمیشہ تمہاری سپورٹر رہوں گی۔“ اس نے تسلی دی۔

”بس مجھے انجینئر بن کر آ لینے دو پھر تمہیں مزید تھیسز پر فارم نہیں کرنا پڑے گا۔“

”میں تھیسز نہیں چھوڑ سکتی ایکٹنگ میرا جنون ہے ایسا خیال غلطی سے بھی دل میں مت لانا۔“ ناگواری کے کچھ

بل اس کے ماتھے پر ابھرے۔

”مگر بابا بابا۔“

”اگر مگر کچھ نہیں ٹائم کافی ہو گیا ہے، میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے اللہ حافظ۔“ وہ تنک کر اٹھ کھڑی ہوئی

یہ پہلی دراز تھی جو اسلام آباد روانگی سے قبل ان دونوں کے رشتے میں آئی تھی۔

وہ مجھے ہوئے دل کے ساتھ یونیورسٹی چلا گیا۔ بڑی مشکل سے دو ہفتے کی مسلسل ناراضی کے بعد وہ بابا کو

راضی کر پایا تھا۔

☆.....☆

”بابا! یہ کیا شکر ہے پچھلے تین دنوں سے میں تمہیں لگانا کالز اور میسجز کر رہا ہوں اور تمہارے پاس اتنا وقت

نہیں ہے کہ میرے کسی ایک میسج کا جواب ہی دے دو، جانتی ہو کتنی فکر ہو رہی تھی مجھے تمہاری۔“ کال پک ہوتے

ہی وہ پاٹلوں کی طرح بولنے لگا تھا۔

”سنو! اب تم میری فکر کرنا چھوڑ دو، کیونکہ میرے پاس تمہارے لیے وقت نہیں ہے۔ مجھے ایک ڈائریکٹرنے

پر پوز کیا ہے ساتھ ہی دن پر کام کرنے کی آفر بھی دی ہے۔ تم تو جانتے ہونا میری محبت میرا شوق میرا جنون صرف

اور صرف ایکٹنگ ہے مجھے معاف کر دینا پر میں کسی ایک شخص کے لیے اپنی خواہش سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ اگلے

ہفتے میرا نکاح ہے اور ہاں سنو آج کے بعد میرے پیچھے آنے مجھ سے ملنے یا کال کرنے کی زحمت مت کرنا ورنہ

میں اپنی جان دے دوں گی سمجھے تم۔“ اس نے ایک بار پھر بے نیازی دکھائی تھی۔

”واٹ وی ہیل! تم اپنے حواسوں میں تو ہو یہ کیا کہہ رہی ہو میں تمہارا گلہ من ہوں وہ جس کے ساتھ تم نے

زندگی گزارنے کے وعدے کیے تھے تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔ تم مذاق کر رہی ہونا۔“ وہ پل بھر میں حواس باختہ ہوا تھا۔

”نہیں گلہ من سکندر! میں بالکل بھی مذاق نہیں کر رہی۔“ لہجے میں سکون اور ٹھہراؤ ہنوز قائم تھا۔

”اور رہی بات وعدوں کی تو مجھ سے کہیں زیادہ وعدے تم اپنی سولہ گرل فرینڈز سے بھی کر چکے ہو، جب تم سے

کوئی وعدہ نبھایا نہیں جاسکا تو پھر مجھ سے دست سوال کیوں؟“ اس نے اسے زچ کرنا چاہا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں، بے پناہ محبت۔“ وہ زچ ہوا۔

وہ مسکرائی۔ ”ہزاروں بار ایسی محبتیں دیکھی ہیں مجھے ایک شاندار کیریئر سے محبت ہے جو تم مجھے کبھی نہیں دے

سکتے۔ میرا خیال ہے تمہیں اپنا اور میرا مزید وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ حافظ۔“

”بابا.....!“ وہ جس قوت سے چلایا تھا اتنی قوت سے اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل دیوار پر دے مارا۔ فون کی

اسکرین چمکنے لگی اور گرد بکھر گئی بالکل اس کے دل کی طرح۔ اگلی صبح فائل کا پہلا پیج نکلا مگر وہ سب کچھ بھول

بھال کر ماہا کے سامنے کھڑا اپنی محبت کی بھینک مانگ رہا تھا۔
 ”ماہی! تم نہیں جانتیں ایسے لوگوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے یہ لوگ لڑکیوں کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرتے ہیں اور بس۔“

”میں کیا جانتی ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے یہ سب تمہیں مجھے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تم جاؤ یہاں سے۔“

”جب تک تم میری بات نہیں سنو گی میں یہاں سے کہیں نہیں جانے والا۔“

”ٹھیک ہے مت جاؤ۔“ وہ چاقو نکال کر اپنی کلائی تک لے آئی۔

”ماہا! مجھے ٹوٹنے سے ڈر لگتا ہے۔“ وہ پوری قوت سے چلایا تھا۔

”گلمان سکندر! یہ میرا مسئلہ نہیں ہے، لڑکیوں کا دل توڑتے ہوئے تو کبھی ڈر نہیں لگا۔ اب ذرا ٹوٹ جانے کا ذائقہ خود بھی چکھ کر دیکھ لو۔“

”نانا! مجھے اس کٹھورا امتحان میں مت ڈالو۔“ وہ گٹھنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

”مجھے نفرت ہے تمہارے بدکار چہرے سے۔“ اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

”بدکار! نہیں ماہی میں بدکار نہیں ہوں میں نے تو محبت کی ہے بے پناہ محبت۔“ وہ سسکا۔

”مگر میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ بے پناہ نفرت۔ آج کے بعد میرے پاس بھی بھینکے تو میں اپنی جان دے دوں گی۔“ وہ چاقو اپنی کلائی پر رکھتے ہوئے یہ جانی انداز میں چلائی۔ تو سامنے کھڑے نوجوان کے ہشاش بشاش چہرے کی سرخی یکدم زردی میں بدل گئی۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔“ وہ مزید چلائی۔

کسی نوکیلے چاقو کے وار تھے جو ایک کے بعد ایک سیدھا اس کے دل میں اتر رہے تھے۔ وہ 19 سالہ خوب رو

نوجوان نڈھال سا زمین پر ڈھے سا گیا۔

”سنا نہیں تم نے میں نے کیا کہا۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“ چاقو کی نوک دو دو جھباناڑک کلائی میں دھنسی

تھی۔ ایک ہلکی سی سسکی نے گہرے سناٹے میں ارتعاش پیدا کیا۔ وہ جو سر جھکائے زمین پر بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔

ناڑک حسینہ کی سسکی سنتے ہی تڑپ اٹھا۔ اگلے دو سے تین منٹ خود کو سنبھالتے اور اپنے حواس واپس لانے میں

لگے تھے۔

”میں نہیں جانتا میرا قصور کیا ہے۔ رہو سکتے تو مجھے معاف کر دینا، میں ابھی چلا جاتا ہوں دور بہت دور کہیں

ویرانے میں بس تم خوش رہنا۔“ اس کی چمکتی سیاہ آنکھوں کا رخا ایک لمحے میں بجھ گیا تھا۔ وہ آنسو بہاتا پلٹا تھا اور

اسے یوں تڑپتا دیکھ کر ایک بے رحم سی مسکان ظالم حسینہ کے دل نشین چہرے پر ابھری تھی۔ اس کی قاتلانہ نگاہوں

نے دور تک روتے تڑپتے اندھا دھن بھاگتے اس دیوانے شخص کا پیچھا کیا اور ہاتھ میں پکڑے چاقو کو فولڈ کر کے

بیک میں رکھ لیا، اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ آئے روز ایسے ہزاروں نا سمجھ روتے سسکتے محبت کا ماتم

کرتے یہاں سے واپس جایا کرتے تھے۔ آج کی اداکاری یہیں پر اختتام پذیر ہوئی تھی۔

وہ نشتر لگاتے ماضی سے نکل کر درد سے تھکے حال میں لوٹا تو کانوں میں وہی آواز پھر سے گونجنے لگی۔ وہ کانوں پر

ہاتھ رکھے زمین پر آ بیٹھا اس کا اگلا ہدف سگریٹ کا اشاک تھا۔ جسے وہ محض سکون پانے کے لیے جلد از جلد ختم

کر دینا چاہتا تھا۔



وہ زر قادرانی کا واحد سہارا تھی۔ اس کی پیدائش کے بعد زر قانیگم اور ان کے شوہر حیدر خان کے مابین چلنے والی نا اتفاقی بالآخر علیحدگی تک آ پہنچی۔ حیدر خان بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک بہت سوہرا انسان تھے۔ علیحدگی کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے واشنگٹن میں کسی پارسانی خاتون سے شادی کر لی اور بعد میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ وہیں سٹبل ہو گئے۔ انہوں نے کبھی واپس آنے یا ان سے رابطہ رکھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ جب کہ زر قادرانی معزز اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی باصلاحیت اور باشعور خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ کالج ٹیچر کے طور پر اپنی خدمات سر انجام دے رہی تھیں۔ ان کی اپنی سوشل ایکٹیویٹیز تھیں۔ مکمل طور پر خود مختار تھیں اس لیے سروس کی تعلیم و تربیت میں انہیں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ زر قادرانی کے تینوں بھائی اپنا اپنا بزنس سنبھالے ہوئے تھے۔ سب اپنی اپنی لائف میں ویل سٹبل تھے۔ اگر کوئی مطمئن نہیں تھا تو وہ بھی زر قانیگم کی بڑی بہن سیمہ بیگم جنہوں نے اپنی مرضی سے ایک مڈل کلاس فیملی میں شادی کی تھی۔ جب سیمہ بیگم کا اسلام آباد آنا ہوا اور آتے ہی انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے ارسل کے ساتھ سروس کی نسبت طے کر دی۔ وقت پر سوار سنبھلے گھوڑوں نے تیزی سے اڑان بھری تو وہ بچپن کی دیواریں پھلانگ کر جوانی کی حدود میں داخل ہو گئے۔ پری انجینئرنگ میں نمایاں کارکردگی دکھانے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ لاہور یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا اور اسی سال سروس نے پیٹرولیم انجینئرنگ میں ارسل نے الیکٹریکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ڈگری ملتے ہی ارسل نے جاب اسٹارٹ کر دی۔ سروس کافی الحال جاب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سو وہ کئی سالوں پہلے شروع کی جانے والی اپنی ادھوری کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے لگی۔

ہر فکر سے بے نیاز ہمہ وقت ہشاش بشاش رہنے والی زر قادرانی جانے کون سے غم دل میں چھپائے CMH کے کمرے میں ٹھہراں پڑی تھیں۔ ان کے ارد گرد ڈاکٹرز کی ایک بڑی ٹیم جمع تھی۔ کافی دیر تک وہ انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لے مختلف ٹیسٹ کروانی رہی۔ رپورٹ آنے پر جو خبر اسے ملی وہ اس کی جان نکال دینے کے لیے کافی تھی۔ زر قانیگم کو برین ٹیور تھا۔ کتنے ہی پل وہ بے یقینی کے عالم میں ہاتھ میں پکڑی رپورٹس کو اور اسٹرکچر پر پڑی ماں کو بار بار دیکھتی رہی۔ ڈاکٹرز نے نیوروسرجری کرنے کا فیصلہ کیا۔



”مس سروس! بہت کزنیکل کیس ہے ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں آپ اللہ سے دعا کریں۔“ ڈاکٹر ضیاء اسے تسلی دے کر واپس چلے گئے اور وہ آپریشن تھیٹر کے سامنے کورڈور میں بیٹھی منہ ہی منہ میں ورد پڑھنے لگی۔ آٹھ گھنٹے مزید سر کے آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ ایک ڈاکٹر یاہر آیا۔ پھر اس نے وارڈ یو آئے کو اسٹرکچر لاتے دیکھا۔ اسٹرکچر پر پڑا وجود ساکن تھا۔ سروس کی سانس تھم چکی تھی ورد کرتے ہونٹوں پر نقل پڑ چکا تھا۔ آنکھیں ساکن تھیں اور اس کے لیے دنیا کی ہر شے ساکن ہو چکی تھی۔ وہ بے جان ہوتے قدموں کے ساتھ بمشکل خود کو کھینچتی ہوئی آپریشن تھیٹر کے دروازے تک پہنچی۔

”آئی ایم سوری! ہم نے بہت کوشش کی پر اللہ کو شاید یہی منظور تھا۔“ ڈاکٹر ضیاء اس کی سماعتوں پر ہتھوڑے مارتے آگے بڑھ گئے اور وہ سکے کی سی کیفیت میں آنکھیں پھاڑے کھڑی رہی۔ ایک قیامت دوون پہلے گزر چکی تھی۔ ایک قیامت اب آئی تھی۔ زر قانیگم کا بے جان وجود اس کی نگاہوں کے سامنے آپریشن تھیٹر سے نکالا جا رہا تھا اور اس میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی۔ اسٹرکچر کچھ بے لگہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ وارڈ یو آئے اس

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

www.paksociety.com

کی ناک کو ذور بہت دور لے جا رہے تھے کبھی نہ واپس لانے کے لیے۔ وہ انہیں روکنا چاہتی تھی، پر زبان کنگ
 تھی۔ آنکھیں اشک بہانا بھول چکی تھیں۔ ایک دنیا پہلے لٹی تھی۔ ایک دنیا آج لٹ چکی تھی۔ جینے کی کوئی
 ڈھارس بچی تھی نہ کوئی شفقت بھری نگاہ ملتی تھی۔

اگلا پورا ہفتہ وہ میڈیسن کے زیر اثر رہی۔ ایک ہفتے کے بعد اس کی حالت قدرے سنبھلی، ایک ہفتے کے بعد
 دماغ اس تلخ حقیقت کو ماننے کے لیے راضی ہوا تھا۔

”نقصان چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو صبر آ ہی جاتا ہے۔ خاص طور پر تب جب آپ یہ جان لیں کہ آپ
 اپنے ہمدرد اپنے مسیحا خود ہی ہیں۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کے آنسو پونچھنے اب کوئی نہیں آنے
 والا۔“ اگلا پورا مہینہ وہ چھوٹے ماموں کے گھر بوجھ بنی پڑی رہی۔ سب کی اپنی سرگرمیاں تھیں سب کا اپنا بزنس
 سرکل تھا اس کی اہمیت کہاں تھی اس کے درد کی پروا کسے تھی۔

”وہ بھی عجیب ہے کبھی دکھائی نہیں دیتا مگر پھر بھی سب کچھ دکھا دیتا ہے۔ رشتوں کے بدلتے رنگ، اپنیوں کی
 بے اعتنائی سب کچھ۔“ وہ بددل ہو کر واپس اپنے فلیٹ چلی آئی، اسے کسی نے روکا تھا نہ روکنے کی کوشش کی تھی۔

NGOs کی ذمہ داری اس نے ماما کی سیکریٹری کو دے دی اور دن میں ایک دو بار خود بھی چکر لگا آتی تھی۔
 دوسروں کی محرومیاں دیکھ کر ہمیں اپنی نعمتوں کی قدر ہوتی ہے۔ پھر اندازہ ہوتا ہے اس کی بے بہار ستوں کا
 پھر شکر ادا کرنے کے لیے سر خود بخود سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ این جی اوز سے واپسی پر اس کی کیفیت بھی یہی ہوا
 کرتی تھی۔



زندگی کے بل مزید سر کے وہ کچھ نارمل ہوئی تو اس نے ہائیر اسٹڈی کا ارادہ کیا۔ وہ پیٹرولیم انجینئرنگ میں
 بی ایم ایس کرنا چاہتی تھی مگر اس کے لیے اسے پھر سے لاہور جانا پڑتا اور اب وہ اسلام آباد چھوڑنا نہیں چاہتی
 تھی۔ وہ اپنے گھر سے دور رہنا نہیں چاہتی تھی سو اس نے ایم ایس کو خیر ایا کہہ کر ایم بی اے میں ایڈمیشن لے لیا۔
 نی الحال خود کو مصروف رکھنے کا یہی ایک طریقہ اسے پسند آیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں چار دن سے جاری میوزیکل
 کنسرٹ کی ایک حسین رات تھی۔

مین اسٹریٹس سے لے کر آڈیٹوریم تک کا پورا راستہ برقی قفلوں کی چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ ہر کوئی افراتفری
 کے عالم میں خوش گپیاں ہانکتا ادھر سے ادھر جا رہا تھا اور وہ اس شور شرابے سے کوسوں دور فٹ ہاتھ پر بیٹھی خالی
 ذہن کی سی کیفیت میں مین روڈ سے گزرتے لوگوں کی چہل قدمی کو تھکی تھکی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور
 ایسے ہی غائب دماغی کے عالم میں چلتی ہوئی سڑک کے کنارے لگے بورڈ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بورڈ پر
 کنگ اشاروی بینڈ کالوسٹر جگمگا رہا تھا۔ آج کی میوزیکل ٹائٹ میں یقینی طور پر اسی بینڈ نے پر فارم کرنا تھا۔ اس
 نے آنکھیں سکڑتے ہوئے ناگواری کے عالم میں پوسٹر پر بنی تصویر کو دیکھا۔ کندھوں تک لٹکتے سیاہ بال، ماتھے پر
 بندھا سرخ رومال اور بازوؤں میں رنگ برنگے بینڈز پہنے بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس ہاتھ میں گٹار تھا۔ وہ
 اکیسویں صدی کا مجنوں اسے جانے کیوں ہر معیار سے گرا ہوا محسوس ہوا۔

”نفرت ہے مجھے تم جیسے چہروں سے یہ بڑھے ہوئے بال، یہ رنگ برنگے بینڈ گھن آتی ہے مجھے تم جیسی
 شکلوں سے۔“ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہ جھکی اور پاس پڑا پتھر اٹھا کر پوری قوت سے سامنے موجود
 پوسٹر پر مارا۔ پاس سے گزرتے لوگ چونک کر اس کی جانب موجہ ہوئے تو وہ کندھے اچکا کر یوں کھڑی ہو

گئی جیسے اسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔

”یہ لیں اچھی طرح سے غصہ اتار لیں۔“ کسی نے پیچھے سے آکر کان میں سرگوشی کرتے ہوئے مزید ایک پتھر اس کی طرف بڑھایا۔

”تو ٹھیکس۔“ کسی بھی قسم کی شرمندگی کا تاثر لائے بغیر اٹھلا کر کہتے ہوئے وہ جانے کے لیے مڑی پھر جیسے وہ اگلا قدم اٹھانا بھول گئی۔ کندھے پر گنٹار لٹکانے چپوٹم کے غبارے پھلانا وہی سنگر سامنے کھڑا اپنی بے اختیار ہوتی ہنسی کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ہنسی سے صاف ظاہر تھا وہ بہت دنوں کے بعد کھل کر مسکرایا ہے۔

”Stupid۔“ وہ زیر لب بولی۔
 ”ایکسی کیوزمی، کیا کہا آپ نے۔“ مقابل کھڑے شخص کے ماتھے پر مصنوعی بل اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ اس کی سرگوشی سن لی گئی ہے۔
 ”کچھ نہیں۔“ وہ تنک کر بولی۔

”تو پھر آپ کبھی کی طرح بھنھنا کیوں رہی تھیں۔“ وہ مسکرایا۔

”میری مرضی۔“ اس نے وائٹ پیسے۔

”تو آپ نہیں بتائیں گی ابھی دو منٹ پہلے آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا۔“ شائستگی سے پوچھا گیا۔

”سنو لڑکے۔“ اس نے شہادت کی انگلی سامنے کھڑے شخص کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”آپ مجھے مسٹر گلماں کہہ کر مخاطب کر سکتی ہیں۔“ اسے ایک بار پھر تپایا گیا۔

”نہیں گلٹا ہے میں ہر ایرے غیرے راہ چلتے کو اتنی عزت سے مخاطب کروں گی۔“ وہ مزید بھڑکی۔

”کرنا تو چاہیے۔“ گلماں نے کندھے اچکائے۔

”ہو سامنے سے۔“ وہ ڈھٹائی براتر آئی۔

”جب تک آپ کلینر نہیں کریں گی آپ نے میرے بارے میں کیا ارشاد فرمایا تھا میں یہاں سے نہیں ہٹنے والا۔“ وہ ہارنے والوں میں کہاں تھا۔

”تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں نے تمہارے بارے میں کچھ کہا ہوگا۔“

”کیونکہ یہاں ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا موجود نہیں ہے جس سے آپ مخاطب ہو پائیں۔“

”میں نے نہیں اسحق کہا تھا جو کہ تم ہو۔ اب رستہ چھوڑو۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”نہ چھوڑوں تو؟“ اس نے شرارتی لہجے میں کہا۔

”تمہارے کنسرٹ کا وقت ہو رہا ہے۔“ وہ کھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرمی اختیار کر گئی۔

”آپ نہیں چلیں گی؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں اور اس سب کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔“ وہ حتی انداز میں بولی۔

”اوکے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”میں چلتا ہوں۔“ وہ قدم اٹھاتا ہوا بولا۔

”کچھ برا لگا ہوتا صاف کہہ دیجیے گا۔“ اس نے مڑے بغیر کہا۔

”نہیں مجھے کچھ برا نہیں لگا سوائے تمہارے اس علیے کے۔“ اس نے دوسری بار سرگوشی کی۔

”سنیں۔“ وہ چلتا چلتا رکا۔

”بولو“ کہیں یہ ماسٹر ریڈر تو نہیں اس نے دل میں سوچا۔
 ”کنسرٹ کی ٹائٹنگ یا کروانے کے لیے بے حد شکر یہ اللہ حافظ۔“ وہ چلا گیا۔
 ”اللہ ہی حافظ۔“ اس نے پھر سے سرگوشی کی۔

یونیورسٹی کا پہلا ہفتہ اور وہ بھی بے کار۔ سروس نے کڑھتے ہوئے سوچا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پارکنگ کی جانب چلنے لگی۔

☆.....☆

اگلے ہفتے اس کی پہلی کتاب ”وہبت آرزو میں رہے ہم“ منظر عام پر آئی اور دوسرے ہفتے اس کی ادبی قابلیت اور ذوق کو سہراتے ہوئے یونیورسٹی ڈپن آف آرٹس اینڈ جنرل سائنس نے اسے یونیورسٹی میگزین کا ایڈیٹر منتخب کر دیا۔ اس کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی تھی۔ وہ خوش تھی بے پناہ خوش اور ایک مدت کے بعد اسے یہ خوشی راہ آئی تھی۔

”سینے مس!“ وہ موبائل ہاتھ میں تھامے کوئی گیم کھیلنے میں مگن تھی۔ جب کسی جانی پہچانی آواز نے اس کی توجہ حاصل کی۔

”کیسے مسٹر۔“ وہ اسی کے انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔
 ”آپ کے سیشن میں کوئی سروس درانی نامی لڑکی ہے کیا؟“ پہلا سوال کیا گیا۔

”جی ہے۔“ اس نے حیران پریشان سی تصدیق کی۔

”اس وقت کہاں مل سکتی ہیں؟“ دوسرا سوال پوچھا گیا۔

”خیریت۔“ اس نے دوسری بار تصدیق کی۔

”جی مجھے ان سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔“

”کون سی بات؟“ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

”کہانا کچھ ضروری بات ہے میم جن سے کرنے آیا ہوں ان سے کروں گا۔“ وہ خود پر قابو پاتا ہوا شائستگی سے بولا۔

”اوکے کرو پھر روکا کسے جانے ہے۔“ مطلوبہ جواب نہ پا کر وہ خوا مخواہ بھڑکی۔

”آپ اپنا اور میرا وقت مزید برباد کرنے کے بجائے کامینڈ لی اتنا بتاویں مس سروس درانی اس وقت کہاں مل سکتی ہیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ آپ کا شکر گزار ہوں گا۔“ سامنے کھڑے شخص نے جھنسی عاجزی سے کہا تھا اس نے اس سے کہیں زیادہ تلخ لہجے میں جواب دیا۔

”تو آپ نہیں بتائیں گی؟“ اس نے آخری بار پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔“ وہ جی انداز میں بولی۔

”نو پرابلم میں خود ڈھونڈ لوں گا۔“ اس نے آگے کی جانب قدم بڑھائے۔

”ڈھونڈ لیں مل جائے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔“ اس کی آواز نے وورٹیک اس کا پیچھا کیا تو وہ چلتے چلتے رکا۔

”آپ کو لگتا ہے مس، سروس درانی سے ملنے کے بعد میں اپنے مصروف ترین وقت میں سے فضول ترین لمحات نکال کر اسے بھیجی آپ کے پاس آؤں گا اور وہ بھی یہ بتائے کہ اسے لیے کہ میری ان سے ملاقات ہو چکی ہے۔“

وہ ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے آہستگی سے بولا تھا۔
 ”آپ آئیں گے میں گارنٹی دیتی ہوں آپ واپس میرے پاس ضرور آئیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے واپس
 اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اسے اس کھوئے کھوئے سے آدی کو تنگ کرنے میں مزہ آنے لگا تھا۔

☆.....☆

”ایکسکوز می میم!“ وہی آواز ایک بار پھر ابھری تھی۔

”کتنے ایکسکوز کریں گے۔“ وہ جھکی۔

”آپ کو مجھ سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔“ وہ مزید سنجیدہ ہوا۔

”میں نے ایسا کب کیا۔“ وہ سرے سے انجان تھی۔

”ابھی پانچ منٹ پہلے۔“

”پانچ منٹ پہلے تو میں نوٹس بنا رہی تھی۔“

”میرا مطلب ہے دس منٹ پہلے۔“ وہ بوکھلایا۔

”دس منٹ پہلے میں نوٹس سرچ کرنے لائبریری گئی ہوئی تھی۔“ اس کا سکون ہنوز برقرار تھا۔

”ٹھیک پندرہ منٹ پہلے آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔“ وہ ریست داچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”کون سا جھوٹ؟“ وہ ایکٹنگ میں یقیناً فرسٹ برائز لے سکتی تھی۔

”یہی کہ آپ سروس درانی نہیں ہیں۔“

”میں نے ایسا کب کہا۔“ وہ بولی۔

”جب میں نے سروس درانی کے بارے میں آپ سے پوچھا تب۔“ اس نے فوراً یاد دہانی کروائی۔

”کیا ضروری بات کرنی تھی آپ کو۔“ وہ بات کو دل کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

”یونیورسٹی میگزین کی انچارج آپ ہیں؟“

”جی بالکل میں ہوں۔“

”پیپر میں کالم بھی آپ لکھتی ہیں۔“

”جی میں ہی لکھتی ہوں۔“ میں کسی ایک پارٹی کے خلاف یا کسی دوسری پارٹی کی فیور میں کچھ نہیں لکھتی۔ میں

صرف ان بازیں جو مجھ پر لکھتی ہوں جو ہماری سوسائٹی میں ہونی چاہیے۔“ اس نے تفصیلاً جواب دیا۔

”میں کچھ دنوں سے پیپر میں مسلسل آپ کے کالم پڑھ رہا تھا۔ آج یونیورسٹی کے فرنٹ پر آپ کا نام دیکھا

تو سوچا آپ کے بارے میں پنا لگایا جائے۔ اسٹوڈنٹ انفرمیٹی کے ہیڈ سے پوچھا تو انہوں نے بتایا آپ ایم بی

اے فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہیں۔ بہت اچھا لکھتی ہیں آپ یونہی سچ اور حق کے لیے قلم اٹھاتی رہے گا۔ ایک اور

بات کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہہ دیجئے گا۔“ وہ کچھ زیادہ ہی امپریس دکھائی دیتا تھا۔

یہ الفاظ یہ ستائش یہ عزت یہ شہرت اس کے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ روز ایسے ستائشی کلمات اور دعاؤں سے

بھری ہزاروں میلوا سے سوشل ویب سائٹس پر موصول ہوتی تھیں۔ مگر پھر بھی کچھ تو تھا کچھ نیا کچھ انوکھا جو نظروں

کے سامنے آئے بنا اپنے ہونے کا احساس دلارہا تھا۔

”شکریہ۔“ اس نے گردن ہلا کر بس اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔

”اوکے ہیں چلا ہوں۔ قسمت نے ساتھ دیا اور زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔“

”ہوں۔“ وہ اس قدر دوستانہ مخاطب کیے جانے پر چونکے گئی اور ماضی کے درتے پتے میں جھانکنے لگی۔

☆.....☆

”السلام علیکم کیسے ہیں آپ؟“ ارسل ڈرائنگ روم میں لگی پینٹنگ کو اپنے مزاج کے عین برعکس قدرے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ آہستگی سے ان کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔
 ”وعلیکم السلام! اللہ کا کرم ہے تم سناؤ۔“ اس کی پروقا را آواز پر وہ یکدم مڑا تھا۔
 ”میں بھی ٹھیک ہوں آپ کھڑے کیوں ہیں پلیز تشریف رکھیے۔“ وہ میزبان ہونے کا فرض خوش دلی سے نبھانے لگی۔

”ٹائٹس کالیکشن۔“ دیوار میں موجود ریکس پر پڑے کچھ فائن آرٹس کے ڈیکوریشن میں دیکھ کر انہوں نے ستائشی انداز میں کہا اور سامنے موجود صوفے پر ٹنگ گئے۔

”جی شکریہ۔“ اسے اپنا لہجہ ایک بار پھر بیگانہ ہوتا محسوس ہوا۔ ارسل کے سامنے وہ جتنی اپنائیت دکھانے کی کوشش کرتی تھی انجانے میں اس سے بھی زیادہ بے اعتنائی برت جاتی تھی۔

”خالہ! کیسی ہیں؟ آپ کا اسلام آباد چکر لگا ہی تھا تو انہیں بھی ساتھ لے آتے۔“
 ”ماما از فائن، بہت دنوں سے سوچ رہا تھا تم پر تو کسی کی یاد حرام ٹھہری ہے۔ کیوں ناں میں ہی تمہارے ساتھ کچھ نام spend کر آؤں۔“ وہ شکوہ رساں تھے اور وہ ان کا شکوہ دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے میں تھوڑا مصروف تھی خیر مجھے خوشی ہوئی آپ کے آنے سے۔“ اس نے سکراتے ہوئے جواب دیا۔

”سچ میں۔“ انہوں نے پلکیں سکیریں۔

”لگ تو نہیں رہا۔ وہ مزید بولے۔“

”سروش درانی جی! چھوٹ نہیں بولتی ارسل صاحب۔“ ارسل نے اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد محسوس کیا۔
 ”جہاں تک میرا خیال ہے، ہماری ڈگری عمل ہوئے at least دو ماہ ہو گئے ہیں اور تم کوئی جاب بھی تو نہیں کر رہی تو پھر ایسی کون سی مصروفیات ہیں جن میں تم اتنا مصروف ہو کہ تمہارے پاس اپنے فیا سٹی تک کے لیے وقت نہیں ہے۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے حیرت دریافت کی۔

”ایکویٹی میں ایک کتاب لکھ رہی ہوں آج کل تو اسی سلسلے میں تھوڑا مصروف رہتی ہوں اور کوئی بات نہیں ہے۔“ اب کی بار اس نے دھیمے مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”ہوں۔“ وہ خاموش بیٹھے کچھ کھوجنے والے انداز میں اس کی جانب ہنکتے رہے۔
 ”جائے بناؤں آپ کے لیے؟“ اس کی گہری نگاہوں کے حصار سے نکلنے کے لیے سروش نے بات کو بدلا۔

”نہیں آج آفس میں لٹخ تھوڑا لیٹ کیا تھا۔“
 اور ایک بار پھر کئی لمحوں کے لیے ان دونوں کے درمیان خاموشی راج کرنے لگی۔

”آپ نے آج کے پیپر میں میرا کالم پڑھا تھا؟“ اس نے اکتا کر خاموشی کا تسلسل توڑا۔
 ”تم کالم لکھتی ہو؟“ وہ چونکے۔

”نہی کوئی دو سالوں سے۔“
”تم نے مجھ سے پریشانی؟“ انہوں نے اپنی پوزیشن کا رعب ڈالنا چاہا۔
”پریشانی تو لیگل کاموں کی لینی پڑتی ہے نا اور میں کوئی ایسا غلط کام تو کر نہیں رہی جس کے لیے مجھے آپ سے پریشانی لینا پڑے۔“ اس نے ازلی صاف گوئی سے جواب دیا۔

”ویسٹ آف ٹائم۔“

”اٹس مائی پشمن۔“

”اگر میں تمہیں منع کروں۔“

”تو بھی میں نہیں رکوں گی۔ شادی سے پہلے تو بالکل بھی نہیں۔“ اس نے ارسل کی بات کانتے ہوئے تیزی سے جواب دیا۔

”تمہارے نزدیک یہ فضول کام مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔“ انہوں نے دل جلانے والے حقارت آمیز

لہجے میں کہا۔

”میں میرے نزدیک میرے ہر کام ہر رشتے کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔“

”پریشانی مجھے چلنا چاہیے۔“ وہی حقارت آمیز انداز۔

”کھانا کھا کر جائیے گا۔“ وہ مروتا کہہ پائی۔

”نہیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی شکر یہ۔“ اس نے ہی بل وہ لے لے ڈگ بھرتے ہوئے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔

”ان سے شادی کرنے سے بہتر ہے میں کسی ایسے انسان سے شادی کر لوں جس کے پاس ڈگری کے اجبار بجھنے نہ ہوں مگر قلم کا شعور ضرور ہو۔“

ان کی پشت کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے کوفت سے سوچا تھا اور آج اسے اس کے الفاظ کی قدر کرنے والا مل گیا تھا۔

☆.....☆

”ایکسکیوز می یہ کراہنا لوجی ڈیپارٹمنٹ کس فلور پر ہے؟“ وہ ایچ بلاک کے گراؤنڈ فلور پر کھڑے اس شخص سے مخاطب تھی جو بلیک ٹی شرٹ میں ہینس جینز میں ہاتھ ڈالے سامنے لان میں اڑتی ہوئی رنگ رنگی تیلیوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور وہ عین اس شخص کی پشت پر کھڑی تھی۔

”ایکسکیوز می۔“ جواب موصول نہ ہونے پر وہ رخ بدل کر اس شخص کی نگاہوں کے سامنے آرکی۔

”کراہنا ڈیپارٹمنٹ کس فلور پر ہے؟“ وہ ذرا قوت سے چلائی۔ سامنے کھڑا جانا پہچانا چہرہ کانوں میں ہینڈ

فری ٹھونسنے منہ ہی منہ میں کچھ گنگٹانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اسے دیکھ کر پل بھر میں چونکا۔

”مس سروش آپ تشریف رکھیے پلیز۔“ وہ ساتھ پڑی بیچ کی طرف اشارہ کرتا ہوا شائستگی سے گویا ہوا۔

”تمہیں لگتا ہے میں اپنے قیمتی ترین وقت میں سے فضول ترین لمحات نکال کر یہاں تمہارے پاس بیٹھنے کے

لیے آتی ہوں۔“ اس دوستانہ پیشکش پر وہ پرانا حساب چکاتا کرتے ہوئے رخ لہجے میں بولی۔

”کراہنا لوجی ڈیپارٹمنٹ یہی ہے۔“ تو گویا اس کی بات سن کر بھی ان سنی کرنے کا ڈرامہ رچایا جا رہا تھا۔

”دونٹ ٹیل می، اب اس دن والی حرکت کو لے کر شرمندہ ہیں۔ ویسے شرمندہ ہونا تو چاہیے پر اس اوکے،

مجھے آپ سے کوئی شکوہ کوئی گلہ نہیں ہے۔ سو روز ایکسکیوز می۔“ اس کی جلی جلی مانتیں سن کر دل ہی دل میں محظوظ ہوا

خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔

”ہونہہ..... میں ایکسکیوز کروں گی وہ بھی تم سے بھول ہے تمہاری۔“ وہ مزید لال چلی ہوئی۔

”اگر آپ غلطی پر ہوں تو میرا نہیں خیال ایکسکیوز کرنے میں کوئی مضائقہ ہے۔ ویسے میرا تعلق بھی اسی ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ میرے لائق کوئی حکم ہو تو ضرور بتائیے گا مجھے خوشی ہوگی اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں۔“ اس کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر وہ تھوڑا سنجیدہ ہوا تھا۔

”میں یہاں گلہان سکندر سے ملنے آئی ہوں۔ آپ انہیں جانتے ہیں تو برائے مہربانی میری رہنمائی کر دیں۔“ اس نے اپنا لہجہ نارمل رکھتے ہوئے روانی سے کہا۔

”گلہان سکندر۔“ وہ سوچتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”جی میڈم! بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں اسے۔“ وہ اچانک کچھ یاد آنے پر خوشی سے چلایا۔

”اوہ..... گریٹ تو تم بتا سکتے ہو وہ مجھے اس وقت کہاں مل سکتے ہیں۔“ وہ ہاتھ میں تھامے پیڈ پر اپنی گرفت مضبوط کرتی ہوئی بے ساختہ بولی۔

”کچھ چہرے آپ کے آس پاس بھٹکتے پھرتے ہیں بس آپ پہچاننے میں تاخیر کر دیتے ہیں۔“ وہ مزے لیتا ہوا ہنسی سے بولا۔

”ڈرائیو مجھے گلہان صاحب کا انٹرویو لینا ہے۔ اپنے میگزین کے لیے چیف ایڈیٹر نے رپورٹ دی ہے کہ وہ انٹرنیشنل فرسٹ۔ ریشن۔ ایکسی ڈیشن ٹیم کے براہ نام پر بت سر کرنے گیا ہوا تھا میرے خیال میں ہمیں ایسے نوجوانوں کے بلند حوصلوں کو Expose کرنا چاہیے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ہمارے لیے قدرتی حسن کی شاہکار خوب صورت وادیاں Expose کرتے ہیں۔“ وہ لان میں کھلے پھولوں کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے خیالات بتا رہی تھی۔

”جی بجا فرمایا تو کب بس گی آپ میرا انٹرویو؟“ وہ ہونٹوں کا کونا دانٹوں تلے دبا کر آہستگی سے بولا۔

”میرے خیال میں، میں نے مسٹر گلہان سکندر درانی کا نام لیا ہے۔“ وہ اس کے یوں بے ساختہ ہنسنے پر بلا واسطہ چڑھی تھی۔

”یوں نوواٹ آپ کی سٹینس آف ہیومر بہت ناقص ہے، جس گلہان سکندر درانی کو ڈھونڈنے کے لیے آپ صبح سے خوار ہو رہی ہیں۔ درحقیقت وہ گلہان سکندر درانی میں ہی ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے رہا تھا۔

”تم جھوٹ کہتے ہو۔“

”میں آپ سے جھوٹ کیوں کہوں گا۔“

”اپنا امیج بنانے کے لیے یا خود کو شو آف کرنے کے لیے کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔“ اس کے اس قدر بے جان آریگومنٹ پر وہ دل کھول کے مسکرایا اس کی ہنسی میں بلاشبہ بہتے جھرنے کی سی روانی تھی۔

”آپ کو لگتا ہے مجھے خود کو شو آف کروانے کی ضرورت ہے؟“ اس نے نظروں کا زاویہ بدلا۔ وہ بلا کی حاضر دماغ تھی مگر فی الوقت اس سے کوئی جواب نہ بن پایا سو چپ سا دم کھڑی رہی۔

”شو آف کرنے کی ضرورت انہیں ہوتی ہے جنہیں سوسائٹی میں کسی قسم کے اسٹیشنس سے عرض ہو، میں کسی اور دنیا کا باسی ہوں میں اس دنیا کو فراموش کر چکا ہوں اور میری دنیا میں اسٹیشنس، امیج جیسی کوئی شے معنی نہیں رکھتی۔

ایک لاج حاصل منول کو پالینے کی جستجو معنی رکھتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے اس نے مجھے ہر شے سے نوازا ہے۔“ وہ چپ

رہی اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہ تھا مگر دل اس بنجارے کا قائل ضرور ہو چکا تھا۔
ویران ہوئی سنان پگڈنڈیوں پر تھکے تھکے سے قدم رکھتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے اطراف میں دور دور تک
پھلے ہوئے میدانوں کو تنگ رہا تھا۔ رات کی ہلکی سی سیاہی ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لے رہی تھی اور وہ اپنی ذات
میں گمن چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک فل لوڈ ڈب کے قریب آ کر چمرائے اور وہ یکدم سیدھا ہو گیا۔
جیب میں سے بھاری بھر کم قدموں والے چارنو جوان باہر نکلے ان سب کے ہاتھ ہا کیوں اور ڈنڈوں سے لیس
تھے۔ زیست کی سیاہی میں وہ ان مدھم ہوتے چہروں کو پہچاننے سے قاصر رہا۔

”یہی ہے وہ پکڑو اسے۔“ کسی ایک کی آواز ویرانے میں گونجی تھی۔

”کون ہو تم لوگ؟“ وہ پل بھر میں بوکھلایا۔

”واہ صاحب لڑکا پوچھتا ہے کون ہو تم لوگ؟“ آگے بڑھنے پر ان میں سے ایک نے قہقہہ لگا کر دوسروں کو متوجہ کیا۔

”بڑی جلدی بھلا بیٹھے ہو خیر ابھی یاد دلانے دیتے ہیں۔“ ایک زوردار قہقہہ پھر سے اس کی سماعتوں سے نکلایا۔

”میں ہوں پاشا، یہ ہے علی اور زبیر اور وہ جو پھلا لڑکا دیکھ رہے ہونا وہ ہے سہیل۔“

”کون علی، کون زبیر چاہتے کیا ہو تم لوگ؟“ وہ اپنے ذہن پر زور ڈالتا ہوا پوری قوت سے چلایا۔

”تو تو پل پل یاد ہے ہمیں، جناح اسنو کر کلب تمہیں یاد ہے کہ نہیں ذرا اپنی سوچ کے گھوڑے دہراؤ تو شاید ہم
چاروں بھی یاد آجائیں۔“

”جناح اسنو کر کلب.....“ اس نے زیر لب کہا۔

”لیکن وہ قصہ تو اس دن تھا نے میں ہی ختم ہو چکا تھا اب تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو۔“ وہ سارے غڈھے
ذہن سے نکال کر دست سوال ہوا۔

”بدلہ لینے آئے ہیں۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس جوان نے ہاتھ میں پکڑی ہاکی کا وار سیدھا اس کے سر پر کیا۔

مضبوط اعصاب کا مالک ہونے کے باوجود وہ لڑکھڑایا اور سیدھا زمین پر آگرا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا

چھارہا تھا اور اگلے دو سے تین مزید وار اسے ہوش کے سمندر سے نکال کر کہیں دور پھینک چکے تھے۔ جانے کتنے

پل وہ ہوش و حواس سے عازی اس انجام دنیا میں بے خبری کے عالم میں کھویا رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا مگر ہوش آنے پر

اس کی پہلی نظر ڈاکٹر سے باتیں کرنی اس نازک سی لڑکی پر پڑی جس کی تحریریں اسے کب کا اسیر کر چکی تھیں۔

رات کے اس پہر وہ سول اسپتال کی بھیڑ میں کھڑی تھی، تنہا، پریشان محض اس شخص کے لیے جس کے نام سے وہ

ابھی کچھ دن پہلے واقف ہوئی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔“ وہ ڈاکٹر کو الوداع کہہ کر ہاتھ میں پکڑا میڈیسن کا شاپرا اس کے پاس رکھتے

ہوئے نرمی سے بولی۔

”اب کیسا فیل کر رہے ہو۔“

”ہوں..... بہتر میں یہاں کیسے؟“ اس نے ارد گرد دیکھتے ہوئے بمشکل بولنے کی کوشش کی۔

”میں NGO سے واپس آ رہی تھی تمہیں سڑک کے کنارے یوں بے سدھ پڑا ہوا دیکھا تو ایسبوی لینس تو کو کال

کر کے میں تمہیں یہاں لے آئی۔“ اس نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا اور ریکس پر پڑے سب کاٹنے لگی۔

”رات بہت ہو چکی ہے اب آپ کو گھر جانا چاہیے۔“

”اس اوکے میں آپ کو اس حال میں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

”میری فکر مت کریں مجھے کچھ نہیں ہوگا آپ چلی جائیں۔ عجیب شخص تھا جو رات کے آخری پہرے سے واپس بھیجنے پر مصر تھا۔“

”میں اس وقت واپس نہیں جا سکتی کسی بھی لمحے تمہیں میری ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ اس نے اپنا حتمی انداز اپنایا۔
”کہانا آپ سے مجھے کسی کے احسان یا ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جو کیا اس کے لیے شکر یہ تاؤ پلیزی لیوی الون۔“ وہ کرب سے چلایا تھا۔

”ریلیکس میں جا رہی ہوں۔“ وہ فروٹ کی ٹوکری اس کے پاس رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”عجیب احمق شخص ہے۔“ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں میں آنی نمی کو صاف کرتے ہوئے بدلی سے سوچا۔

☆.....☆

”مس ثانی! آپ یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہیں؟“
وہ اپنی یونی فیلوگی شادی میں شرکت کے لیے لاہور آئی ہوئی تھی۔ جب اسے نامعلوم نمبر سے ٹیکس میسج موصول ہوا اور ایک سیکنڈ کے اٹھارویں حصے میں اس نے اندازہ لگایا کہ وہ ٹیکسٹ کس کی طرف سے ہے۔ اسے ثانی وہی ایک شخص کہا کرتا تھا جس سے وہ مزید کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ سو اس نے میسج ڈیلیٹ کر کے موبائل پر اس میں رکھ لیا۔ اگلے کئی دنوں تک اسے گلہان سکندر رورانی کی جانب سے مسلسل ٹیکسٹ اور ای میلز موصول ہوتی رہیں مگر وہ دل میں ابھرتے کچھ نئے نئے احساسات کو دیکھ کر اسے مسلسل انور کرتی رہی۔

☆.....☆

”ہائے مس ثانی!“ اسے لاہور سے لوٹے پہلادن تھا کہ گلہان نے یونیورسٹی گیٹ پر ہی آگھیرا۔
”ہائے۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ڈپارٹمنٹ کی جانب چل دی۔
”اتنا غصہ کہاں غائب رہیں۔ میں نہیں جانتا کیوں؟ مگر میں نے آپ کو سنا کیا۔“
”مس..... ہونہ تم جیسے لوگ کسی کی عزت کرنا سیکھ لیں یہی بہت ہے۔“ اس کا بوجہ خود بخود سخت ہوا تھا۔
”مس ثانی! میں نے آپ کی عزت کب نہیں کی۔ وہ دست سوال ہوا وہ خاموش رہی۔“
”اس رات اسپتال میں، میں اکیلا رہنا چاہتا تھا اور آپ واپس نہیں جا رہی تھیں۔ سو غصے میں آ کر تھوڑا زیادہ بول بیٹھا۔“ اس نے وضاحت دی۔

”مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے مسٹر گلہان سکندر رورانی۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔
”میں جانتا ہوں آپ کو مجھ سے کوئی شکوہ نہیں ہے اور شکوہ ہونے کیوں جب میں نے کچھ غلط نہیں کیا مجھے ماہا یاد آ رہی تھی اور میں اس کی یادوں میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا ہوں تا اپنی زندگی میں۔“ اس کا جواب بھی دو ٹوک تھا۔ ”ماہا.....“ وہ چونکی دل میں کچھ پچھل سی ہوئی تھی۔
”جی ماہا ملک لو آف مائی لائف پھر بھی بتاؤں گا۔“ وہ سرد آہ بھرتا ہوا سیدھا ہوا۔
”پھر بھی کیوں۔ ابھی کیوں نہیں۔“ وہ چلتے چلتے رکی۔
”آپ اکتا جائیں گی۔“

”وہ میرا مسئلہ ہے تم سنانا شروع کرو۔“ وہ اسے فٹ ہاتھ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

”کچھ لوگوں سے ہم محبت کرنا نہیں چاہتے مگر محبت ہمیں مجبور کر کے اپنا آپ خود منوا ہی لیتی ہے۔“ گلماں کی حقیقت جان لینے کے بعد وہ بھی اسی دورا ہے پر آرکی تھی۔ فائنل ٹرم آئیے تھے سو وہ سب باتوں کو ذہن سے نکال کر اسٹڈی میں مصروف ہو گئی مگر محبت اس کے ذہن و دل میں گھر کر چکی تھی۔

”Happy birthday to you.“ وہ کلاس سے باہر نکلی تھی جب گلماں نے اس کے سامنے سفید پھولوں کا بکے پیش کرتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”شکر یہ۔“ وہ دل سے مسکرائی تھی اور بہت دنوں بعد مسکرائی تھی۔

”یونہی مسکراتی رہا کریں۔“ وہ ایک سادہ سی نظر اس پر ڈالتا ہوا کہہ گیا۔

”تم بہت اچھے ہو۔“ اس نے سفید پھولوں کی مہک خود میں اتارتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”جانے وس اب اتنا بھی اچھا نہیں ہوں۔“

”اچھا تو پھر کتنے اچھے ہو۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”بالکل بھی اچھا نہیں ہوں بس اللہ نے گناہوں پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ نہیں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوں تھی۔“ وہ سنجیدہ ہوا۔

”ہاں یہ تو ہے وہ ذات واقعی رحیم ہے جو بنا کہے ہم سب کے عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ بس ہمیں ہی جلدی ہوتی ہے سب کے عیب فاش کر کے دنیا سے واہ واہ کروانے کی۔“

”آپ بھیک کہتی ہو مانی! چلیں اب ٹریٹ دیں۔“ وہ جان بوجھ کر مومنو سے بدلتا ہوا بولا۔

”ٹریٹ بھی مل جائے گی جلدی کس بات کی ہے میں ذرا اپنے گروپ سے کنفرم کر کے آتی ہوں پھر چلیں گے۔“ NGO کے بچوں کے ساتھ ڈنر کرنے، تمہیں اچھا محسوس ہوگا۔“ وہ واپس کلاس روم کی جانب چلی اور وہ

اس دھان پان سی لڑکی کی آنکھوں میں ابھرتی تحریروں کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ان تحریروں میں اس کے لیے اپنائیت ہی اپنائیت لکھی تھی۔ وہ یہ سب نہیں چاہتا تھا مگر چاہ کر بھی وہ اس لڑکی سے دور نہیں ہو پارہا تھا۔ وہ اسے خوش رکھنا چاہتا تھا۔

☆.....☆

وہ کتابوں کی دیواروں سے بنی عظیم الشان لائبریری کی ایک کونے میں بیٹھی جلدی جلدی ہاتھ چلانے میں مگن تھی۔ اس کے ارد گرد نوٹس، فائلز، رپورٹ اور پیپرز کا انبار لگا ہوا تھا اور وہ اس تمام بلبے میں سے ہائی لائٹ کیے گئے مواد کو ایک الگ پیپر پر اتار رہی تھی۔

”مانی! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ یک دم جانے کہاں سے گلماں کی آمد ہوئی تھی۔

”نظر نہیں آ رہا اسائنمنٹ کمپلیٹ کر رہی ہوں۔“ وہ اس کے اس قدر بونگے سوال پر بری طرح تھی۔

”اوہو اسائنمنٹ تو بعد میں بھی کمپلیٹ ہوئی رہیں گی۔ نی الحال میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں بولوس رہی ہوں میں۔“ اس نے بے نیازی دیکھتے ہوئے قلم کی رفتار بڑھا دی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پوری دنیا سے تو بے نیاز رہ سکتی ہے مگر اس ایک شخص سے بے نیازی برتا اب اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔

”فائنل ایگزام کے بعد لائف خاصی بورنگ سی ہو گئی ہے اس لیے ہماری کلاس نے کل صبح مری جانے کا پلان بنایا ہے۔ آج کل موسم بھی کالی خوشگوار ہے نا۔“

”تو.....! وہ اس کا اشارہ سمجھ چکی تھی مگر پھر بھی ناگہمی کی ایک نکتہ کرنا اس نے اپنا فرض جانا۔

”تو یہ کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہیں۔“ وہ قدرے شوخی سے بولا۔

”بالکل نہیں۔“ وہ اتنی آسانی سے مان جانے والوں میں کہاں تھی۔

”ریکوں؟“ شوخ لہجہ ایک پل میں بجھا تھا۔

”مجھے اگلے ہفتے پروجیکٹ پر پوزل سمٹ کروانا ہے، اس لیے میرے پاس وقت بالکل بھی نہیں ہے۔“ اس

نے فوراً ایکسکوز پیش کیا۔

”ابھی سات دن باقی ہیں پروجیکٹ پر پوزل سمٹ کروانے کے لیے، ہم کل صبح نکلیں گے اور انشاء اللہ

پرسوں شام تک لوٹ آئیں گے بس دو دن کی تو بات ہے ثانی! منع مت کریں پلیز میں نے یہ پلان آپ کے

لیے سیٹ کیا ہے۔“ اسے اپنے ٹور کے بارے میں بریف کرتا ہوا وہ نرمی سے بولا تھا۔

”مسٹر گلہان سکندر! میں تمہارے کسی پلان کا بھی حصہ نہیں رہی اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا یہ سپر گولڈن

پلان خراب نہ ہو تو خدا کے لیے مجھے فورس مت کرو۔“ سروش نے شکوہ کرتے ہوئے لہجے میں طنز کو سمویا تھا۔

”ثانی پلیز! پہلی اور آخری بار ہمارے ساتھ آجائیں ہم اچھے دوست ہیں اسی بہانے ہماری ساتھ بتائی گئی

کچھ یادیں بھی محفوظ ہو جائیں گی۔“ وہ کھویا کھویا سا بولا۔

”جب انسان ندر ہیں تو یادوں کی کیا وقعت؟“ اس نے ایک حسرت بھری نگاہ گلہان پر ڈال کر سوچا۔

”شکل کتنے بچے نکلتا ہے؟“ وہ پوچھ بیٹھی۔

”تم نہیں تو تمہاری یاد ہی سہی۔“ دل نے فوراً دماغ کی نشی کی تھی۔

”صبح پانچ بجے۔“

”اوکے مجھے میرے فلیٹ سے پک کر لینا میں تیار رہوں گی۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے شان بے نیازی

سے یوں بولی جیسے اس کی ذات پر کوئی بڑا احسان کر رہی ہو۔

”سچ ثانی! آپ جھوٹ تو نہیں کہہ رہیں۔“ وہ تصدیق زدہ لہجے میں بولا۔

”میں تم سے جھوٹ نہیں کہہ سکتی۔ ہوتے ہیں ناں کچھ لوگ جن کے لیے ہمیں کھلی کتاب بننا پڑتا ہے جن

سے ہم کچھ نہیں چھپا سکتے۔ جیسا ناچا ہیں تو بھی یہ ہمارے بس میں نہیں ہوتا میرے لیے وہ کچھ لوگ تم ہو گلہان

سکندر اب تم جاؤ یہاں سے ملاقات ہوگی۔“ گہرے مین کٹوروں سے چھلکنے کو بے قرار آنسوؤں پر ضبط

کرتی ہوئی وہ بمشکل کہہ پائی۔

☆.....☆

”واہ یار سو پر اچھا ٹیٹ ہے آپ کے ہاتھ میں یقین کریں اس سے زیادہ لذیذ لازانیہ میں نے آج تک

نہیں کھایا۔“ بریزے خوش دلی سے بولی تھی۔

”یہاں یار یہ بات تو ماننا پڑے گی شی از سو پر۔“ ثانیہ بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔

”ٹھنکس۔“ وہ زرب کہتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔

”ہائے فرینڈز آج ہمارے لیے اسٹرونگ سی کانی بھی سروش خود اپنے ہاتھوں سے بنائیں گی۔“ گلہان

سکندر جو کمرے پر سر جھکائے کب سے خاموش بیٹھا تھا ان سب کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا

اچانک مداخلت کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن مجھے تو کافی بنانا نہیں آتی۔“ وہ اس نئی فرمائش پر پوری طرح گڑبڑائی تھی۔

”آپ مذاق کر رہی ہیں۔“ پیچھے سے عائشہ کی آواز آئی تھی۔

”نہیں میں مذاق نہیں کر رہی انچولی مجھے کافی کا ٹیسٹ بالکل نہیں پسند سو کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی بنانے کی۔“ وہ خاصی شرمندہ تھی۔

”اوہو! آپ پریشان مت ہوں آج میں آپ کو کافی بنانا سکھاتی ہوں۔“ نامہ نے فراخ دلی سے اسے کافی سکھانے کی آفر کی تو وہ بنا کچھ بولے چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی جب کہ باقی لوگ نوٹو سیشن میں مگن ہو گئے۔

”تم بیٹھو ہم کافی بنا کر لاتے ہیں۔“ نامہ کے ہاتھ سے پیکیٹس لے کر وہ سروش کے ہمراہ چلتا ہوا اسٹوٹک آیا جو انہوں نے اپنی گاڑی کے پاس سیٹ کیا ہوا تھا۔

”آپ کوچ میں کافی بنانا نہیں آتی؟“ وہ اسٹوٹک کرنا ہوا پوچھ رہا تھا۔

”گلمان! میں تم سے جھوٹ کیوں کہوں گی۔“ وہ زمانے بھر کی بے چارگی اپنے لہجے میں سمو کر بولی۔

”چلیں آپ بھی کیا یاد کریں گی آج گلمان سکندر! بقلم خود آپ کو اپنے مبارک ہاتھوں سے کافی بنانا سکھائیں گے۔“ وہ فرضی کاراٹھاتا ہوا بولا۔

”احسان کر رہے ہو مجھ پر تو مت سکھاؤ۔“ اس کا لہجہ دل جلانے والا تھا۔

”احسان کر نہیں رہا احسان چکارہ ہوں، یاد ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے مجھے لازماً یہ بنانا سکھایا تھا تو بدلے میں، میں آپ کو کافی بنانا سکھا رہا ہوں۔ ہم بادشاہ لوگ ہیں مفت میں احسان نہیں رکھتے کسی کا۔“ وہ اتنا شوخ کب سے ہوا تھا وہ خود نہیں جانتا تھا۔

اور وہ چپ سا دھسے بے خیالی کے عالم میں اسے کافی بنانا دیکھتی رہی اور گرد کی دنیا سے بے خبر دیدار میں محو۔

”کافی۔“ گلمان نے اسے متوجہ نہ پا کر مخاطب کیا۔ وہ ارد گرد کی دنیا سے بے خبر تھی۔

اسے ایک بار پھر پکارا گیا۔

اب کی بار گلمان سکندر اپنی جگہ سے ہلا تھا۔

”بچ..... جی۔“ وہ چونکی سہانے خوابوں کی روانی میں ہلکا سا خلیل آیا تھا۔

”کہاں کھو گئی تھیں آپ کب سے آواز نہیں دے رہا ہوں۔“ اس کے پاس بیٹھتا ہوا وہ عام سے لہجے میں بولا۔

”میں..... نہیں تو۔“ اس نے غائب و ماعنی کے عالم میں جواب دیا۔

”تو پھر آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہیں۔“ گلمان کا لہجہ تشویش زدہ تھا۔

”میں کافی بنانا سیکھ رہی تھی۔“ اس نے خالی دماغ کو ٹٹولتے ہوئے فی الفور یہی عذر پیش کیا۔

”کافی بنانا سیکھ رہی تھیں یا کافی سکھانے والے کو دیکھ رہی تھیں۔“ ہونٹوں تک آئی ولفریب مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے وہ قیاس آرائی کے انداز میں بولا۔

”تم واقعی احمق ہو۔“ وہ چڑکراٹھ کھڑی ہوئی۔

”تو آپ اس احمق کا ساتھ دیں۔“ سروش کے جواب میں وہ کھل کر ہنستا چلا گیا۔

اس کی ہنسی لوٹ آئی تھی یہ بات بھی کسی مجھڑے سے کم نہ تھی۔

”سنجھا لو اپنی کافی میں جارہی ہوں۔“ وہ اسٹوکی طرف اشارہ کرتی ہوئی تنک کر بولی۔ جہاں کافی کا پانی بواہل ہو کر پین سے باہر گر رہا تھا۔

ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ کچھ چوٹیاں برف آلود تھیں جب کہ باقی چوٹیوں کی برف دھیرے دھیرے پگھل رہی تھی۔
 ”یہ رہی جناب آپ کی کانی۔“ وہ باقی لوگوں سے خاصی دور بادلوں کے پتھوں و تچ ایک پتھر پر بیٹھی اپنی
 ڈائری اور کیمرے میں ارد گرد کے دلکش مناظر قید کرنے میں مگھی۔ جب گلہان ہاتھ میں کانی کے رنگ تھامے
 ہوئے اس کے پاس آ بیٹھا۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ خاصی بے رخی سے بولی۔

”ہاں..... کانی میں نے اتنی چاہت سے بنائی ہے آپ کے لیے۔“

”تم نے بنائی ہے اس لیے تو کہہ رہی ہوں نہیں پتہ۔“ اسے چڑانے کی باری اب اس کی تھی۔

”اماں کہتی ہے تم جیسی کانی کوئی اور بنا ہی نہیں سکتا۔“ وہ نظریں چرانے والوں میں سے کہاں تھا۔

”صحیح کہتی ہیں تم جیسی بد ذائقہ کانی واقعی کوئی دوسرا نہیں بنا سکتا۔“ باز آنا اس نے بھی نہیں سیکھا تھا۔

”آپ خود فیصلہ کر لیں۔“ اس نے جھک کر کانی کا لگ ٹانہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے مہربانہ لہجے میں

کہا۔ جسے مزید کچھ کہے بنا اس نے مسکراتے ہوئے وصول کیا۔

”اف! کانی کا پہلا سپ لیتے ہی اس نے کرواہٹ سے بھر پور برا سامنہ بنایا۔

اس سے زیادہ کڑوی چیز میں نے پہلے کبھی نہیں چکھی۔“

”میرے ساتھ رہیں گی تو عادت پڑ جائے گی آپ کو پتا ہے ٹرینگ کے بعد کانی میرا دوسرا آپشن ہے۔“

”عادت تو دور کی بات ہے آج کے بعد میں کانی کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گی۔“ اس نے جمل بھن کر جواب دیا۔

”چلیں یہ تو وقت ہی بتائے گا۔“ وہ مسکرایا اور سردش برے برے منہ بنا کر فوٹو گرافی کرنے کے ساتھ ساتھ

کانی حلق میں اٹھیلنے لگی۔

”آج کچھ الگ کرتے ہیں ہم اپنے لگ Exchange کر لیتے ہیں۔“ کانی دیر چپ رہنے کے بعد

اسے ایک نیا خیال سوچھا تھا۔

”اچھا.....!“ وہ فوٹو گرافی کرتے ہوئے مصروف کن انداز میں بولی۔

”آپ نے زندگی میں پہلی بار کانی پنی وہ بھی میرے ساتھ میرے کہنے پر میرے ہاتھ کی بنی ہوئی ہم اسے

یادگار بناتے ہیں۔“

”تم احمق ہو۔“ کھلکھلاتی ہوئی دل فریب ہنسی کا فوارا پھوٹا تھا۔

”آپ اس احمق کا ساتھ دیں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے مگر میری ایک شرط ہے۔ اب سے تمہارا لگ میں رکھوں گی اور میرا لگ تم رکھ لینا۔“ وہ اس

انوکھی شرط پر حیران ہوا۔

”کتنے کے طور پر۔“ اس نے مزید اضافہ کیا اور اپنا براؤن لگ اسے پکڑاتے ہوئے ہارٹ شپ میں بنا ہوا

بے حد نفیس مہرون کلر کا لگ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ محبت کی کوٹلیں دونوں دلوں میں برابر پھوٹ رہی تھیں ایک

دل اظہار سے ڈرتا تھا اور دوسرا دل ٹوٹ جانے سے خوف کھاتا تھا۔ کتنے ہی بل وہ دونوں مسکراتے، گنگناتے

پھاڑوں کے دامن میں بیٹھے ان حسیں لمحات کو یادگار بنا دیتے رہے۔

”گلمان سکندر سہاگل۔“ وہ کبیرہ آن کرتے ہوئے اٹھی ہی تھی کہ اچانک اس کا پیر مڑا، انگلیں ہی پل وہ اس دیو قامت سفید پتھر سے نیچے آگرتی اگر گلمان بروقت اٹھ کر اسے سہارا نہ دیتا مگر اس افراتفری کے عالم میں سروش کا براؤن مگ اس کے ہاتھ سے پھسل کر چکنا چور ہو چکا تھا۔ دل میں ٹیس اٹھی تھی۔

”تم نے میرا گفٹ توڑ دیا۔“ وہ روہا سی ہوئی۔

”آن۔۔۔ اسوری ثانی! وہ کس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔“ وہ خاصا شرمندہ تھا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے گلمان! تم بس توڑنا جانتے ہو۔ چاہے وہ سروش درانی کا دل ہو یا پھر اس کی طرف سے دیا گیا کوئی حقیر سا تحفہ۔“ وہ خاصی ہرٹ تھی۔

”ثانی آپ کو دیکھ کر اٹھنا چاہتا تھا۔ میں آپ کو نہ تھا تا تو آپ بڑے نیچے گر جاتیں خدا نخواستہ آپ کو چوٹ لگ سکتی تھی اور پھوگ کا کیا ہے وہ تو اور بھی آجائیں گے۔“

بالآخر کافی تنگ و دو کے بعد وہ اس کا موڈ خوشگوار کرنے میں کامیاب ہوا تھا اور سروش درانی کچھ لمحے پہلے ہونے والی جھڑپ کو بھلا کر مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ ٹوٹے ہوئے تنگ کی بکھری ہوئی کرچوں کو کیمرے میں Capture کرنے میں مصروف ہو گئی۔

اگلا پورا دن وہ یہاں کے حسین و جمیل اور برف میں ڈھکے مقامات کی سیر کرتے رہے۔ واپس آنے میں انہیں خاصی دیر ہوئی تھی۔ کسی حسین ناگن کی مانند مری کی بل کھاتی سڑکوں پر گلمان کسی ماہر ڈرائیور کی طرح گاڑی چلا رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ عاترہ اور بریزے پچھلی سیٹ پر براجمان تھیں جب کہ دوسرے لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں آگے پیچھے آرہے تھے یہ منظر بنا قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ وہ دنیا کی حسین مہکتی راتوں میں سے ایک بے حد حسین رات تھی۔ وہ ہینڈ فری کانوں میں لگائے، آنکھیں بند کیے اور کچھ خواب بننے میں مگن تھی۔

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے.....!

گلمان سکندر کی دلکش آواز کانوں میں پڑتے ہی اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ دونوں کی نگاہیں ایک بل کے لیے آپس میں ملیں۔ سروش کی نگاہیں خود پر محسوس کرتے ہوئے اس نے فوراً اپنے تیز کام سروں کو بریک لگائی اور ساری توجہ فرنٹ اسکرین پر مرکوز کر دی۔

اسے محبت نہ ہوئی یہ کیسے ممکن تھا وہ بس محبت سے لگا ہیں چہ راہ تھا۔ خود کو دھوکا دے رہا تھا کہ اب محبت کرنا اس کے بس میں نہیں رہا۔ وہ اس دھوکے میں خوش رہنا چاہتا تھا اور وہ اسے حقیقت بتلا کر مزید کسی کرب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جھوٹ کہتا تھا مگر اس کی آنکھیں ہمہ وقت محبت کی صداقت کی گواہی دیتی رہتی تھیں۔

”اچھا گالیتے ہو۔“ وہ کسی خواب کے زیر اثر ثانی الحال اتنا ہی کہہ پائی۔

”جھینٹکس ثانی!“ وہ اب چاند کی چاندنی خود میں سموتے ہوئے باقی کا سفر جاری رکھنا چاہتا تھا اور سروش بخوبی جانتی تھی کہ وہ ایسے مناظر کا کس قدر دیوانا ہے جیسا بنا کچھ کہے اسے سکتی رہی۔ وہ اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر بے فکری سے گاڑی ووڑا رہا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس وقت وہ اپنے گاؤں کی کچی سڑک پر نہر کے کنارے پانی میں چاند کا عکس دیکھتے ہوئے موٹر سائیکل نہیں چلا رہا بلکہ اس پہاڑی سلسلے کے درمیان مری کے خطرناک اونچے نیچے بل کھاتے راستوں پر گاڑی ڈرائیو کر رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

اجانگ گاڑی چڑھنے کی آواز کے ساتھ رکی تھی۔ شاید لینڈ سلائیڈنگ کے باعث راستے میں کوئی بڑا پتھر آگرا تھا۔

”مسٹر گلماں! دماغ تو ٹھیک ہے ناں تمہارا، ہمیں صحیح سلامت زندہ گھر جانا ہے اوپر نہیں جانا۔“ عازرہ اور بریزے جھٹکا لگنے پر گہری نیند سے بیدار ہوئیں تھیں گلماں کو یوں بنا ہیڈ لائٹس کے گاڑی چلاتا دیکھ کر انہیں اس کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا تھا۔ جب کہ سروش ہنوز پرسکون بیٹھی اس عجیب و غریب پہچویشن کو انجوائے کر رہی تھی۔ گلماں سکندر کے ساتھ بتایا جانے والا ہر لمحہ اس کے لیے تحفہ محبت کی سی اہمیت رکھتا تھا۔ چاہے وہ کتنا ہی رسکی کیوں نہ ہو۔

”لو ہو جاؤ خوش تم چڑیلو۔“ گلماں نے ہیڈ لائٹس آن کرتے ہوئے جھنجھلا کر کہا تھا۔

”آپ اس گدھے پر نظر رکھیے گا۔“ بریز نے بمشکل جماہی روک کر سروش کو مخاطب کیا۔

وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر شرارت سے بولی اور اگلے ہی پل وہ دونوں ایک بار پھر خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگ گئیں۔ کچھ دیر ناول ڈرائیو کرنے کے بعد گلماں سکندر نے ایک بار پھر اکتا کر ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔

”یہ لڑکا پتھر کے لیے کسی حد تک جاسکتا ہے۔“ اس نے دل میں سوچا تھا۔

”ٹانی۔“
 ”ہوں۔“
 ”آئی لوڈیٹ سین۔“
 ”جانتی ہوں۔“

”آپ کو پتا ہے جب میں پاپا کے ساتھ لیٹ ٹائیٹ لائٹ ڈرائیو پر جایا کرتا تھا تب بھی یونہی ہیڈ لائٹس آف کر دیا کرتا تھا جب سڑک پر گاڑی جھکولے کھاتی تھی تو پاپا میرے کان کے نیچے پتھر سید کر کے کہتے تھے۔“

”اوائے گدھے دھیان کدھر ہے تیرا آنکھیں کھول کر ڈرائیو کر۔“ وہ فرنٹ اسکرین پر نظریں گاڑھے اس کے ساتھ اپنی پرانی یادیں سیر کر رہا تھا۔

”تم شروع سے ایسے تھے؟“ اس کی بات سروش درانی کی گلابی پگھڑیوں پر شروع سا تبسم چھوڑ گئی۔

”ہاں ٹانی! ایسا ہی ہوں میں بس۔“ اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے حکم کیا۔

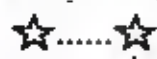
”مطلب تم شروع سے گدھے ہو چلو اچھی بات ہے آج یہ بھی کفرم ہو گیا میرا خیال ہے ہمیں اسے بھی یادگار بنانا چاہیے۔“

”ٹانی.....“ گلماں نے سامنے پڑاٹیڈی بیئر اٹھا کر اسے دے مارا۔

”کیا نہیں بنانا چاہیے۔“ وہ شرارت سے بھرپور لہجے میں بولی تھی۔

”سننا لیں اپناٹیڈی بیئر۔“ وہ مصنوعی حلقی چہرے پر سجائے ہوئے کہنے لگا۔

”اوہ..... آئی لوہائی ٹیڈی بیئر۔“ وہ پیلڈنگ کا خوب صورت ساٹیڈی بیئر ہاتھ میں لے کر کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی۔



رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ اسٹیڈی نیبل پر بیٹھی بڑی حسرت بھری نگاہوں سے لیپ ٹاپ اسکرین پر جھگماتی گلماں کی تصویر کو نکتے جا رہی تھی جو اس نے آج ہی فیس بک پر اب لوڈ کی تھیں۔ ارد گرد سے بے نیاز وسیع و عریض سبز عظیم الشان پہاڑی سلسلے کے بچ پناک کی شرٹ پہنے سر پر بیلی کیپ رکھے دھیرے سے مسکراتا ہوا

وہ اس کے خوابوں کے گلابی شہزادے کا تاثر دے رہا تھا۔ کانی کا سب لیا وہ اب پہلے ہی کڑوی نہ تھی۔ اور ایک نظر ادھ کھلی وٹڈو کے اس پار بادلوں کی اوٹ میں چھپے چاند کی آنکھ چمونی کو بڑے محسوس کن انداز میں دیکھ کر لیپ ٹاپ اسکرین کی جانب دوبارہ نظریں مرکوز کی ہی تھیں کہ اچانک موبائل پر بجنے والی پیپ نے اس کی ساری توجہ اپنی جانب مرکوز کر والی۔ موبائل اسکرین لمحہ بھر کے لیے روشن ہوئی اور پھر بجھ گئی۔ گویا کسی کا میسج آیا تھا۔ اس کی ایک ہارٹ بیٹ مس ہوئی وہ بخوبی جانتی تھی رات کے اس پہر اس کے گلابی شہزادے کے علاوہ اور کوئی میسج نہیں کیا کرتا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل آن کیا اسکرین پر گلہان سکندر کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ گلہان کی طرف سے ایک empty میسج موصول ہوا تھا۔ جواباً اس نے بھی ان کی چاہتوں کی شدتوں میں لپٹا ہوا ایک بلینک ٹیکسٹ اس کے نمبر پر سینڈ کر دیا اور خود ماضی کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئی۔

”جب بھی میسج کروں میں ہی کروں، تم کبھی مجھے یاد نہیں کرتے۔“ وہ منہ پھیر کر کہتی ہوئی شکوہ کر گئی۔

”آہ ثانی! یہ الزام ہے مجھ غریب بندہ ناچنر پر۔ سراسر الزام۔“ وہ شوخ لہجے میں بولا تھا جو سروش درانی سے جہاں ملاقات پر اس نے اپنایا تھا اور وہ یہ بات تسلیم کرتا تھا کہ اس کی کھوئی ہوئی مسکان کا واپس آنا اور روٹھی ہوئی شوخیوں کا لوٹ آنا سروش ہی کی مرہون منت تھا۔

”روز میں آپ کو اتنے میسج کرتا تو ہوں۔“

”میسج نہیں بلینک میسج۔“ اس نے بات کاٹ کر فوراً تصحیح کی تھی۔

”چلیں بلینک میسج ہی، پر کرتا تو ہوں ناں۔“ اس کے چہرے پر اب بھی ایک جاندار مسکان موجود تھی۔

”مسٹر گلہان سکندر میں ان بلینک میسج کا کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

”ثانی! آپ جانتی ہو میں بلینک میسج کب کرتا ہوں؟“ اس نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو جواباً سروش نے فوراً تھی میں گردن ہلا دی۔

”جب مجھے کوئی حد سے زیادہ یاد آتا ہے تو میں اسے empty میسج کر دیتا ہوں آئندہ آپ یہ مت سوچئے گا کہ میں آپ کو یاد نہیں کرتا اور میرے ٹیکسٹ کو محض کو من بلینک ٹیکسٹ مت سمجھا کریں۔ ان میں میرے احساسات چھپے ہوتے ہیں وہ احساسات جنہیں میں کہنے سے اکثر کتراتا ہوں۔“ اس کی باروہ تھوڑا آچیدہ تھا۔

”تم احمق رہو گے۔“ وہ ساری کھلی بھلاہٹ کی۔

”اور آپ اس احمق کو یونہی فالو کرتی رہے گا۔“ وہ مسکرایا۔

وہ بھی اس کی اہٹارٹل لاجبک پر دل کھول کر مسکراتی چلی گئی۔ وہ عجیب تھا اور عجیب لوگ کبھی نارٹل نہیں ہو سکتے۔ اس نے دل میں سوچا تھا۔

وہ اب بھی ماضی کی پٹاری میں موجود یاد کے اوراق پٹی رہتی اگر میسج بیپ دوبارہ اس کی توجہ نہ دیتا۔ ایک بار پھر بلینک ٹیکسٹ موصول ہوا تھا۔ اس نے بھی غیر ارادی طور پر سینڈ کاٹن کلک کر دیا۔

سرد ہوا کے دھیمے جو جھونکے گالوں کو چھوتے ہوئے اس کے سیاہ گھنے گیسوؤں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ تو وہ وٹڈو بند کر کے لیپ ٹاپ اٹھا کر بیڈ پر چلی آئی۔

”کیا کر رہی ہیں؟“ گلہان سکندر کے مخصوص انداز میں لکھا گیا ایک اور ٹیکسٹ آن موجود ہوا۔

”تمہیں دیکھ رہی ہوں۔“ سروش نے نفیس بک پر ان کی ڈسپلے تصویر پر کلک کرتے ہوئے ٹائپ کیا۔ جہاں

وہ پنک لی ٹیٹ کے بجائے ہلکے پھری ٹیٹ میں لمبوں اور ڈسپلے کی لک دے رہا تھا۔

”مطلب کیسے؟“ ناہجی کے عالم میں لکھا گیا پیغام ملا۔

”فیس بک پر اور کیسے؟“ وہ بولی۔

”کون سی تصویر دیکھ رہی ہو۔“ اس کی جانب سے پوچھا گیا۔

”اینول ڈنروالی۔“ اس نے فوراً ٹائپ کیا۔

”مہرون ٹائی والی۔“ گلماں نے تصدیق چاہی۔

”نہیں ریڈ ٹائی والی۔“ اس نے فوراً سچ کی۔

”اتنے غور سے دیکھ رہی ہیں۔“ اس کا پیج موصول ہوا۔

”ند دیکھوں کیا۔“ سینڈ کرتے ہوئے لکھ بیٹھی۔

”اتنے غور سے مت دیکھا کریں۔“

”اب تصویر دیکھنے پر کیا اعتراض ہے تمہیں؟“

”میں نے ایسا کب کہا۔“

”گلز مت کرو میری نظر نہیں لگتی۔“

”وہ بات نہیں ہے آخر آپ کیوں نہیں سمجھتیں میری بات۔“ اس نے بے چارگی کے عالم میں ٹائپ کیا۔

”تو آپ سمجھ لیا کریں ناں میری بات۔“ وہ بے بسی سے لکھ پائی۔

”گڈ ٹائٹ لریڈی صبح یونی جانا ہے۔“

”اوکے گڈ ٹائٹ۔“ ناہجی سے کہتے ہوئے اس نے نگاہیں موڑ لیں وہ کبھی اس شخص کا دل جیت نہیں پائے

گی۔ دو ننھے موتی اس کی اداس ہوتی آنکھوں سے ٹوٹ کر نکلے اور نیکی کی تہہ میں جذب ہو گئے۔

☆.....☆

وہ بڑے سگن انداز میں فون اور فالٹز کے درمیان گھری بیٹھی تھیسس رپورٹ پر کام کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ

اپنی دلی کیفیت کے پیش نظر ایک اداس سی دھن سننے کے لیے اس نے کانوں میں ہینڈ فری بھی لگا رکھے تھے۔

مہرون کا کافی کنگ اس کے سامنے پڑا تھا۔ باہر بوند باندی وقفے وقفے بعد مسلسل جاری تھی۔

مسلسل کام کرنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں اور سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے

کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ دباتے ہوئے وہ کچھ دیر ستانے کی غرض سے کرسی کی پشت پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ نگاہیں

باہر برستی بارش کا احاطہ کرنے کو بے قرار ہوئیں تو دل ایک الگ ہی لے پر دھڑک اٹھا۔ وہ بادلوں کے سحر سے

آزاد ہوئی تو نظر لاشعوری طور پر سامنے پڑے کافی کنگ پر جا ٹھہریں۔ اس نے آگے بڑھ کر ہاتھ میں لے

لیا۔ جانے کتنی بار یہ کنگ اس نے اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوگا۔ جانے کتنی بار اس کے لبوں کے نشان اس کنگ پر

ثبت ہوئے ہوں گے۔

وہ مہرون کنگ اپنے قریب لاتے ہوئے گلماں سکندر کے لمس کو محسوس کرنے لگی۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

بالکل ان جذبوں کی طرح جو گلماں کے دل میں بے پناہ سلگنے کے بعد کسی راکھ کی مانند سرد پڑ چکے تھے۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں

لرزاں ہیں تیری آواز کے سائے

تیرے ہونٹوں کے سراپے..... ادا سی میں ڈوبی اقبال بانجی محسوس کن آواز کانوں کے راستے دل میں اتر کر

کہرام مچانے لگی تھی۔ آنسوؤں کا ریلا پلکوں کی باڑ توڑ کر بہنے کو بے قرار ہوا تو اس نے خود فریبی کے عالم میں نگاہیں موٹ لیں۔

”اوائے ہوئے چوری چوری چپکے چپکے یہ کس خوش نصیب کے دیدار کے جار ہے ہیں۔“ وہ لائبریری کے عقبی حصے میں موجود دو تین سیٹرز میں سے ایک پر بیٹھی قدرے اٹھاک سے موبائل اسکرین دیکھنے میں مگن تھی۔ جب گلہان اچھلتا ہوا کسی چھلاوے کی مانند اس کے سر پر آن مو جو ہوا۔

”دل نادان سنبھل جائے جو ہو دیدار رزم۔“ وہ شرارتی لہجہ لیے باقاعدہ گنگٹانے لگا تھا۔

”ہائے ٹانی کتنا پینڈ سم لگ رہا ہے ہوں آخر یک آئی ہے۔“

”اسماںل چیک کریں میری ہے ٹاکر اسماںل۔“ وہ سروش کے ہاتھ سے موبائل چھینتے ہوئے اسے بری طرح زچ کرنے لگا تھا۔

”بلاشبہ حسین لوگ کلر ہوا کرتے ہیں۔“ وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

”ہائے رہا مینوں نظر لگ جاوے ناں.....“ وہ چہکا۔

”ہوئیہ خوش فہم۔“ اس نے بے نیازی دکھلائی۔

”ٹانی آپ..... آپ حسد کر رہے ہیں۔“

”نہیں گلہان میں حسد نہیں کر رہی اور اگر آپ اسنے دیدار کا شرف حاصل کر چکے ہوں تو کاہینڈ لی میرا موبائل واپس کر دیں۔ میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔“ وہ پاس گھرے ٹوش سیٹے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہ واپس کروں تو؟“ موبائل اسکرین پر نظر س گاڑنے کی باری اب اس کی تھی۔

”اب اتنے بھی ”پارے افضل“ نہیں ہوتم بس کرو اپنا پاگل پن یہ نہ ہو خود کی ہی نظر لگ جائے جناب کو۔“

حسین لوگوں کی نظر بھی کلر ہوا کرتی ہے۔“ اس نے دوسری بار سوچا۔

”پہلے ایگری کریں آپ حسد تو نہیں کر رہیں؟“ وہ زندگی سے بھر پور مستعان لیے اسے ستار ہا تھا۔

”یوسا میر کریمٹل بنا اجازت کسی کا موبائل اسٹج کرنا جرم ہے اور بنا اجازت کسی کی پرسنل انفارمیشن کو دیکھنا اس سے بھی بڑا جرم۔“

”اور بنا اجازت کسی کی ایک کلک کرنا از در پھر چپ چاپ اسے سکتے ہی جانا سب سے بڑا جرم ہے۔“ وہ اس کی بات مانتے ہوئے اسی کے انداز میں بولا تھا۔

”گلہان سکندر تم کبھی نہیں سدھر سکتے۔“ وہ جان چھڑانے والے انداز میں کہتی ہوئی اپنا موبائل لے کر کلاس روم کی جانب چل دی۔

”مجھے سدھرنے سے ڈر لگتا ہے۔ سدھرنے کے لیے نارمل ہونا پڑتا ہے۔“ گلہان کی آواز نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

”سدھرنے کے لیے دل سے ارادہ باندھنا ضروری ہے اور دل جیسی چیز تو جیسے تمہارے سینے میں سرے سے ناپید ہے مسٹر گلہان سکندر۔“ وہ دانٹ پیس کر خود کلائی کرتے ہوئے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔

”پیار..... محبت میں اپنی زندگی سے ان دو چیزوں کی نشی کرتی ہوں۔ میں پیار نہیں کروں گی اور محبت..... محبت کا وجود تو میری زندگی میں، میرے دل میں، کبھی جنم بھی نہیں لے گا۔ میں عشق کروں گی جانتی ہو عشق روحوں کو ملا دیتا ہے۔ انسان کو اہر کر دیتا ہے اور مجھے تاریخ میں زندہ رہنا ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔“ اس نے عاتزہ کے کسی

سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک بار بڑے مضبوط لہجے میں کہتا تھا اور اس نے واقعی محبت نہیں کی وہ سیرجھا عشق کی طرف آئی تھی اور پھر واپس پلٹنا جیسے اس کے بس میں نہیں رہا تھا وہ ٹوٹ رہی تھی۔ عشق اسے لمحہ لمحہ امر کر رہا تھا۔ مضبوط بنا رہا تھا۔ عشق اسے صبر کرنا سکھا رہا تھا۔

”عشق نام ہے بے لگام جذباتی تڑپ کا جو کسی قاعدے کسی قانون کی پابند نہیں اس تڑپ کا تعلق محض وجدان سے ہوتا ہے۔ جب کہ انسانی شعور عشق کا قبول نہیں کیونکہ انسانی شعور اپنی عملی صورت میں کسی نہ کسی قاعدہ یا قانون کا پابند ہوتا ہے جب کہ عشق قواعد کا پابند نہیں۔“ وہ دل میں اٹھتے جذبات کو قلم کی نوک سے کورے کاغذ پر منتقل کر رہی تھی۔ صفحہ قرطاس پر اندرونی جذبات کو زبان ویتا اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکھا ایسے محبت یاد آئی۔ محبت کے ساتھ اسے اپنے ہاشل کا وقت یاد آیا جب وہ محبت نامی کسی جذبے سے قطعاً انجان تھی۔ جب اسے محبت دنیا کے فضول اور احمق ترین کاموں میں سے ایک کام لگا کرتی تھی۔

”میرا خیال ہے ہمیں اپنے مسٹر رائٹ کا انتظار کر لینا چاہیے۔ کیسے کھوکھلے اور بے وقعت تعلقات ہوتے ہیں یہ بالکل کسی اجاڑ میں ریت کے اس اکلوتے ٹیلے کی مانند جو اپنی پہچان بنائے رکھنے کی خاطر ریت کا ذرا ذرا خود نہیں پہنچتا ہے۔ مگر ہر احساس سے عاری بدگمانی کی ہلکی سی لہر کسی بڑے طوفان کی مانند آتی ہے اور سب تہس نہس کر کے خاک کر دیتی ہے یہ جانے بغیر ریت کے ان ذرات کو خود میں پروئے ہوئے اس ٹیلے کو جانے کتنا وقت لگا ہوگا۔“ اسے ہانیہ پر جھاڑی جانے والی اپنی فلاسفی بے اختیار یاد آئی۔ اپنے دل میں وہ بھی محبت کے جذبات ریت کے ان ننھے ذرات کی مانند کئی دنوں سے بیچ رہی تھی مگر بے اعتنائی کے طوفان نے ایک لمحے میں سب ملیا پیسٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

”سروش! تمہیں پتا ہے آج میں بہت ادا ہوں۔“ وہ تھکی ماندی یونیورسٹی سے ہاشل لوٹی تھی کہ ہانیہ کی روٹی روٹی آنکھوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر والی۔

”کیتا ہوا ہانی تم رو کیوں رہی ہو، ڈسٹرب ہو کسی وجہ سے؟“ اپنا بیگ الماری میں پینگ کرتے ہوئے اس نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا تھا۔

”لوگ اتنے بے مروت کیوں ہوتے ہیں؟“ اب وہ باقاعدہ ہچکیاں لینے لگی تھی۔
 ”کون لوگ؟“ اگلے ہی بل وہ اپنی ساری تھکان بھلا کر اس کے پاس آ بیٹھی۔
 ”شمال ظفر اور کون؟“ اس نے پانی پیتے ہوئے اپنے کلاس فیلو کا نام لیا۔

”اف..... میرے خدا تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی کیا ہوا شمال کو؟“ وہ ہانیہ اور شمال کے بیچ ڈریپ ہونے والی انڈر اسٹینڈنگ سے بخولی واقف تھی جسھی ذرا سنجیدگی سے بولی۔

”ہوا تو کچھ بھی نہیں بس اس نے صبح سے مجھ سے بات نہیں کی کلاس میں بھی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بڑی رہا اور اب بھی وہ میرے میسجرو کا جواب نہیں دے رہا حالانکہ میں بک پر وہ دیکھنے دو گھنٹے سے آن لائن ہے۔“
 معصومیت سے کہتے ہوئے وہ مزید ٹسو سے بہانے لگی۔

”ڈونٹ ٹیل می تم اس قدر معمولی بات پر رو رہی ہو۔“ اسے ذہنی شاک لگا تھا۔
 ”میرے لیے یہ معمولی بات نہیں ہے۔“ وہ مزید سسکی۔

”لسن۔ تمہاری مام اسپین گئی ہیں ذرا یاد کر کے بتاؤ لاسٹ ٹائم تم نے ان سے کب بات کی تھی۔“ وہ اس کا ذہن بٹانے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

”یہی کوئی سات آٹھ دن پہلے۔ ہانیہ نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔
 ”واہ کیا بات ہے ہماری بیگ جزیشن کی ماں باپ سے بات کیے بنا کئی کئی دن گزار دیتے ہیں مگر کوئی آنکھ نہیں ٹپکتی کوئی فرق نہیں پڑتا، کوئی دل اداس نہیں ہوتا، فرق پڑتا ہے جب شامل ظفر بات نہیں کرتا، آنسو بہائے جاتے ہیں کیونکہ شامل ظفر کا میسج نہیں آتا، دل ٹمکن رہتا ہے، وجہ شامل ظفر نے لفٹ نہیں کروائی۔ تم نے اپنی ماں سے بات کیے بنا سکون سے آٹھ دن گزار دیئے اور شامل ظفر کے بغیر دو گھنٹے گزارنا تمہارے لیے مشکل ہو رہا ہے۔
 Hats off مس ہانیہ رائے۔“ وہ تالیاں بجاتے ہوئے طنز یہ انداز میں مسکرائی۔
 ”دو گھنٹے نہیں آٹھ گھنٹے۔“ اس کے طویل ترین پچھر میں سے یہی ایک بات ہانیہ کے پلے پڑی تھی۔
 ”واٹ ایور۔“ وہ مسکائی جیسے اسے کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔

”ہاں ہاں اڑ الو میرا مذاق جب خود پر بیتے گی تو لگ پتا جائے گا۔ پھر میں دیکھوں گی تم کیسے مسکراتی ہو۔“ وہ
 پل بھر میں مشتعل ہوئی تھی۔

”اس کی نوبت نہیں آئے گی سویٹ ہارٹ کیونکہ میرے فیاضی شامل ظفر سے کہیں زیادہ رسپانسیبل اور کیرنگ ہیں۔“
 ”نو واٹ سروش! میری ہزار خواہشوں میں سے ایک بڑی خواہش یہ بھی ہے کہ میں تم جیسی بے حس لڑکی کو
 محبت میں مبتلا دیکھوں۔“

”مجھے افسوس رہے گا تمہاری ایک بڑی خواہش کے ہمیشہ ادھورا رہ جانے کا۔“ وہ اب اس محبت ناپے سے
 رنج ہونے لگی تھی۔ جیسی مزید کچھ کہے بنا چپ سادھی مگر زندگی کے اس موڑ پر وہ ہانیہ رائے سے ملنا چاہتی تھی۔
 وہ اسے بتلانا چاہتی تھی۔

”لو دیکھ لو ہاؤ خدا نے تمہاری ایک بڑی خواہش پوری کر دی لو دیکھو میں بھی مریض بن گئی۔ چلو اب مل کر
 اس مرض کی دوا ڈھونڈتے ہیں۔“

”چلو تانی دور چلتے ہیں۔“ وہ ہاتھ میں قلم تھا مے گلماں کی زبانی اس کے پچھلے ایڈ ونچر دیوسائی تک کے سفر کو
 پیپر پر اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو اسے اپنی ویب سائٹ پر پوسٹ کرنا تھا کہ اس کی فرمائش پر اچانک
 چونک اٹھی۔

”کہاں؟“ اس نے فولڈر پر جھکا کر اوپر اٹھایا۔

”خواب مگر۔“ وہ کھویا کھویا سا بولا۔

”کدھر۔“ اس نے تفتیش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”پہاڑوں پر۔“ اس نے زیر لب کہا۔

”وہ خوفناک ہوتے ہیں۔“ وہ سبھی۔

”ہر دل نشین چیز دل دہلا دینے والی ہوتی ہے۔“ اس نے حقیقت واضح کی۔

”تم احمق ہو۔“ اس کی بے لگی بات پر اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”آپ اس احمق کا ساتھ دیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اسے اپنا ساتھ دینے پر مہم ہوا۔

”میں نہیں جاسکتی۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

”میں بے سنٹ کر دیتا ہوں فروری میں سوات میں اسٹوڈیو ہورہا ہے ہم سب جا رہے ہیں تو آپ بھی

جاری ہیں۔“ نزاخہ دلی سے آفر کی گئی۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ وہی ووٹوںک انداز۔

”لیکن کیوں؟“ اس نے احتجاج کیا۔

”کس کمپنی کے ساتھ جا رہے ہو؟“ وہ الٹا سراپا سوال بنی۔

”ڈریم ایڈونچر سرکل کے ساتھ۔“ اس نے مختصر آبتایا۔

”میں فری میں بھی جاسکتی ہوں۔“ وہ ایک دم جھکی تھی۔

”اچھا مذاق ہے۔“ گلہان طنزیہ مسکرایا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں اس کمپنی کے سارے Contacts و ساری ایڈز میں راءٹ کرتی ہوں وہ مجھے کئی بار آفر کر چکے ہیں پر میں نہیں جانا چاہتی کسی وجہ سے۔“ وہ کھوئی۔

”کس وجہ سے؟“ وہ متوجہ ہوا۔

”وہ ایک سیکرٹ ہے۔“

”ہاں ثانی.....! اب مجھ سے بھی سیکرٹ.....!“ اس نے ابرو اچکا کر مشتاق لہجے میں پوچھا۔

”گلی گلہان! اب آپ سے بھی سیکرٹ۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”یاد رکھئے گا یہ بات سیدھا دل پر لگی ہے۔“ وہ شوخ ہوا۔

”یاد رکھئے کو تیری یاد ہی کافی ہے۔“ وہ منہ بکا امنہ میں بڑبڑائی۔

”کیا کہا؟“ وہ چونکا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

”کچھ کہا ہے آپ نے ثانی؟“ وہ کریدنے لگا۔

”نہیں گلہان میں تو بولی بھی نہیں۔“ اس نے سرے سے گلہان کی بات کو جھٹلایا۔

”آپ یہ کہنا چاہ رہے ہو میرے کان بجتے ہیں ثانی یہ امید نہیں تھی مجھے آپ سے۔“ وہ بنا کچھ کہے رسائیت سے مسکراتی چلی گئی۔

”مطلب سچ میں میرے کان بج رہے ہیں۔“ اس کی جھرنے کی مانند بہتی ہنسی کو دل میں اتارتے ہوئے گلہان نے تصدیق چاہی تھی۔

”او کے ثانی چلتا ہوں ملتے ہیں پھر ایک ہفتے کے بعد۔“ وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا کہا ایک ہفتہ، مطلب سات دن پھر سے آف ابھی تو پچھلے ہفتے کا لام سے لوٹے ہو اٹینڈنس شارٹ ہو جائے گی تمہاری، یوں نہ ہو ایڈونچر کے چکر میں یوتی سے اسٹک آؤٹ ہونے کا ایڈونچر ہو جائے تمہارے ساتھ۔“ وہ اسے پرسوج اور گہری نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”ارے نہیں ہوئی اٹینڈنس شارٹ، میں نے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ سے بات کی ہوئی ہے او کے میں چلتا ہوں اپنا خیال رکھیے گا۔“ وہ رکنے والوں میں سے کب تھا اور وہ بھی اس کے کہنے پر جو اس کی زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

”امان اللہ گلہان۔“ اس نے او اس لہجے میں کہا۔

”امان اللہ ثانی۔“ وہ مڑے بنا کہتا ہوا اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہوا اور وہ نوٹ پیڈ کھول کر بیٹھ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ)

اعترافِ حبیبت

ساختمسکرا دیا، اریشہ نے سب کو مشترکہ سلام کیا اور خالدہ بیگم یعنی عفان کی امی سے پیار لینے کے لئے سر جھکا دیا اور وہیں یعنی کے ساتھ بیٹھ گئی کہ مہمان نوازی

جیسے ہی اریشہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ کر اس کے چہرے پر بے زاری چھا گئی جسے سامنے بیٹھے عفان نے بھی محسوس کیا اور بے



جاہل بندر کہیں کا جب تک سامنے رہو تب
تک گھورنا ہی نہیں بند کرتا جیسے آنکھوں سے ہی نکل
لے گا ہونہہ کیڑے بدلتے وقت وہ مسلسل بڑ بڑا
رہی تھی وہ چیخ کر کے باہر آئی تو وہاں عینی موجود تھی۔
”ارشی امی کہہ رہی ہیں کہ آ کے کھانے کا کچھا انتظام کرو۔“
”افوہ بھئی ابھی تو میں آئی ہوں کالج سے تھکی
ہوئی اور اب کچن میں سرکھپانے چلی جاؤں۔“ اریشہ
نے غصے سے جواب دیا۔

”مجھے تو امی نے کہا تو میں بتانے آئی ہوں تم مجھ پر
کیوں غصہ ہو رہی ہو؟“ عینی نے حیرت سے پوچھا۔
”اچھا اچھا آتی ہوں تم جاؤ۔“ عینی کے جانے کے

ہی تو نبھانی ہی تھی۔
”کیسی ہو بیٹا؟“ خالدہ بیگم نے پوچھا۔
”جی میں ٹھیک ہوں آئی! آپ سنا میں؟“
”میں بھی ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کے جواب دیا۔
”کالج سے آ رہی ہو؟“
”جی آئی! بس کچھ نوٹس لینے گئی تھی آج۔“
انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جتنی دیر وہاں
بیٹھی رہی تب تک مسلسل اپنے چہرے پر عفان کی
نگاہوں کو مرکوز پایا۔
”میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔“ وہ سب سے
معذرت کرتے ہوئے اپنے روم میں آ گئی۔



”اب اس نواب زاوی کو بھیجے گا کیا فائدہ جب سب کچھ تیار ہو گیا ہے ایک تو روز ہی کوئی نہ کوئی منہ اٹھا کر آ جاتا ہے اور ساری مصیبت میری سر پہ آ جاتی ہے۔“ وہ روٹیاں بناتے ہوئے بڑ بڑا رہی تھی۔ کھانا لگا تو سب کھانے میں مصروف ہو گئے کھانے کے دوران بھی عفتان اریشہ کو دیکھ کر مسکراتا رہا۔

”اف اگر مجھے ایک خون معاف ہوتا تو میں اس بندے کو کب کا قتل کر چکی ہوتی۔“ اس نے جل کر دل میں سوچا۔ کھانا کھانے کے بعد عفتان سب کے لئے چائے بنانے چلی گئی تو وہ بھی پڑھائی کا بہانہ بنا کر اپنے روم میں چلی گئی۔ چائے پینے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے لیکن آخری وقت تک عفتان کی نگاہیں بے نیکی سے اریشہ کا انتظار کرتی رہیں۔

☆☆☆☆

حیات صاحب اور رابعہ بیگم کی تین اولادیں تھیں پہلے نمبر پر بیٹا خضر حیات جس نے ایم بی اے کرنے کے بعد بزنس شروع کر دیا تھا پچھلے سال اس کی شادی سارہ سے کر دی گئی اس کے بعد دوسرے نمبر پر اریشہ حیات جو ایم اے کے آخری سال میں تھی تیسرے نمبر پر علیہ حیات جو گھر میں سب سے چھوٹی تھی اور بی ایس سی کے آخری سال میں تھی لیکن ان تینوں بچوں میں اریشہ سب سے زیادہ ضدی تھی اور حیات صاحب کے قریب بھی حیات صاحب نرم خو طبیعت کے مالک تھے جب کہ رابعہ بیگم تھوڑے سخت مزاج کی تھیں اور بچوں پر ان کا رعب بھی بہت تھا اریشہ کو عفتان کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے سخت چڑھی اسے دیکھتے ہی اس کے منہ کے زاویے بگڑنے لگتے اور یہی بات عفتان کو مزہ دیتی۔ عفتان سارہ کا بھائی تھا خالدہ بیگم کی دوہی اولادیں تھیں بڑی بیٹی سارہ جو اریشہ کی بھابی تھی اور پھر ایک بیٹا عفتان خالدہ بیگم کے شوہر حیات نہیں تھے اس لئے سارا بزنس عفتان ہی سنبھالتا لیکن اس کے مزاج میں بہت شوخی تھی سارہ کی شادی

بعد وہ بھی بچن میں آ گئی وہ سلاؤ دکاٹ رہی تھی جب عفتان بچن میں داخل ہوا اسے دیکھ کر بھی اریشہ انجان بنی رہی۔

”ایک گلاس پانی ملے گا پلیز۔“ اریشہ نے کچھ بھی کہے بغیر فریج میں سے پانی نکال کر گلاس میں ڈال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”بھینکس۔“ عفتان نے شکرے کے ساتھ گلاس پکڑ لیا اور گلاس پکڑتے وقت اس کا ہاتھ اریشہ کے ہاتھ سے مس ہو گیا وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”لو فرہیں گا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑ بڑائی۔

”کچھ کہا مجھ سے۔“ عفتان نے مسکرا کر پوچھا۔

”جی نہیں۔“

”اسٹریسی کیسی جا رہی ہے؟“ دوسرا سوال۔

”اچھی“ اریشہ نے بے زاری سے جواب دیا اسے عفتان کا یہاں کھڑا ہونا کوفت میں مبتلا کر رہا تھا لیکن مقابل بھی ڈھیٹ تھا اس کی بے زاری کا کوئی ٹوٹن نہیں لیا۔

”اریشہ! یہ مجھے دیکھ کر ہی تمہارا منہ ایسا ہو جاتا ہے یا ہر وقت ہی چہرے پہ بارہ بجے رہتے ہیں۔“ عفتان نے بے تکلفی سے اسے چھیڑا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اریشہ نے توری پنہا کر پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کہ وہ اچھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رابعہ بیگم بچن میں داخل ہوئیں۔“

”ارے عفتان بیٹا! تم یہاں کیا کر رہے ہو آ جاؤ باہر بس کھانا لگنے ہی والا ہے۔“

”جی آئی! بس آ رہا ہوں میں بس پانی پینے آیا تھا۔“ وہ وضاحت دیتے ہوئے باہر چلا گیا تو رابعہ بیگم اریشہ کی طرف مڑیں۔

”بیٹا تیار ہو گیا سب کچھ؟“

”جی ای! بس یہ تھوڑی سی روٹیاں پکنے والی رہ گئی ہیں باقی سب کچھ تیار ہے۔“ تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

”اچھا چلو میں عفتان کو بھیجتی ہوں تم لوگ جلدی سے کھانا لگا دو۔“ وہ اسے آ رڈ روٹے کر چلی گئیں۔

میں اس نے اریشہ کو روک لیا اور دیکھتا ہی رہ گیا اس کی بات نہیں تھی کہ اس نے آج تک کہیں حسن نہیں دیکھا بلکہ اس کی تو بہت سی لڑکیوں سے دوستی رہ چکی تھی لیکن اریشہ کے چہرے سے یہ جو معصومیت تھی وہ اس نے آج سے پہلے کہیں نہ دیکھی تھی وہ اریشہ کو پسند کرتا تھا اور کب یہ پسندیدگی پیار میں بدل گئی اسے خود بھی بتانا چلا اریشہ عرفان کو ایک فلرٹ قسم کا لڑکا سمجھتی اور اسی وجہ سے وہ عرفان کو زیادہ لفٹ نہ کرواتی تھی۔

☆☆☆☆

جیسے ہی اریشہ کو خالدہ بیگم اور عرفان کے آنے کا مقصد پتا چلا وہ غصے میں رابعہ بیگم کے سر پر پہنچ گئی۔

”ای! یہ میں کیا سن رہی ہوں کہ خالدہ آئی میرے لئے عرفان کا رشتہ لے کر آئیں تھیں۔ اریشہ نے غصے سے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک سنا ہے اور تمہارے ابو ایک دو دن تک انہیں ہاں بھی کہنے والے ہیں۔ انہوں نے کون سے جواب دیا۔

”کیا؟“ وہ زور سے چلائی۔

”ایسے کیسے ہاں کہنے والے ہیں آپ لوگ مجھ سے پوچھے بغیر میری پوری زندگی کا فیصلہ میری مرضی کے بغیر کر رہے ہیں۔ اریشہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا؟“ انہوں نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

”جی ہاں ایک تو میری پڑھائی مکمل نہیں ہوئی اور ویسے بھی مجھے عرفان پسند نہیں ہے۔“

”رہے دو بی بی یہ پڑھائی کے چونچلے بس بہت پڑھ لیا تم نے عمر تمہاری گلی جا رہی ہے اور کیا برائی ہے عرفان میں۔“ انہوں نے ایک ہی سانس میں اسے اچھی خاصی ڈانٹ پلا دی۔

”لازی نہیں کہ کسی میں کوئی برائی ہو اسی لئے اسے ناپسند کیا جائے بس ویسے ہی مجھے عرفان پسند نہیں ہے اور مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔“ آخر

میں وہ رو ہانسی ہو کر بولی کہ یہ اصل وجہ تو وہ بتا نہیں سکتی تھی ورنہ اور کلاس لگ جانی تھی۔

”فضول مت بکوا چھٹا بھلا لڑکا ہے عرفان ہماری تو کب سے ہی خواہش تھی کہ تمہاری شادی اس سے ہواتا قابل شریف بچہ ہے بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا رشتہ مل گیا ہے اور تم شکر کرنے کے بجائے ناشکری کر رہی ہو۔“ رابعہ بیگم نے ڈپٹ کے کہا۔

”لیکن امی“ اریشہ نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا کہ رابعہ بیگم نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

”بس اب میں ایک لفظ بھی اور نہ سنوں تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے ہم یہ اتنا اچھا رشتہ نہیں ٹھکرا سکتے تمہاری شادی عرفان سے ہی ہوگی میں نے کہہ دیا بس۔“ رابعہ بیگم حتی انداز میں کہہ کر وہاں سے چلی گئیں۔ یعنی جو کب سے وہاں کھڑی تھی رابعہ بیگم کے جانے کے بعد اریشہ کے پاس آ گئی۔

”یعنی! تم ہی امی کو سمجھا دنا وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں مجھے عرفان پسند نہیں ہے تم نے کبھی اس کی حرکتیں دیکھی ہیں یہ نہیں تم لوگوں کو یہ سب کچھ نظر کیوں نہیں آتا بس مجھے نہیں کرنی اس سے شادی۔“ آخر میں وہ رو دی۔

”ارشی میرے خیال سے امی ٹھیک کہہ رہی ہیں تم فضول اعتراض کر رہی ہو عرفان بھائی ہر لحاظ سے اچھے ہیں اور“ وہ اچھی بول ہی رہی تھی کہ اریشہ اس کی بات کاٹ کر چلائی۔

”بکواس نہ کرو اگر وہ اتنا ہی اچھا ہے تو تم کر لو اس سے شادی سمجھیں تم ہونہہ“ وہ غصے میں روتے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور یعنی تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆☆

ایک دن لگاتار روتے ہوئے اور کھانا کھائے بغیر احتجاجاً اپنے روم میں بند رہنے کے بعد اچانک اسے اٹنے بھوکے ہونے کا احساس ہوا تو یاد آیا کہ اس نے کل سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا۔

”جیون یا مروں، جہاں کس کا میری کوئی پروا نہیں

تہہارت سے خوبصورت منہ سے پھول کیوں چھڑنے لگتے ہیں۔“ عفتان نے طنز کیا۔

”عفتان! تم بتا رہے ہو یا نہیں؟“

”ٹھیک ہے تم بتاؤ کب ملنا ہے میں آ جاؤں گا؟“

”کل بارہ بجے میرے کالج آ جانا میں تمہیں

گیٹ پر ہی ملوں گی۔“ اسے ملنے کا بتا کر وہ کچھ سوچ کے اپنے روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆☆

اگلے دن جیسے ہی وہ کالج سے باہر آئی تو عفتان کو انتظار کرتے پایا اس کو دیکھتے ہی عفتان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”سوری مجھے تھوڑی دیر ہوگئی۔“ اس کے پاس

پہنچ کر ایشہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں مجھے تمہارا انتظار کرنا اچھا لگتا

ہے۔“ جواباً ایشہ نے اس کو گھورا اور دروازہ کھول کر

کار میں بیٹھ گئی تو عفتان بھی مسکراتے ہوئے دوسری

طرف آ کر بیٹھ گیا۔

”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”تو کیا خاص بات تھی جو آپ نے مجھ غریب کو

یاد کیا؟“ عفتان نے خاص پر زور دے کر کہا۔

”بتاتی ہوں پہلے کسی ایسی جگہ چلو جہاں ہم سنگون

سے بیٹھ کر بات کر سکیں۔“ عفتان نے سر ہلایا اور گاڑی

آگے بڑھا دی کچھ دیر بعد گاڑی ایک ریسٹورنٹ

کے سامنے روکی۔

”کیا لوگی؟“ جب ویٹر آرڈر لینے آیا تو عفتان

نے ایشہ سے پوچھا۔

”مینگو جوس۔“ عفتان نے ویٹر کو دو مینگو جوس

لانے کا آرڈر دیا کچھ دیر بعد وہ جوس کے گلاس ان

کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔

”ہوں اب بتاؤ۔“ عفتان نے جوس کاسٹ لیتے ہوئے کہا۔

”عفتان مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔“ اس

نے۔“ اس نے چل کے دل میں سوچا اور اٹھ کر چل گیا۔ آگئی کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو اپنے لئے نوڈلز بنا کر لاؤنج میں آگئی حیات صاحب اور خضر اس وقت آفس میں ہوتے تھے یعنی ابھی کالج سے نہیں لوٹی تھی رابعہ بیگم اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں اور سارہ کے ہاں ویسے بھی ننھا مہمان آنے والا تھا سو وہ بھی اپنے کمرے میں تھی۔

”مجھے عفتان سے اس بارے میں خود ہی بات

کرنی چاہئے شاید ایسے کوئی حل نکل آئے۔“ اور اٹھ

کرفون کے پاس آگئی اور عفتان کا نمبر ڈائل کرنے لگی

تیسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

”ہیلو۔“

”السلام علیکم! میں ایشہ بول رہی ہوں۔“ عفتان

قدرے خیران ہوا۔

”وعلیکم السلام! ارے واہ آج تو ہمارے نصیب

جاگ اٹھے مس ایشہ نے خود میں یاد کیا۔“ مسکرا کر کہا۔

”ہوں کچھ بات کرنی ہے تم سے بڑی تو نہیں ہو۔“

”ارے نہیں نہیں تمہارے لئے تو میں ہر وقت فری ہی

فری ہوں۔“ عفتان نے خوش دلی سے کہا ایشہ جل گئی۔

”میرے لئے ہی نہیں غالباً کبھی لڑکیوں کے

لئے تم فری رہتے ہو۔“

”ہا ہا ہا نہیں تم سب سے خاص ہو۔“ وہ خاص پر

زور دے کر بولا۔

”ہونہہ بہر حال مجھے تم سے ملنا ہے۔“

”کوئی خاص بات؟“

”ہاں۔“

”ہوں ہولو۔“

”ابھی نہیں مل کے بتاؤں گی۔“

”ایسی کیا بات ہوگئی یار! جو ملنے کی اتنی جلدی پڑگئی

ہے۔“ عفتان نے مسکراتے ہوئے چھیڑا ایشہ جھنجھلا گئی۔

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں تم بتاؤ مل

رہے ہو یا نہیں؟“

”ایک بات بتاؤ کہ مجھ سے بات کرتے وقت

ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔

”دیکھو ایشہ! میں مانتا ہوں کہ بہت سی لڑکیوں سے میری دوستی رہ چکی ہے لیکن وہ سب بہت معمولی نوعیت کا تھا میں کبھی بھی کسی کے ساتھ سیریس نہیں ہوا لیکن تمہارے معاملے میں بالکل سنجیدہ ہوں تم یقین کرو کہ میں“

”بس بہت ہو گیا۔“ وہ ابھی بول ہی رہا تھا کہ ایشہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں یہاں یہ سب کچھ سننے نہیں آئی تم مجھے سیدھے سیدھے بتاؤ کہ تم اس شادی سے انکار کر رہے ہو یا نہیں۔“ تیز لہجے میں پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔“ عفتان نے کھلی ابراز میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تمہیں بہت شوق ہے نا مجھ سے شادی کرنے کا تو سن لو مجھ سے شادی کے بعد تم کسی بھی خوش انداز لڑکے پھر نہ کہنا کہ بتایا نہیں۔“ غصے میں کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑی اور ابھی ایک قدم ہی چلی گئی کہ اس کا پاؤں لڑکھا گیا اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہوئی عفتان نے فوراً ہی اٹھ کر اسے سہارا دیا۔ اس کی اتنی قربت پہ ایک پلن گئے لئے ایشہ کی دھڑکن اٹھل پھل ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گئی اور خود کو سرزنش کرتی ہوئی اس کی بانہوں سے لگی اور باہر چلی گئی۔

”تم ایک دفعہ آؤ تو سہمی میں نے بھی تمہیں سیدھا نہ کر دیا تو میرا نام بھی عفتان نہیں۔“ اس نے زیر لب کہا اور مسکرا کر پیسے میز پر رکھ کر گنگناتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆☆

ان کے جانے کے بعد ایشہ پیر پینتی ہوئی کپڑے بدلنے چلی گئی جب وہ چھینچ کر کے باہر نکلی تو عفتان نے اس کے چہرے پر ہلکا سا میک اپ کر دیا۔

”واؤ بار ایشہ سے آج تو تم غضب ڈھا رہی ہو مجھے تو لگتا ہے کہ عفتان بڑی ہی مہربانی دیکھتے ہی مگنی

نے سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا“ اس نے اچھا کو کافی لمبا کھینچا جیسے اسے اسی بات کی توقع تھی۔

”میں سنجیدہ ہوں عفتان۔“ ایشہ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

”تو میں نے کب کہا کہ آپ مذاق کر رہی ہیں ایشہ۔“ عفتان نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

”تو پھر تم انکار کرو۔“ وہ آرام سے بولا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی نا۔“

”تم نہیں کرنا چاہتی تو تم انکار کرو میں تو تم ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو میں کیوں انکار کروں۔“ اس نے چہرہ ہاتھوں پہ لگا کر اسے دیکھا۔

”کیا تھا انکار لیکن کوئی میری بات نہیں مانتا۔“ ایشہ نے بے بسی سے جواب دیا۔

”تو یہ تمہارا مسئلہ ہے سوری میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ اس نے کورا جواب دیا تو ایشہ تھکے لہجے میں بولی۔

”تو کیا تم ایسی لڑکی سے شادی کر لو گے جو تمہیں پسند ہی نہیں کرتی۔“

”تم مجھے پسند نہیں کرتیں لیکن میں تو تمہیں پسند کرتا ہوں نا اور پسند ہی کیا میں تو تم سے بہت محبت بھی کرتا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

”لیکن میں تم سے محبت نہیں کرتی نا۔“ وہ دھینے لہجے میں چلائی۔

”نو پرابلم ایک نا ایک دن ضرور کرنے لگو گی مجھے یقین ہے۔“ عفتان نے پر یقین لہجے میں کہا۔

”ہونہہ خوش نہیں۔“ ایشہ نے مسخراڑایا۔

”کتنی لڑکیوں سے یہ ڈائلاگ بول چکے ہو عفتان۔“ اس نے تھکے لہجے میں پوچھا۔

ایک پل کے لئے عفتان پر سنبھلا ہٹ، طاری

جائیں اور اب تو یہ ویسے بھی ہمارے پاس آپ کی امانت ہے۔ حیات صاحب نے اریشہ کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے اگلے مہینے کی چار یا پانچ کو یعنی کہ ٹھیک ایک مہینے بعد شادی کی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔“

”ارے یہ تو بہت جلدی ہے اتنے کم وقت میں ہم اتنی ساری تیاری کیسے مکمل کریں گے۔“ رابعہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

”تیاری کیسی بھابی! ہمیں اپنی بہو کے سوا کچھ نہیں چاہئے بس اب آپ لوگ کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔“ خالدہ بیگم کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”لیکن“

”لیکن ویکن چھوڑیں بھابی! سارہ کے جانے کے بعد ویسے بھی میں بہت اکیلی ہوئی ہوں اب مجھ سے اور زیادہ عرصہ تنہا نہیں رہا جاتا آپ پلیز کوئی اعتراض نہ کریں میں اریشہ کو اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی۔“

”چلیں ٹھیک ہے پھر جیسے آپ کی مرضی۔“

بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان کے جانے تک اریشہ مجسمہ بنی رہی لیکن ان کے جاتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی اور بیڈ پر اوندھی لیٹ کر بے بسی سے روئے لگی۔

☆☆☆☆

دونوں طرف ہی شادی کی تیاریاں شروع پر تھیں؛ خالدہ بیگم کے گھر کی یہ آخری شادی تھی سو وہ اپنے سارے اربان نکال رہی تھیں؛ حیات ولا کی تیاری بھی دیکھنے لائق تھی؛ لیکن اریشہ نے ایک بھی چیز خود جا کر نہ خریدی رابعہ بیگم نے کتنی بار اسے ساتھ چلنے کو کہا مگر ہمیشہ ہی وہ انکار کر دیتی۔

”اب وہ کچھ نہیں تو شادی کا جوڑا تو کم سے کم اپنی پسند سے خرید لو بیٹا اپنی رائے تو دو۔“ کپڑوں کے حوالے سے تقریباً ساری تیاری مکمل ہو چکی تھی بس ایک شادی والا لہون کا جوڑا باقی رہ گیا تھا۔

کی بجائے نکاح ہی کر ڈالیں گے۔“ عینی نے مسکراتے ہوئے چھیڑا تو جواباً اریشہ نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

”اچھا بابا سوری اب چلو اس سے پہلے کہ ای پھر سے آ جائیں۔“ عینی اس کو اپنے ہمراہ ڈرائنگ روم میں لے آئی جہاں سب لوگ براجمان تھے جیسے ہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی خالدہ بیگم اپنی جگہ سے اٹھیں اور اسے خود سے لپٹا کر ڈھیر سارا پیار کیا اور اپنے پاس ہی بٹھالیا؛ عفان نے اسے دیکھا تو گویا نگاہیں بٹانٹا ہی بھول گیا۔

”آہم آہم“ سارہ نے گلا کھنکارا تو وہ نجل سا ہو کر مسکرائے لگا۔

”ماشاہ اللہ بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔“ خالدہ بیگم نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔

”بھابی! اجازت ہو تو ہم اپنی بہو کو انگوشی پہناویں۔“ انہوں نے اجازت چاہی۔

”جی ضرور۔“ رابعہ بیگم نے خوش ولی سے کہا۔

”عفان بیٹا! ادھر آؤ ذرا۔“ انہوں نے عفان کو بلایا اور اسے اریشہ کے پہلو میں بٹھا دیا اور انگوشی عفان کے ہاتھ میں تھماوی یعنی تھویریں کھینچنے کا کام سرانجام دینے لگی۔ عفان نے انگوشی اریشہ کے نازک سے خوبصورت ہاتھ میں پہناوی۔ رابعہ بیگم نے اریشہ کو انگوشی تھمائی تو اس نے بھی عفان کے ہاتھ میں پہنا

وی خالدہ بیگم نے اسے مٹھائی کھلا کر اس کا ماتھا چوما اور سب لوگ آپس میں مبارکباد دینے لگے۔

”بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔“ عفان نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی اور ہولے سے اس کا ہاتھ وبا کر خضر سے ملنے کے لئے اٹھ گیا۔ اریشہ کلس کر رہ گئی۔

”حیات بھائی اور بھابی اب بتائیں کہ ہم اپنی بیٹی کو کب ہمیشہ کے لئے اپنے گھر لے کر ج آئے گے؟“

خالدہ بیگم نے اریشہ کو ساتھ لگاتے ہوئے پوچھا۔

”اب تو یہ آپ کی ہی بیٹی ہے جب چاہیں لے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



احساس ہونے پہ کہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنا گھر چھوڑ رہی ہے تو اس نے جو رونا شروع کیا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا، خالدہ بیگم نے آگے بڑھ کر اسے تھاما اور وہ سب سے ملتی ہوئی عفان کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ یہاں نئے سرے سے رسموں کا طویل سلسلہ شروع ہوا تو بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اڑ گئی۔ سارہ بھی ان کے ساتھ ہی یہاں آئی تھی، آخر سارہ کو ہی اس پر ترس آیا تو وہ اسے عفان کے کمرے میں لے آئی، کمرے کی سجاوٹ دیکھنے لائق تھی پر اسے کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔ سارہ نے اسے بیڈ پہ بٹھایا اور اس کا ایک سوٹ نکال کر ہینگ کر دیا۔

”جب چیخ کرنا ہوا تو یہ کپڑے پہن لینا اریشہ اب میں چلتی ہوں باہر تمہارے بھائی انتظار کر رہے ہوں گے“۔ وہ اس کا گال تھپتھا کر چلی گئیں۔ سارہ کے جانے کے بعد بھی وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔ پھر اچانک ایک خیال آنے پر وہ فوراً کپڑے سنبھالتے ہوئے بیڈ سے اتری اور ہینگ کیا ہوا جوڑا لے کر واش روم میں گھسی گئی، چیخ کرنے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹی اور اپنے اوپر کبل ڈال لیا۔

”مسٹر عفان! اب تمہیں جتا حلے گا کہ کس سے پالا پڑا ہے“۔ اس نے سوچا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆☆

عفان اپنے دوستوں سے بمشکل اپنی جان چھڑاتا ہوا اپنے روم تک پہنچا دروازہ ناک کر کے وہ اندر داخل ہوا اندر آتے ہی پہلے تو وہ جی بھر کے حیران ہوا پھر جیسے سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا وہ دھیرے سے چلتا ہوا بیڈ پر اریشہ کے پاس پہنچا آج وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ اس کا دل بے قابو ہوتا جا رہا تھا، بڑی مشکل سے اس نے دل پر صبر کے پیرے بٹھائے تھے اس وقت بھی وہ سوتے ہوئے ایک مضموم سی خندی، کچی لگ رہی تھی جو اپنی پسند کا

”جب پوری زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کرتے وقت میری پسند ناپسند کا خیال نہیں کیا تو اب اس معمولی جوڑے کے لئے میری رائے کیوں مانگ رہی ہیں ای اب بھی اپنی مرضی کریں“۔ اریشہ نے غصے سے جواب دیا اور اٹھ کر لان میں آ گئی۔ اس دن کے حوالے سے اس نے کیا کیا خواب دیکھے تھے لیکن اب اس کے لئے سب ختم ہو گیا تھا۔

”کیا مانگا تھا میں نے بس ایک مخلص اور پیار کرنے والا ساتھی میں کیسے اس شخص کا اعتبار کر لوں جس کی زندگی میں مجھ سے پہلے بے شمار لڑکیاں رہ چکی ہیں وہ کیا مجھ سے مخلص ہوگا“۔ اریشہ لان میں چلتے ہوئے افسروگی سے سوچ رہی تھی۔ بلاشتہ عفان میں کوئی کمی نہ تھی بس اس ایک بات کی وجہ سے وہ اسے قبول نہیں کر پارہی تھی۔

☆☆☆☆

بالآخر شاوی کا دن آن پہنچا حیات و لامہانوں سے بھرا پڑا تھا ہر طرف ہی انفرادی مچی ہوئی تھی اریشہ کو تیار ہونے کے لئے عینی کے ساتھ پارلر روانہ کر دیا گیا چونکہ بارات نے ہال میں آنا تھا اس لئے اریشہ کو تیار کروا کر سیدھا ہال پہنچایا گیا۔ بلیک تھری نہیں سوٹ میں ملبوس و جیہہ سا عفان اور اس کے پہلو میں بیٹھی گولڈن شرارہ سوٹ میں ملبوس سنجیدہ سی اریشہ پوری محفل کی جان بنے ہوئے تھے پھر رسموں کا سلسلہ شروع ہوا، جوتا چھپائی کی رسم میں عینی اور اس کی کچھ کزنز نے عفان سے اچھا خاصا نیگ وصول کیا اور اس کی جان بخشی کی اس سارے عرصے میں اریشہ کم صم بیٹھی رہی جیسے اسے اپنے ارد گرد سے کوئی سروکار نہ ہو۔ رخصتی کے وقت بھی وہ ایسے ہی کھڑی تھی جب اس کی ایک کزن نے اسے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

”کم سے کم رونے والا منہ ہی بنا لو لوگ کیا سوچیں گے کہ لڑکی کو شاوی کی اتنی جلدی تھی جو رخصتی کے ٹائم ذرا سا بھی نہیں رو رہی“۔ اچانک ہی یہ

نہیں رہا اور ان سے شادی کرنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، میں شادی ہمیشہ ایسی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا جس کا کردار بالکل صاف ہو، جس پر کسی غیر مرد کا سایہ بھی نہ پڑا ہو اور جب میں نے سارہ آپی کی شادی میں تمہیں دیکھا تمہارے چہرے کی معصومیت تمہارے کردار کی گواہی دے رہی تھی میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ شادی کروں گا تو صرف تم سے کروں گا اور جہاں تک ان سب کی بات ہے تو یقین کرو وہ سب میں بہت پہلے کا تھوڑا چکا ہوں۔ وہ سانس لینے کو رکھا اور اپنی بات جاری رکھی۔

”میں زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں لیکن مجھے اپنی محبت پر پورا یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن تم بھی میری محبت پر اعتبار آ ہی جائے گا اور ان کے لئے تمہیں جتنا بھی ٹائم چاہئے تم لے سکتی ہو تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔“ اپنی بات ختم کر کے اس نے اریشہ کی طرف دیکھا وہ ہونٹیں اسے دیکھ رہی تھی اس نے کہا کچھ سوچ رکھا تھا اور عفان کیا بول رہا تھا۔

”اور ہاں ایک اور بات عفان نے اپنی جیب میں سے ایک مٹھی ڈبیہ نکالی جس میں ڈائمنڈ کی نازک سی رنگ تھی۔“ یہ تمہاری منہ دکھائی کا تھوڑے سے رات تو موقع نہیں ملا بڑے ارمانوں سے لی تھی خود پہناؤں گا مگر آہ خیر یہ رکھ لو۔“ انگلی اریشہ کو دکھا کر وہ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھ گیا کہ دروازہ ایک بار پھر زور زور سے بجنے لگا تھا۔ ”اریشہ“ دروازہ کھلتے ہی یعنی کی آواز آئی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی اس کے پیچھے سارہ اور اس کی ایک دو کزنز بھی تھیں ان کو راستہ دے کر عفان باہر چلا گیا۔ ”ارشی! تمہیں پتا ہے میں نے تمہیں کتنا مس کیا تمہارے بغیر ہمارا کمرہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔“ یعنی نے اس کا گال چوما اریشہ اس کی بات پر ہنس دی۔ ”میں نے بھی تمہیں بہت مس کیا۔“

”تھوڑے تمہیں عفان بھائی سے فرصت ملی ہوگی تو تم نے مجھے مس کیا ہوگا نا۔“ یعنی نے چھیڑا جوابا

کھلوانا نہ ملنے پر سب سے ناراض ہو گئی ہو عفان اسے دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا اور چیخ کر کے خود بھی سونے کے لئے لیٹ گیا۔ عفان جانتا تھا کہ اریشہ اس سے بدگمان ہے لیکن اسے اپنی محبت پہ بھی پورا یقین تھا کہ اریشہ ایک دن اس کی محبت کا اعتبار ضرور کرے گی اور اس کے لئے اسے صبر سے کام لینا پڑے گا۔

☆☆☆☆

صبح جب اریشہ کی آنکھ کھلی تو کمرہ خالی تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تبھی واش روم کا دروازہ کھلا اور نکھر نکھرا عفان باہر نکلا اس کی طرف دیکھ کر عفان نے مسکراہٹ اچھالی۔

”گڈ مارنگ! اچھا ہوا کہ تم جاگ گئیں گھر والے پہلے ہی دو مرتبہ دروازہ بجا چکے ہیں۔“ عفان نے آہستہ سے اسے سامنے اپنے بال درست کرنے ہوئے اسے بتایا اور سیٹی بر کوئی دھن بجانے لگا۔

”ہاں میں یہ تو بالکل نارمل ہے رات جو میں نے کیا میں سبھی بھی یہ غصے میں ہوگا لیکن یہ تو ایسے ہی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔“ وہ عفان کو دیکھتے ہوئے حیرت سے سوچے گئی۔

”آہم آہم ہاں، میں کافی ہینڈ سم ہوں پر رات نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟“ عفان نے شوخی سے کہا۔ ”منہ دھور کھو۔“ وہ فٹ سے بولی۔

”ہا ہا ہا ویسے یاد دہانی کسی دہن نے شادی کے پہلے روز اپنے شوہر کو ایسا نہیں کہا ہوگا۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گیا اریشہ نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ اریشہ ای شش و پنج میں تھی کہ عفان سے کچھ پوچھے یا نہیں لیکن اس سے پہلے ہی وہ بولا تھا۔

”دیکھو اریشہ! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بدگمان ہو اور ابھی تم نے اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کیا تم مجھے لڑکیوں سے دوستی رکھنے والا ایک فلرٹ انسان سمجھتی ہو لیکن ایسا نہیں ہے میں نے اس دن ریٹورنٹ میں بھی بتایا تھا کہ وہ دوستیاں بہت معمولی نوعیت کی تھیں میں کبھی کسی کے ساتھ سر نہیں

جانی خالدہ بیگم جوڑوں کے درود کی مریضہ تھیں سو وہ زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتی تھیں۔ فارغ رہ رہ کر جب وہ اکتا گئی تو گھر کے کاموں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی، گھر میں ملازم تھے اس لئے اسے زیادہ کام نہ کرنا پڑتا، سنڈے کا دن تھا سو وہ فری بیٹھی انڈین فلم دیکھ رہی تھی جب عفان بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا لیکن براہو ان انڈین فلموں کا ہیرو ہیروئن کچھ زیادہ ہی رومانگ ہوئے تو ریویوٹ اٹھا کر ایشہ نے نی وی وی ہی آف کر دیا۔

”میں چائے لے کر آتی ہوں“۔ یہ کہہ کر اس نے کچن کی طرف دوڑ لگادی اور اپنے پیچھے دروازے تک اسے عفان کا قہقہہ سنائی دیا۔

☆☆☆☆

”ای! میں سوچ رہی ہوں کہ مارکیٹ چلی جاؤں توڑی شاپنگ کرنے“۔ ایشہ نے خالدہ بیگم کو جوس دیتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! چلی جاؤ لیکن شام ہونے والی ہے ذرا جلدی آ جانا اور ہاں ڈرائیور کو ضرور لے کر جانا“۔

”ٹھیک ہے ای! آپ چلیں گی؟“

”نہیں بیٹا! مجھ سے کہاں اتنا چلا جاتا ہے تم چلی جاؤ میری فکر مت کرو“۔ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”چلیں ٹھیک ہے پھر آپ آرام کریں میں جلدی آ جاؤں گی“۔ خالدہ بیگم کو بتا کر ایشہ اپنے کمرے میں چینیج کرنے کے لئے آگئی چینیج کر کے اس نے ہلکا پھلکا میک اپ کیا اور ڈرائیور کو مارکیٹ کا بتا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ آج کافی دنوں بعد وہ یوں گھر سے باہر آئی تھی اس لئے بہت اچھا لگ رہا تھا موسم بھی بہت خوشگوار تھا، ہلکے ہلکے پادل آئے ہوئے تھے گاڑی سکنل پر رکی تو ایشہ یونہی ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔

اچانک ہی وہ ایک جگہ سائٹ ہوگئی بلاشبہ وہ

ایشہ نے اس کا کمر پر ہاتھ بڑھ دیا۔

”اچھا عفان بھائی نے تمہیں منہ دکھائی میں کیا دیا؟“ عینی نے اشتیاق سے پوچھا۔ ایشہ نے اپنا انگوٹھی والا ہاتھ سامنے کر دیا جو اس نے عفان کے اٹھتے ہی پہن لی تھی۔

”افاللہ کتنی خوبصورت رنگ ہے“۔ عینی نے انگوٹھی دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی اپنی شادی پر اپنے ”انہوں“ سے ایسی ہی رنگ لوں گی“۔ اس کے اس طرح شرما کر انہوں کہنے پر وہ سب ہنس دیں۔

اچھا چلو بس باقی باتیں بعد میں ایشہ تم ناشتہ کر لو جلدی سے پھر تمہیں ولیمہ کے فنکشن کے لئے پارلر بھی لے کر جانا ہے۔ سارا نے ایشہ کو بدایت دی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ ایشہ کو پارلر لے گئیں وہاں سے تیار ہو کر سیدھا مال پہنچیں جہاں ولیمہ کا فنکشن تھا ایشہ آج غصہ ڈھا رہی تھی تو عفان بھی کسی سے کم نہیں لگ رہا تھا، فنکشن ختم ہونے کے بعد رسم کے مطابق ایشہ دو روز کے لئے اپنے مکتے رہنے چلی گئی تیسرے روز عفان اور خالدہ بیگم ایشہ کو ایس لے آئے۔

☆☆☆☆

ان کی شادی کو دو ماہ سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن دوریاں ابھی بھی برقرار تھیں دونوں میں بہت کم بات چیت ہوتی تھی، عفان بن کہے ایشہ کی ہر ضرورت پوری کر رہا تھا اور ایشہ جو شادی سے پہلے بدلہ لینے کی نیت سے آئی تھی عفان کی پہلے دن کی باتیں سن کے بعد اس نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا تھا ایشہ نے اس کی باتوں میں سچائی ہی سچائی دیکھی تھی لیکن نجانے کیوں ابھی بھی وہ اس پر اعتبار نہ کر پارہی تھی۔ ان دو ماہ میں اس نے عفان میں کوئی برائی نہ دیکھی تھی عفان صبح کا آفس نکلا شام سات بجے گھر لوٹتا، وہ سارا دن گھر میں بولائی بولائی پھرتی رہتی یا خالدہ بیگم کے پاس ان کے کمرے میں چلی

عفان ہی تھا اور اس کے ساتھ ایک بہت خوبصورت لڑکی بھی تھی وہ دونوں ہاسپٹل سے نکل کر باہر کھڑے کچھ بات کر رہے تھے پھر عفان نے اس لڑکی کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور وہ بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے اور گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی عفان کو اس لڑکی کے ساتھ دیکھ کر ایشہ کے اندر کچھ چھین سے ٹوٹا اور اس کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔

”بابا! گاڑی واپس گھر کی طرف موڑ لیں۔“ اس نے ڈرائیور سے کہا۔

”کیا ہوا بیٹا! مارکیٹ نہیں جانا؟“ ڈرائیور نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ ایشہ نے ڈاکٹر کے پاس لے چلوں بیٹا؟“

”نہیں بابا بس واپس گھر چلیں۔“ ایشہ نے ہنسنے کہا ڈرائیور نے گاڑی واپس موڑ لی۔ ایشہ گھر آتے ہی اپنے کمرے میں آگئی اور بستر پر گر کر رونے لگی خالدہ بیگم اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور ایک طرح سے اچھا ہی تھا کہ وہ اس وقت کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اس کے ذہن میں کوڑے برس رہے تھے وہ بار بار ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی کہ عفان نے اسے دھوکہ دیا ہے۔

لگا تار رو رو کر اس کا بھاری ہو گیا تھارات کے نو بج رہے تھے اور عفان ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا وہ کھڑکی کے پٹ کھولے کم م م کھڑی تھی۔ تقریباً دس بجے عفان گھر واپس آیا تھا وہ کافی تھکا ہوا تھا سو آتے ہی فریش ہونے کے لئے واش روم میں گھس گیا وہ نہا کر جب باہر نکلا تو ایشہ تب بھی وہیں کھڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ کے گیا تھا اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

”ایشہ“ عفان نے دو تین مرتبہ ایشہ کو پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے ایشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ڈونٹ ریج ٹی۔“ ایشہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چلائی۔

”ایشہ کیا ہوا؟“ عفان نے حیرانی سے پوچھا۔

”کیوں میری زندگی برباد کی تم نے عفان! اگر یہی سب کرنا تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی بڑا دعویٰ کرتے تھے نا مجھ سے محبت کا اعتبار کی بات کرتے تھے نا اور شاید میں تمہارا اعتبار کر بھی چکی ہوتی اگر آج یہ سب نہ دیکھ لیتی تو کیوں دھوکہ دیا تم نے مجھے۔“ ایشہ اس کا گریبان جھنجھوڑ کر بولی۔

”ایشہ! میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو ضرور تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ عفان جھنجھلایا۔

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی میں نے خود تمہیں کسی لڑکی کے ساتھ ہاسپٹل سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا کون ہے وہ ہاں کون ہے جسے لے کر تم میری کر رہے تھے تمہاری نئی گرل فرینڈ یا کوئی پرانی محبوبہ؟“ ایشہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ایشہ کی بات سن کر عفان کا دماغ بھٹک سے اڑ گیا اس کے تو ذہن و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایشہ اس کے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتی ہے۔

”شٹ اپ جسٹ شٹ اپ اب میں اور تمہاری بکو اس نہیں سننا چاہتا میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہاری ذہنیت ایسی بھی ہو سکتی ہے اتنا عرصہ میرے ساتھ رہنے کے باوجود بھی تم مجھے سمجھ نہ پائیں اتنا شک کرتی ہو مجھ پر کہ۔“

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“ ایشہ اس کی بات کاٹ کر چلائی۔

”تمہیں سننا پڑے گا۔“ عفان اس سے بھی اونچی آواز میں چلایا۔

”جہاں تک اس لڑکی کی بات ہے تو وہ میرے دوست کی بیوی ہے ان دونوں نے بھاگ کر شادی کی تھی دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن ان کے گھر والے اس شادی پر راضی نہ تھے میں نے ان کی شادی کروائی تھی۔“ وہ سانس لینے کو رکھا۔

”کافی دنوں سے میرا اس سے کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔“ ایشہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چلائی۔

اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور واش روم میں گھس گیا اس ایک نگاہ میں کیا کچھ نہ تھا کہ ازپشا اپنی نظریں نہ اٹھا سکی، سات بج گئے تھے یقیناً وہ آفس کے لئے تیار ہونے آیا تھا اریشہ بھی ناشتہ بنانے کے لئے اٹھ گئی۔ ناشتہ کی میز پر بھی دونوں خاموش ہی تھے، عفان خاموشی سے اپنا ناشتہ کر رہا تھا اریشہ نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اتنے ساوہ تھے کہ وہ ہمت ہی نہ کر پار ہی تھی۔

”عفان! چائے ووں“۔ بالآخر اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”مجھے جس چیز کی ضرورت ہوئی میں خود لے لوں گا، تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے اتنے سرد لہجے میں کہا کہ اریشہ دوبارہ کچھ بول نہ سکی، عفان جوس کا آخری سب لے کر آفس کے لئے نکل گیا اور اریشہ نے بس سے ہونٹ کاٹی رہ گئی۔

☆☆☆☆

اریشہ نے سارا ون لگا کر عفان کی تمام پسندیدہ ڈشز بنائیں اور اب خوب اچھی طرح تیار ہو کر وہ عفان کا انتظار کر رہی تھی، پچھلے کافی دنوں سے وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اسے کوئی موقع نہ دے رہا تھا اور آج وہ ہر صورت اس سے بات کرنا چاہتی تھی اریشہ کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ نہ صرف عفان کو پسند کرتی ہے بلکہ اس سے محبت بھی کرتی ہے، گاڑی کا پارن سنائی ویا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی، عفان نے اندر آ کے ایک نظر اس پر ڈالی اور قدم آگے بڑھادیئے۔

”عفان کھانا لاؤں آپ کے لئے؟“ احساس بدلے تو بلانے کا انداز بھی بدل گیا۔

”نہیں میں کھا کر آیا ہوں“۔ سرد لہجے میں جواب آیا۔

”لیکن میں نے تو سارا کھانا آپ کی پسند کا بنایا تھا۔“ اس کی بات پر عفان نے اسے ایسے دیکھا جیسے

کہہ رہا ہو کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں اور اسٹڈی

روم میں چلا گیا۔ اریشہ کو اس کے جواب سے مایوسی

سو میں اس کے گھر چلا گیا وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا تھا اس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا جیب میں اندر گیا تو دیکھا کہ اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی پہلے تو میں اس کو ہوش میں لایا اور بعد میں ہاسپٹل لے گیا جہاں تم نے مجھے دیکھا۔“ اس نے رک کر اریشہ کی طرف دیکھا جو حیرانی بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”وہ لڑکی مجھے اپنا بڑا بھائی مانتی ہے اور میں بھی اسے اپنی چھوٹی بہن ہی سمجھتا ہوں، میرے لئے وہ سارہ آپ جیسی ہی ہے اور تم۔“ عفان نے انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔

”تم اس قدر گھٹیا سوچو گی یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا میں تمہیں دھوکہ کیوں دوں گا میں نے پورے دل سے محبت کی ہے تمہارے ساتھ مگر افسوس میں نے ایک ایسی لڑکی سے محبت کی جو چتر ہے جس میں احساسات نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

”میں ہی باگل تھا جو یہ سوچ بیٹھا کہ ایک نہ ایک دن میری محبت تمہیں پکھلا دے گی لیکن میں غلط تھا بہت غلط۔“ عفان اسے دیکھ کر بہت کرب سے بولا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اریشہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی اسے پچھتاؤوں نے آن گھیرا وہ اتنا غلط سوچے بیٹھی تھی عفان کے بارے میں اس نے عفان کو کتنا دکھ پہنچایا اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا لیکن اب دیر ہو چکی تھی وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

☆☆☆☆

عفان ساری رات کمرے میں نہ آیا اور اریشہ نے ساری رات کانٹوں پر گزاری اسے رہ رہ کر اپنی غلطی پر پچھتاوا ہو رہا تھا کہ کیا تھا اگر وہ اس قدر جذباتی نہ ہوتی اور آرام سے بات کر لیتی اب تو سب کچھ ٹھیک ہونے والا تھا اور اس نے اپنی ایک حرکت سے سب کچھ خراب کر دیا۔

وہ ایسے ہی بیٹھی ہوئی تھی جب عفان اندر داخل ہوا

ہوئی لیکن ابھی وہ ہمت ہارنا نہیں چاہتی تھی سو جلدی سے کافی بنا کر اسٹڈی بیس آگئی اور عقان کے سامنے بھاپ اڑاتا کافی کاگ رکھ دیا وہ کیپوٹر پر کچھ کام کر رہا تھا۔
 ”عقن! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ عقان نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔
 ”لیکن مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سنی۔“

”اریشہ! میں اس وقت بڑی ہوں مجھے ڈسٹرب مت کرو۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر نفی سے بولا۔
 ”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی عقان پلیز! مجھے ایک موقع تو دیں اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا میں۔“ اس کی بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی عقان چلا اٹھا۔

”جب میں نے کہا ہے کہ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سنی تو کیوں پریشان کر رہی ہو چلی جاؤ یہاں سے گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔“ اس نے کافی کاگ زمین پر پٹخا۔ اریشہ کو اس سے اتنے شدید رد عمل کی توقع نہ تھی وہ منہ پر ہاتھ رکھے کمرے سے بھاگ گئی اور عقان کمری پر ڈھے سا گیا۔

☆☆☆☆

”امی! آپ نے بلایا؟“ اریشہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے خالدہ بیگم سے پوچھا۔
 ”ہاں بیٹا! اوہر آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے اریشہ! میں کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ پریشان سی ہو سب خیریت تو ہے نا۔“ خالدہ بیگم نے شفقت سے پوچھا۔

”جی امی! سب خیریت ہے ایسی تو کوئی بات نہیں۔“
 ”تو پھر اتنی اداس کیوں رہتی ہو عقان سے کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟“

”نہیں امی! ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا ضرور آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اریشہ نے یقین دلانا چاہا۔
 ”دیکھو اریشہ! تم میری بیٹی جیسی ہو اگر کوئی بات ہے تو تم بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتی ہو میں خود عقان کے

کان کھینچوں گی۔“ ان کی بات پر وہ ہنس دی۔
 ”امی! اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں ضرور آپ کو بتاتی لیکن سچ میں کوئی بات نہیں ہے آپ پریشان مت ہوں۔“ اریشہ ان کے ہاتھ تھام کر بولی خالدہ بیگم مسکرائیں۔
 ”اب آپ آرام کریں میں ذرا کپڑے پر لیس کر کے آتی ہوں۔“ ان سے بہانہ بنا کر وہ اٹھ گئی مبادا کہ وہ اس کے آنسو ہی نہ دیکھ لیں وہ انہیں سچ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن خالدہ بیگم کی تسلی نہ ہوئی انہوں نے آج عقان سے بات کرنے کا سوچ لیا تھا۔

☆☆☆☆

”عقن! رات کھانے کی میز پر خالدہ بیگم نے عقان کو پکارا۔
 ”جی امی۔“

”تمہیں آفس اور کام کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں ہے کیا؟“ ان کی بات پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔
 ”کیوں امی! کیا ہوا؟“

”عقن! جب سے تم دونوں کی شادی ہوئی ہے تم لوگ کہیں گھومنے نہیں گئے اور پچھلے کچھ دنوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر رہے سب کچھ ٹھیک تو ہے نا بیٹا۔“ عقان نے اریشہ کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھی پلیٹ میں چجج ہلا رہی تھی وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گئی تھی عقان کو تاسف نے آن گھیرا۔

”میری بیماری امی ایسا کچھ نہیں ہے سب کچھ ٹھیک ہے۔“
 ”اچھا تو پھر تم آفس سے ایک دو ہفتے کی چھٹی لو اور اریشہ کے ساتھ اسلام آباد گھومنے چلے جاؤ۔“ انہوں نے اپنا فیصلہ بنایا۔

”لیکن امی! آفس کا سارا کام۔“
 ”آفس کہیں بھاگا نہیں جا رہا لیکن یہ دن دوبارہ نہیں آئیں گے بیٹا۔“

”لیکن امی ہم آپ کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں؟“
 اس سارے عرصے میں اریشہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

تا میں نے آپ کو کتنا غلط سمجھا آپ پر شک کیا اور آپ کی محبت کو جھوٹا کہا ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں عفتان۔ اس نے عفتان کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”اریشہ! ایسے مت کرو غلطی اگر تمہاری تھی تو کچھ غلطی میری بھی تھی تمہیں اگر میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی تھی تو مجھے چاہئے تھا کہ میں آرام سے اسے دور کرتا نہ کہ اس طرح ری ایکٹ کرتا۔“

عفتان نے اس کے جڑے ہاتھ تھام کر کہا۔

”خیر جو ہوا سو ہوا اب اسے بھول جاؤ آج سے ہم ایک نئی شروعات کرتے ہیں بس میری تم سے ایک ہی ریگوسٹ ہے کہ پلیز مجھ پر کسی شک نہ کرنا میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔“

”عفتان! مجھے شرمندہ مت کریں مجھے اب آپ پر خود سے بھی زیادہ یقین ہے اور آخری سانس تک رہے گا۔“ اریشہ نے پر یقین لہجے میں کہا۔

”اور محبت۔“ عفتان نے اس کے چہرے پر جھک کر پوچھا۔ اریشہ نے اس کی آنکھوں میں محبتی شرارت دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

”دیکھو سچ بتا دو ورنہ میں پھر ناراض ہو جاؤں گا۔“ عفتان نے اسے ڈرانا چاہا۔

”نن نہیں محبت ہے بہت محبت ہے۔“ اس نے ہکا کر فوراً کہا مبادا کہیں وہ واقعی ناراض نہ ہو جائے۔ عفتان لب بلبھیج کر ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے دیکھتے ہی اس نے زوردار قبضہ لگایا۔

”بہت فضول ہوتی۔“ اریشہ اس کی شرارت سمجھتے ہوئے دور جانے لگی تو عفتان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اب محبت ہے تو محبت کا عملی ثبوت تو دینا پڑے گا۔“ عفتان نے اس کے ماتھے پر پیار کی مہر ثبت کر دی اور اریشہ کو بازوؤں میں بھر لیا، اریشہ نے پرسکون ہو کر آنکھیں میوند لیں کہ اس پیار بھری پناہ سے فرار وہ چاہتی بھی نہ تھی۔

☆☆☆☆☆☆

میری فکر مت کرو بیٹا! میں رہ لوں گی اور گھر میں ملازم بھی تو ہیں بس اب میں اور کوئی بہانہ نہ سنوں۔ انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے ای! جیسے آپ کی مرضی۔“ بالآخر عفتان نے ہتھیار ڈال دیئے۔

”اریشہ جاؤ بیٹا پیکنگ کر لو۔“ خالدہ بیگم کے کہنے پر اریشہ کمرے میں چلی گئی۔

”دیکھو عفتان! تم دونوں بھلے مجھے کچھ نہ بتاؤ لیکن مجھے صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ تم دونوں کے درمیان ناراضی چل رہی ہے لیکن میاں بیوی کے معاملے میں اتنی کرید میں مناسب نہیں سمجھتی بیٹا جو بھی ناراضی ہے اسے دور کرو میں تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”جی ای اب ایسا ہی ہوگا۔“ عفتان نے ان کے ہاتھ تھام کر کہا۔

”چلو شاباش رات بہت ہو گئی ہے تم بھی جاؤ آرام کرو۔“ ان کے سر کا بوسہ لے کر وہ باہر نکل گیا۔ عفتان خود بھی اب سب ختم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اریشہ کو اس کے کئے کی کافی سے زیادہ مزادے چکا تھا۔ عفتان کمرے میں آیا لیکن دروازے میں ہی ٹھنک کے رک گیا اریشہ کھڑکی کے سامنے کھڑی رو رہی تھی اریشہ کے آنسو اسے اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے عفتان تڑپ اٹھا۔

”اریشہ“ عفتان نے اسے کندھے سے تھام کر رخ اپنی طرف موڑا۔

”ناراض ہو مجھ سے؟“ وہ کچھ نہ بولی البتہ آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

”اریشہ! میں نے تمہیں بہت پریشان کیا ہے نا یقین کرو میں ایسا بالکل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن نجانے کیسے مجھے اتنا غصہ آ گیا اور میں یہ سب کر گیا آئی ایم سوری۔“ عفتان نے اس کے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔

”نہیں عفتان! آپ کیوں معافی مانگ رہے ہیں معافی تو مجھے مانگنی چاہئے ساری غلطی تو میری تھی“

سحر جیت کی ایک اور ایسی کہانی

ہوسکتا تھا کہ وہ اس کا مسکرا کر استقبال نہ کرتے، سورج کو سب کچھ پہلے جیسا ہی نظر آ رہا تھا مگر اس حسین وادی میں ایک گھر ایسا بھی تھا جہاں سورج کو بہت کچھ غیر معمولی لگا تھا اس گھر میں سورج کی پہلی کرن نے دوروتی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں جو اپنے رب کے

ایک طویل ناراضی کے بعد سورج کی کرنوں نے بالآخر ماسہرہ کی اس دلفریب وادی کے مکینوں کو اپنی جھلک دکھا ہی دی تھی، ماسہرہ کے مکین جو صبح کی جاگتی کرنوں کو ہمیشہ مسکرا کر خوش آمدید کہتے تھے اس روز تو اتنے دنوں بعد سورج ان سے ملنے آیا تھا تو ایسا کیسے



آگے نجانے کب سے جدہ زیر تھیں اور انہیں اس لمحے دعا کے علاوہ کچھ یاد نہیں تھا وہ آنکھیں ایک اونچے لمبے مرد کی آنکھیں تھیں جن میں ہزاروں شکوے سانس لے رہے تھے ان آنکھوں میں موجود درد نے سورج کو بھی اداس کر دیا تھا اس نے بے اختیار خالق کائنات سے التجا کی تھی کہ وہ اس مرد کی تمنا، خواہش، حسرت، محبت سب کچھ اسے بخش دے، مانسہرہ میں ایک بھر پور دن گزارنے کے بعد سورج اداس واپس جا رہا تھا مگر پر امید تھا کہ اب کی بار وہ واپس آئے گا تو وہ مرد اکیلا نہیں ہوگا، اس کی محبت ایک مجسم وجود بن کر اس کے ساتھ کھڑی ہوگی۔

☆☆☆☆

”تیرے لئے ایک رشتہ آیا ہے“۔ میمونہ نے اپنی بیٹی

کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا جو اس کی گود میں سر رکھے نجانے کون سی سوچوں میں غرقاب تھی۔

”ہوں.....“ عظمیٰ نے ہلکی سی ہوں کی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے میمونہ کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

”لڑکا بہت اچھا ہے، اچھی تنخواہ ہے، تجھے بہت خوش رکھے گا“۔ میمونہ نے ایک ہی جملے میں گویا اس لڑکے کی ساری خوبیاں بیان کر دی تھیں انہیں اپنی یہ سب سے بڑی بیٹی اپنے باقی بچوں کی نسبت زیادہ عزیز بھی اور ان سے زیادہ ان کے شوہر کی اس میں جان تھی۔

”اماں! اس بار وادی میں زیادہ برف نہیں پڑی“۔ عظمیٰ نے بالکل ہی ایک غیر متوقع بات کر کے میمونہ کو احساس دلایا تھا کہ اسے ان کی اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے چکر اکر گر پڑی، عبد البصیر کو شاید اتنے شدید رو عمل کی توقع نہیں تھی اسی لئے انہوں نے اتنا بڑا فیصلہ عظمیٰ کی مرضی معلوم کئے بغیر ہی کر لیا تھا، اگر انہیں اپنی بیٹی کے اس قدر جذباتی لگاؤ کا علم ہوتا تو وہ کبھی بھی اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتے، ان کے لئے یہ سب بہت تکلیف دہ اور حیران کن تھا کہ ان کی بیٹی کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا وہ ان سے اس قدر خفا تھی کہ اس نے ہمیشہ کے لئے ان کی دنیا سے دور جانے کی تیاری کر لی تھی اپنے رب سے دعائیں مانگ مانگ کر وہ اسے واپس اپنی دنیا میں لے تو آئے تھے مگر اب انہوں نے وہی کرنا تھا جس میں ان کی بیٹی کی خوشی تھی۔

☆☆☆☆

ویسے تو یہ پورا علاقہ ہی طرح طرح کے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا مگر مانسہرہ کے اس چھوٹے سے سرکاری اسپتال کے پاس کھڑا وہ شاہ بلوط کا درخت انجام کو ہمیشہ سے بہت خوبصورت لگتا تھا، اور اب تو اسے اس درخت کے پاس سے اپنائیت کی ایک عجیب سی مہک بھی آنے لگی تھی ابھی محض چند دن پہلے ہی کی تو بات تھی جب اس نے مانسہرہ سے واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے تھے انہی وہ اپنے گھر سے نکلا نہیں تھا کہ اسے عظمیٰ کے نروس بریک ڈاؤن کی خبر مل گئی اسے اس لمحے یوں لگا کہ شاید اس کے حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں مگر وہ مرد تھا اور بہر حال عظمیٰ سے زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا وہ اس کے گھر والوں سے ناراض تھا مگر عظمیٰ کی بیماری کے دنوں میں اس نے اپنی ساری ناراضی ترک کر دی تھی اور حقیقی معنوں میں اپنے پھوپھا کو بیٹا بن کر دکھایا تھا کسی سچا کی طرح وہ عظمیٰ کی دیکھ بھال کر رہا تھا دل کی باتوں پر وہ بیان دیتا تو اس نے اب چھوڑ دیا تھا اسے بس عظمیٰ کو زندگی کی طرف واپس لے کر آنا تھا اور پھر خاموشی سے ان پہاڑوں سے واپس لوٹ جانا تھا انہی دنوں وہ شاہ بلوط کا درخت تھی اس کا دوست

وہ پہاڑوں کا مسافر نہیں تھا وہ تو میدانوں کا کھلاڑی تھا مگر عظمیٰ کی خاطر اس نے کچھ عرصے کے لئے پہاڑوں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، اس کے پھوپھا کو سب سے بڑا اعتراض ہی اس کی میدانوں سے دوستی پر تھا مگر وہ کیا کرتا، اس کی روزی میدانوں پر لکھی تھی اسے عظمیٰ کو ایک بہت اچھی زندگی دینی تھی وہ اپنے رزق کو لات نہیں مار سکتا تھا پھر اس کا گھر بار سب میدانوں میں ہی تھا اس نے عظمیٰ کے گھر والوں کو منانے کی بہت کوشش کی مگر اسے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی تھی وہ بہت زیادہ مایوس ہوتا جا رہا تھا اس کے پھوپھانے صاف انکار کر دیا تھا ایسا لگتا تھا کہ ان کی نان ہاں میں بدلنے والی نہیں تھی اس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اس لئے اب اس نے بھی میدان کی طرف بوجھل دل سے رخت سفر باندھ لیا تھا کہ ایک روز اسے ایک بہت بری خبر سننے کو ملی مگر اس بری خبر نے اس کے لئے خوشیوں کے نئے راستے کھول دیئے تھے جس کا احساس اسے بہت بعد میں ہوا۔

”عظمیٰ بیٹی! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ عبد البصیر نہایت سنجیدگی سے اپنی لاڈلی سے مخاطب تھے ان کی سنجیدگی دیکھ کر عظمیٰ بھی کچھ ڈرسی گئی تھی۔ ”تمہارا رشتہ آیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس رشتے کے لئے اپنی رضامندی دے دو۔“ عبد البصیر نے یہ سب کہتے ہوئے عظمیٰ کی طرف دانستہ طور پر دیکھنے سے گریز کیا تھا، کیونکہ اس کی آنکھوں میں چمکتے نام کو وہ با آسانی پڑھ سکتے تھے مگر عظمیٰ کو اتنی دور پہنچنے کے لئے ان کا دل کسی صورت راضی نہیں تھا۔ ”ٹھیک ہے۔“ عظمیٰ نے مختصر سا جواب دیا اور واپسی کے لئے قدم بڑھائے اسے ابھی اپنے کمرے میں جا کر اپنے شہر دل کی ویرانی کا ماتم بھی کرنا تھا اسے صبر و ضبط کے بہت سے مراحل طے کرنے تھے مگر وہ تو پہلے مرحلے میں ہی ناکام ہو گئی اور اپنے کمرے کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھتے

اب وہ اس دن کا کیا کرتی جو ہر لمحے انعام کی واپسی کی راہ دیکھتا تھا، پھر نجانے کتنے ہی دن گزر گئے، بر فانی ہواؤں کے بعد پھول کھلنے کا موسم آچکا تھا، مگر انعام اسے لینے نہیں آیا تھا اس کے گھر والے بھی انعام کے اس رویے پر بہت حیران تھے اس سے پہلے کہ دوبارہ سے خزاں لوٹ آئی، ایک روز ایک مانوس سی خوشبو اس کے گھر میں داخل ہوئی، وہ انعام کے قریب کی خوشبو تھی جو اسے ہر لمحے مدہوش کر دیا کرتی تھی اسی خوشبو نے اسے بتایا کہ وہ اٹا کے ساتھ لڑتے لڑتے تھک چکی ہے اور کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح وہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہو چکی گی۔

”تم مجھ سے اب تک ناراض ہو گیا؟“ انعام نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

”آنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟“ عظمیٰ تھوڑا سا چپچپے ہو گئی اسے اتنی جلدی ہتھیار نہیں ڈالنے تھے مگر اس خوشبو نے اسے سرور کر دیا تھا۔

”تم سے ڈرتا تھا۔“ انعام کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اس نے عظمیٰ کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا تھا اور پھر نجانے کب عظمیٰ نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور وہ اس کے سینے پر سر رکھ سکے گی۔

”اب کوئی جھگڑنے والی بات تو نہیں کریں گے نا۔“ وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔

”نہیں..... کیونکہ تمہارے بغیر میں ادھورا ہوں اور مجھے ایک مکمل زندگی گزارنی ہے۔“ یہ سب کہتے ہوئے اس کا اپنا لہجہ بھی نم ہو گیا وادی میں موجود پہاڑ بھی اس ملن پر مسکرانے لگے تھے برسوں بعد ماسمہ میں موجود سورج نے اس قدر خوبصورت ملن دیکھا تھا اور اپنی محبت کو ثابت کرنے کے لئے ان دونوں کو کسی گواہی کی ضرورت نہیں تھی یہ احساس ہی کافی تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس لوٹ آئے تھے اور اپنی باقی ساری زندگی انہوں نے اسی احساس کے ساتھ گزار لی تھی۔

☆☆☆☆

بن گیا تھا اور بہت حد تک اس کے حال سے واقف ہو چکا تھا انعام کا اداس دل اور آنکھوں میں چپے خاموش آنسو اب اور لوگوں کو بھی نظر آنے لگے تھے، اسی لئے جب وہ واپس جانے لگا تھا تو عبد البصیر نے اس کو روک لیا تھا، عظمیٰ صحت یاب ہو کر گھر لوٹ آئی تھی مگر بہت چپ چپ رہنے لگی تھی اور پھر ایک روز اجانک ہی عبد البصیر نے اسے زندگی کی نوید سنا دی، محض چند ہی ہفتوں بعد کچھ گواہان کی موجودگی میں عظمیٰ کو انعام کے سنگ رخصت کر دیا گیا، انعام محروم نہیں رہا تھا وہ با مراد واپس جا رہا تھا وہ بہت خوش تھا وہ میدانوں میں واپس آ گیا تھا اور پہلی بار اسے میدانوں سے پہاڑوں کی خوشبو آنے لگی تھی وہ جس جگہ پر دیتا تھا وہ اس سے زیادہ خوبصورت پہلے بھی نہیں تھی۔

☆☆☆☆

”مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے آپ کبھی ماں نہیں بن سکیں گی۔“ ڈاکٹر اپنے مخصوص پیشہ ورانہ انداز میں عظمیٰ سے مخاطب تھی اور اس لمحے عظمیٰ کے ساتھ ساتھ انعام کو بھی لگا کہ اس کا دل گہری کھائی میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

”مگر پھر بھی کوئی امید تو ہوگی۔“ انعام دگرنگی سے بولا۔

”آپ اپنی تسلی کے لئے کسی اور ڈاکٹر کو بھی دکھادیں، مگر مجھے ایسی کوئی امید نظر نہیں آرہی۔“

ڈاکٹر نے صاف گوئی کی انتہا کر دی اور پھر نجانے کتنے ہی ڈاکٹروں کے چکر لگا لگا کر وہ تھک گئے مگر ہر بار مایوسی نے ہی ان کا استقبال کیا، زندگی میں کئی کیا آئی اب ان دونوں کے لہجوں میں بھی کئی نظر آنے لگی تھی،

ایک دوسرے کا ہمیشہ کے لئے ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والے اب معمولی معمولی باتوں پر جھگڑنے لگے تھے، خاندان والے الگ سے منشی باتوں کا محاذ کھول کر بیٹھ گئے اور انہی تکنیوں سے گھبرا کر عظمیٰ

پہاڑوں پر واپس آ گئی، اسے ان میدانوں میں واپس نہیں جانا تھا، جہاں اسے مایوسی اور ناامیدی ہی نظر

آئی تھی اسے انعام کے پاس واپس نہیں جانا تھا مگر

افسانہ

اُداسی میرا دن رونا

”میرا اب جینے کا دل نہیں کرتا“۔ ظفیری نے اسے دیکھا۔
”بیٹا ایسی مایوسی کی باتیں تمہارے منہ سے اچھی
بجھی ہوئی آواز میں کہا تو صبا بیگم نے نم دیدہ ہو کر



نہیں لگتیں۔ صبا بیگم نے گلو گیر لہجے میں کہا۔
”ای آپ نہیں سمجھ سکتی ہیں۔ میری یہ معذوری
میرے ہر احساس پر غالب آ جاتی ہے میں کن کر
بناک لحات سے دوچار ہوں کس اذیت سے گزر رہا
ہوں حسرت و یاس کی تصویر ہوں میں یہ ادا سی اور
محرومی میری یہ ویرانی حالات کی مرہون منت ہے۔
میرا اب ہر احساس فنا ہو چکا ہے سوائے اس
معذوری کے احساس کے۔ ظفری نے درد میں
ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا تھا اس نے نمناک
آنکھوں پر پلکوں کا پردہ ڈالا اور دو گرم سیال آنسو اس

کے گالوں کو نم کر گئے۔ صبا بیگم بے بسی کی تصویر بنی
اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں جو کبھی شجاعت و بہادری کا
پیکر ہوا کرتا تھا جس کی مردانگی کے قصے تمام خاندان
بھر میں زبان زد عام ہوا کرتے تھے۔ جس کی
وجاہت سے مرعوب ہو کر کئی فیصلے انجام پذیر ہو جایا
کرتے تھے اب خود ہی دیدہ عبرت بن چکا تھا اور
بے بسی میں ڈھل چکی تھی اس کی ذات اب ظفری کو
ایک چپ سی لگ گئی تھی ٹریفک حادثے میں اپنی
ایک ٹانگ گنوا دینے کے بعد ظفری کے لب و لہجے
میں وحشت در آئی تھی ہر بات میں اس کے لہجے میں

Downloaded From
Paksociety.com

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ختمی در آتی تھی، ایک عجب سی مایوی تھی جو اس کی ذات میں مدغم ہو چکی تھی، بہت سے درد تھے جو اس کے لفظوں میں بولتے تھے، بہت سے کرب ناک پل تھے جو اس کے چہرے پر پر سوزی سے رقم تھے، تنہائی کی اذیت نے ایک حصار اس کے گرد بنا دیا تھا، جسے عبور کرنا اب کسی کے بس کی بات نہ تھی وہ اپنے اس حصار کو اپنی کمزوری چھپانے کے لئے استعمال کرنے لگا تھا، وہ لوگوں کے ہجوم سے پہلو تہی کرنے لگا تھا، اس کو اب ہجوم ثنا ساؤں سے اک دوری برتنا آگئی تھی، ایک اجتناب تھا جو وہ اپنا لیتا تھا، اب وہی ذات تھی اس کے درو دیوار تھے، اس کی تنہائی تھی، زگس کی دلجوئی اور تشفی اب زہر لگنے لگی تھی، اسے یوں لگتا تھا کہ زگس ہمدردی کی آڑ میں اس کی ذات کو بھگو بھگو کر طنز یہ لفظوں کی مار مارتی ہے جبکہ وہ زگس کی آنکھوں میں ہمدردی کا استلاشی نہ تھا، اسے سچی محبت کی طلب تھی، جب اس نے زگس کی محبت کی طلب کی تو زگس اب جمود کے اس دور سے گزر رہی تھی۔ جہاں ہر جذبہ ہر رشتہ محض دکھاوا بن جایا کرتا ہے، جب اسے ظفیری کے پر خلوص محبت بھرے جذبات کی ضرورت تھی تب ظفیری کے لئے زگس کوئی جذبات نہ رکھتا تھا، محض تحقیر بھرنے، تذلیل آمیز رویے، زگس کو بطور تحفہ دن رات ظفیری کی جانب سے ملا کرتے تھے اور وہ اب ظفیری کے اسی رویے کی عادی ہو چکی تھی، کسی قسم کے نرم جذبات حدت بھرے لمحات اور خوش گمانی نے اب اس کے دل میں جگہ بنانا اپنا گھیر بنانا بند کر دیا تھا۔ اب زگس کو فقط اپنی زیست کا ٹہنی تھی، خواہ کسی انداز میں بھی کٹ جاتی۔ جب زگس بھاگ بھاگ کر اس کی خدمت سر انجام دیتی تو ظفیری کو یوں لگتا تھا کہ اب وہ سب کے سامنے ظفیری کا مکروہ اور بھیانک چہرہ پوری شدتوں کے ساتھ اس پر آشکار کر دینا چاہتی تھی مگر ظفیری کی کسی بات کا اب زگس پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا کرتا، زگس ظفیری کی گردن پر ہاتھ پڑھانے کی

امرت بھج پی جایا کرتی تھی، اب وہ جان گئی تھی اور مان گئی تھی کہ اب العزت کبھی کسی انسان کو اس کی ہمت اور استعداد سے بڑھ کر نہیں آزماتا ہے، اس نے جو تذلیل بھرے دن کاٹے تھے، جو اذیتیں جھیلیں تھیں اب وہ تمام ہو چکی تھیں، اب اس کو فقط انصاف مل جانے کے بعد قرار حاصل ہو گیا تھا، مگر نامعلوم کیوں رات کے پچھلے پہر وہ سب سے چھپ چھپ کر روتی تھی، اسی ظفیری کے لئے جو اس کی تحقیر کر کے پر حسرت انداز میں فاتحانہ نگاہوں سے اسے نکا کرتا تھا، جب تک زگس کے چہرے پر اڈتے آزرگی کے گہرے رنگ نہ دیکھتا تھا، اس وقت تک ظفیری کے دل میں سکون جاگزیں نہ ہوتا تھا، جب وہ دیکھتا کہ اب زگس کے چہرے پر آزرگی در آتی ہے۔ رحزن اور پر ملال آنکھیں اس کے قلب کو اک عجب سی تقویت پہنچاتی تھیں، خاموش آنکھوں میں چھپے ہزاروں شکوے اس کو ایک پیغام دیتے تھے، مگر وہ ان آنکھوں کی زبان پڑھنے سے قاصر تھا، یا شاید سب جان کر بھی انجان بن کر رہتا تھا۔

”اب کھڑی کیا تماشا دیکھ رہی ہو، میرے بیٹے کی محرومی کا، جاؤ جا کر سوپ الاؤٹ، صبا بیگم کو زگس کے سامنے ظفیری کا یوں بے بسی کا اظہار کرنا نہ بھایا تھا، ساری عمر تو ظفیری نے صبا بیگم کے کہنے پر زگس کو بے مول بے قیمت کیا تھا، اب ظفیری کا کوئی دکھ زگس کی خوشی کا سبب نہ بن جائے، صبا بیگم کی بات پر وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی تھی، تھکے وجود تھکے قدموں کے ساتھ۔“

☆☆☆☆

”خرم بھائی آئے ہیں آ جاؤ بلا رہے ہیں۔“ ارم نے آ کر اسے کہا تو اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا، تھا، خرم سے اس کا ناٹھ محض کزن کا ہی نہ تھا بلکہ خرم اس کا وہ دوست بھی تھا، جس سے وہ ہر طرح کا دکھ سکھ سہا سہا کر لیتی تھی، خرم کے تمام مسائل

تمہارا رشتہ لے کر۔۔۔ ماں کو رشتہ کہلوا دینے کی ذمہ داری سوئپ کروہ بے حد مرشار اور بری الذمہ سا ہو گیا تھا۔ اگر اس کی ماں اسے منع بھی کر دیتیں تو وہ حکم کی تعمیل کرتا، مگر یہ اس کی خوش بختی تھی کہ ماں اس کی پسند کو پسند کر چکی تھی، سند قبولیت مل جانے کے بعد وہ بے حد پر جوش تھا اسی لئے آج وہ از خود ماں کے آنے سے پہلے پہلے زرگس سے بات کرنے کی غرض سے آیا تھا، زرگس سرمئی کالر کے میض شلوار میں ملبوس تھی، سادگی میں بھی اس کا حسن لشکارے مار رہا تھا، یا شاید اس کے دل پر ہی زرگس کا تسلط تھا جو اسے زیر بار کر دیتا تھا۔ اس کی نگاہیں زرگس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”السلام علیکم کیسے ہیں آپ.....؟“ زرگس نے مسکرا کر احوال دریافت کیا تو خرم بھی زیر لب مسکرا رہے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں آؤ بیٹھو بہت اہم موضوع پر بات کرنے آیا ہوں۔“ خرم کے کہنے پر وہ صوفے کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔

”جی کہئے، زرگس کے چہرے کے تاثرات اس امر کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ شدید الجھن کا شکار ہے کہ ایسی کوئی بات ہے جس کے لئے خرم باقاعدہ پس منظر باندھ رہے ہیں۔

”میں نے امی سے بات کی ہے۔“ وہ بے دبی لہجے میں جوش غالب تھا۔

”جی کس سلسلے میں.....؟“ زرگس نے حیرت سے دیکھا تھا پلٹ کے۔

”تمہارا رشتہ لائیں گی مجھ نا چیز کے لئے کیا تم شریف قبولیت بخشو گی۔“ خرم کے لہجے میں دکھ ناراضی سی تھی انہیں تو لگا تھا کہ زرگس بھی ان کے جذبوں کی گواہ ہے، چند لمحات تو زرگس دیکھتی ہی رہ گئی پھر سر جھکا کر بولی تو اتنا۔

”میرا خوش نہیں ہوگا۔“ خرم نے کھلی تھی۔

تمام فکریں اس کے کوشش گزار کر کے خود آسودگی میں ڈھل جایا کرتی تھی مگر جب سے اس نے خرم کی نگاہوں میں محبت کی داستان پڑھی تھی، وہ نامعلوم کیوں خرم کے سامنے جانے سے کترانے لگی تھی۔ خرم کی نگاہیں اب خاموش پیغام محبت دینے لگی تھیں اس کی نگاہوں میں زرگس کے لئے اتنا پیار ہوتا تھا کہ زرگس کی نگاہیں ان سے ٹکراتے ہی جھک جایا کرتی تھیں۔ خرم نے بھی لبوں سے اعتراف محبت نہ کیا تھا، شاید اس کی ضرورت بھی نہ پڑی مگر جب سے گھر میں زرگس کی شادی کا شور اٹھا تھا خرم مجبور ہو گیا تھا کہ اس بابت بات کرے۔ جب امی نے اسے بتایا تھا کہ خالہ جان زرگس کے آئے دن آنے والے رشتوں پر غور کر رہی ہیں بلکہ حد تو یہاں تب ہوئی کہ خرم کی والدہ یعنی اپنی ہم شیرہ کو ایک رشتے کے سلسلے میں مشورہ کی غرض سے پیغام کہلوا بھیجا تو خرم نے کلی سی محسوس کرنے لگا، تب اس پر آشکار ہوا کہ وہ زرگس کو دل و جان سے چاہتا ہے اسے کھونے سے ڈرتا ہے، اسے اپنا نام اپنی عزت بنانے کا متمنی اور خواہاں تھا، جب وہ یہ سب جان گیا تھا تو اس پر جھنجھلاہٹ سی سوار تھی، غالب کھولے وہ خواہاں تھا کہ سب مسائل از خود حل ہو جائیں ایک شام محتاط انداز میں اس نے اپنا عندیہ ماں کے سامنے رکھ دیا تھا اس کا خیال تھا کہ اس کی ماں کو اعتراض ہوگا، مگر یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، جب امی نے اس کو گلے سے لگایا اس کا ماتھا چوم لیا۔

”بیٹا میری تو حسرت تھی کہ میری بہن کا مجھ سے تعلق گہرا ہو جائے، مگر میں اپنی اولاد پر زور زبردستی کی قائل نہیں ہوں، یوں بھی زندگیاں تم لوگوں نے گزارنی ہیں، جو تمہاری آرزو ہوگی، وہی میری آرزو ہوگی، اب تم نے زرگس کا نام لیا ہے تو میں بہت خوش ہوں، زرگس بے حد سائقہ شعار اور ٹنک بجی ہے،

مجھے وہ برابر سے پسند ہے، میں کلی ہی جاؤں گی۔“

جب وہ اچانک بنا ملاوے کے آ کر تمہاری بیٹی کو اپنے بیٹے کے نام کی انگلی پہنا کر چلی گئیں، میری نازوں پٹی بیٹی تمہاری رشتہ داری کی بھینٹ چڑھ گئی ہے ورنہ اس کو رشتوں کی کمی نہیں ہے کئی خوشحال اور مالدار گھرانے میری بیٹی کے لئے شادی کے لئے متنی ہیں تم دونوں بہنوں نے خوب جال چلی اور وہی کیا جو تم دونوں بہنوں کی منصوبہ بندی تھی۔ شہر و سخت غصے میں اول فول بوسے بے جاتے تھے۔

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، کیسی منصوبہ بندی، وہ سیدھا سیدھا رشتہ لائیں مجھے تو معلوم ہی نہ تھا اس کے دل میں کیا ہے، کبھی اشارے کنارے میں بھی اس نے بات نہ کی تھی مجھے تو خود آپا کے سامنے ہی معلوم ہوا تھا، اگر آپ کو اس رشتہ پر اعتراض تھا تو آپ نے اسی وقت کیوں نہ کہا۔“ اقصیٰ کے حوالے سے الزام تراشی افشاں سے برداشت نہ ہوتی تھی۔

”ہوش کب آنے لگا، تمہاری بہن نے آنا فانا اپنا حق جتا کر چلتی بنی، خرم کے کندھوں پر تمام گھر کی ذمہ داری ہے، خود اس کی بڑی دو بہنیں اپنی شادی کے لئے بیٹھی ہیں، اب یہ تو تمہاری بہن کو سمجھنا چاہئے، تمہارا کیا میری بیٹی ان کی شادیوں تک اپنی عمر گزار دے گی، یا چاندی اتر آنے تک انتظار کرے گی، خرم کا پہلے وہ ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے اور پھر اس کے بعد آئے میری بیٹی کا ہاتھ تھامنے۔ شہروز کی باتیں اپنی جگہ اٹل حقیقت بھی تھیں، افشاں بھی ماں تھیں، ان ساری باتوں پر انہوں نے بھی غور کیا تھا، مگر یہ بھی ایک اٹل حقیقت تھی کہ بہن کی محبت ہر محبت پر غالب آگئی تھی، یوں انہوں نے اس وقت حامی بھرنی تھی اب میاں جی کے طعنے ان کو تکلیف اور اذیت میں مبتلا کرتے تھے، انہیں سمجھ نہ آتا کہ کیسے تسلی کریں ان کی، پھر یہ بھی تو تھا کہ بیٹی کی خوشی بھی ان کو از حد عزیز تھی۔

”خوشی نے دل کے در و دیوار میں شادیاں بجانے تھے۔“
 ”بالکل آپ کی ہمراہی کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتا ہے، میں تو اتنا جانتی ہوں آپ بے حد سلجھے ہوئے مزاج کے ہیں، میری ہر بات میں میری رہنمائی کرتے ہیں، حوصلہ افزائی کرتے ہیں، میری سوچ کو کنارہ دیتے ہیں۔“ زگس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی اپنے صادق جذبوں کی خبر کیسے خرم کو دیتی۔ بھی افشاں بیگم نماز عصر سے فارغ ہو کر آگئی تھیں، تو بات کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا، مگر دونوں کے دل سرشاری کی کیفیت میں تھے، جو بات کرنے خرم آئے تھے زگس نے اس بات میں ان کی ہمت افزائی کی تھی، اور ان کے دل کو ناامیدی میں تنہا نہ چھوڑا تھا، بلکہ امید کا جگنو تھا دیا تھا، وہ رات زگس کو آج بھی یاد تھی صبح کا انتظار کرنا ہی دشوار گزار تھا، پھر اگلی شام اقصیٰ بیگم نے خرم کے نام کی انگلی ہوا اس کے لئے ہوا کر لائی تھیں زگس کے ہاتھ کی نازک انگلی میں ڈال کر اسے اپنی بیٹی بنا لیا تھا، افشاں اور اقصیٰ بے حد خوش تھیں پھر نجانے کس نے اس کی خوشی کو نظر لگا دی تھی، دکھوں کا دور تو اسی وقت شروع ہو گیا تھا، جب خرم نے باہر جانے کی ضد کی تھی، ان کا خواب تھا کہ وہ اپنی شادی کو دھوم دھام سے ہوتا دیکھیں اور اپنی لئے وہ ڈھیر سا راز چھپے کمانا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کی زگس کو کسی بھی آرزو کے لئے ترسانہ پڑے وہ سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ زگس کی ہر آرزو خرم سے شروع ہو کر خرم پر ہی ختم ہو جاتی تھی، خرم کی محبت ہی اس کی زیست کا کل تھی، مگر شاید خرم کو یہ سب طے کرنے پر مجبور کرنے والے بھی کوئی غیر نہیں، خود خرم کے خالو زگس کے والد تھے جن کے نزدیک مال و متاع ہی زیست کا کل تھے، انہوں نے اٹھتے بیٹھے اپنی بیوی کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

جب خرم کے کانوں تک یہ ساری باتیں پہنچیں اور جب ایک دو ملاقاتوں میں شہروز صاحب نے خرم کو اس کی غربت کا احساس دلایا تو خرم نے دل میں عزم کر لیا کہ وہ خود نوگزس کا اہل ثابت کر کے رہے گا۔ اس لئے اس نے ابا جی کی آبائی زمین فروخت کی اور بیرون ملک جانے کی کوشش کی، قسمت کو منظور تھا شاید کہ اس کو جلد ویزا مل گیا اور وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لئے بیرون ملک چلا گیا، جانے سے پہلے وہ نوگزس سے ملنے آیا تھا، اسے معلوم تھا کہ اس وقت خالو جان دکان پر ہوں گے، انہوں نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے گھر کی سادگی سے ملنے والی خوشیوں کو گھوڑے اور اس کی بجائے مال و دولت زر کی طلب میں دور پر دیس چلا جائے، خرم دل میں تو خوش نہ تھا اسے بھی ملال تھا کہ وہ نوگزس سے اتنے عرصے دوری کیسے رکھ پائے گا، مگر دل کو مضبوطی بھی تو یہی احساس دیتا تھا کہ اس دوری کا عرصہ طویل نہ ہوگا۔ یہ وقتی ملنے والی دوری ابدی ملن میں بدل جانے والی تھی۔ نوگزس کی آنکھیں اشکبار تھیں، نم دیدہ نگاہوں میں حزن تھا، التجا تھی مگر اب خرم اپنے طے کئے گئے فیصلے سے منکر نہ ہو سکتا تھا۔

”نوگزس! میرا انتظار کرنا میں بہت جلد آؤں گا“ میں نہیں چاہتا کہ میری مفلسی اور غربت میری محبت کو بھی ارزاں کر دے۔ نوگزس خرم کے جانے کے بعد جیسے بالکل ادھوری رہ گئی تھی، اسے یوں لگتا تھا جیسے اب وہ اس دنیا میں بالکل تباہ رہ گئی ہو۔ اب نہ تو کوئی چارہ ساز تھا اور نہ ہی کوئی چارہ گر تھا، خرم کو گئے ہوئے تین سال ہونے کو آئے تھے مگر خرم کے گھر کے حالات سنور چکے تھے اس کے بھیجے گئے مالی و دولت سے اس کی دونوں بہنوں کی شادی ہو گئی تھی اب خرم کے آنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا، انتظار کی گھڑیاں جیسے اب بس کسی بل کو ہی اختتام پذیر ہونے والی تھیں۔ مگر وہ اب اپنی بہنوں کی شادیوں پر

تمام پال و متاع لٹا چکا تھا اب اس کی آرزو تھی کہ مزید رقم اکٹھی کر کے آئے تاکہ اپنے سر کے سامنے سر بلند ہو کر جی سکے، مگر اب شہروز کی ہمت جواب دے چکی تھی، انہوں نے اقصیٰ کے سامنے شرط رکھی کہ اگلے ایک ماہ کے اندر اندر اگر خرم نہ آیا تو وہ نوگزس کی شادی نہیں اور کر دیں گے۔ اصل حقیقت تو یہ تھی کہ شہروز صاحب کو اپنے ایک دیرینہ دوست کے توسط سے نوگزس کے لئے ایک بہت اچھا رشتہ مل گیا تھا، نہایت مالدار اور کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ تھے، اول روز سے ہی خرم کے لئے ان کا دل کسی طور پر آمادہ نہ تھا مگر وہ فقط اس لئے خاموش رہ گئے تھے کہ بیوی اور بیٹی کی خاموشی اس رشتے میں حامی بن کر ان کے سامنے ایک سبسہ پلائی دیوار کی مانند آن کھڑی ہوئی تھی، مگر اب اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی خرم اپنے وعدے کا پاس نہ رکھ پایا تھا، انہیں بھی اگر وہ واپس لوٹ کر آتا تو اس کے حالات اتنے اچھے نہ ہوتے کہ وہ سرخروئی سے جی سکتا، اس لئے مجبور ہو کر وہ باہر چلا گیا تھا، مگر اب شہروز کو ہر لحاظ سے اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے ایک اچھا رشتہ مل گیا تھا، اور خرم واپس نہ آ سکا اور جبراً شہروز نے آنا فانا نوگزس کی شادی ظفیری سے طے کر دی اور جس دن نوگزس و درخصت ہو کر ظفیری کے گھر گئی اس کے ٹھیک ایک دن بعد دل میں ہزاروں آرزوؤں کے دیپ جلانے خرم واپس لوٹ آیا تھا، خرم نے کئی بار فون پر اطلاع دینا چاہی تھی کہ وہ جلد آ جائے گا، مگر شہروز نے فون ہی اٹینڈ نہ کیا تھا، اور جب اقصیٰ نے آ کر اپنی بہن کو بتایا تو افشاں بھی اب اپنے میاں کی بہنو بن چکی تھی، اقصیٰ کو جب نوگزس کے رشتے کی اطلاع ملی تو وہ بے حد دلگرفتہ ہوئیں، مگر افشاں کے تپور بھی اس مرتبہ بدلے ہوئے تھے اور پھر شہروز نے انہیں صاف انکار کر کے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی اس بات کی اطلاع کر دیں وہ ناں نہیں کیسے پر دیس میں بیٹھے اپنے بیٹے

کی اس امید کو بھی توڑ ڈالتیں وہ لب بستہ تھیں اور اب جب خرم امید کے دیپ جلائے لوٹا تو سامنے خوشیاں نہیں بلکہ مدفن آرزو میں ان کی منتظر تھیں۔ نرگس خرم کی نہ بن سکی تھی بلکہ اپنے وجود میں امدتے تمام جذبوں کے باوجود محبت میں اعتراف کے تمام اٹوٹ رنگ سیٹھنے کے باوجود خرم کے لئے روپہلی سنہری کرنوں والے خواب بننے کے باوجود اور خرم کی راہ تک تک کرکئی ماہ و سال بتا دینے کے باوجود آج خرم کی نہیں بلکہ ظفری کی زوجہ بن کر اس کی زندگی میں مسرتوں کے رنگ بھرنے چل دی تھی خرم کو مایوسی کا شدید ترین دورہ پڑا تھا وہ ایسا مسافر تھا جس نے اپنا تمام مال و متاع لٹا دیا ہو اب اس کے ہاتھ میں سفر زاد راہ باقی نہ رہا، وہ تپتی دامن رہ جانے کا ملال اور گہرا دکھ اس کی ذات میں بکھری اس کی محبت کی انا کی بے شمار کرچیاں اس کو کچھ کے لگاتی تھیں وہ محو حیرت تھا اپنے سنگے رشتہ داروں کے اس ناروا سلوک پر ایسی نا انصافی پر دوسری جانب نرگس کے پاس کوئی مدلل جواز نہ تھا وہ باپ کے سامنے دو بدو کھڑے ہو کر انکار کی جرأت نہ پائی تھی وہ والدین جن کی شفقت اور محبت کے سائے تلے اس نے ایک عرصہ بنایا تھا وہ کہاں اس کے لئے کچھ برا چاہ سکتے تھے وہ اپنی اولاد کی خوشیوں کے لئے اس کے سنہری مستقبل کے لئے کچھ اچھا ہی سوچ رہے ہوں گے نرگس نے سر جھکا دیا تھا اپنی محبت کو سرنگوں کر کے۔ اپنی عاجزی ثابت کر کے والدین کو سرخرو کر کے اپنی عزت و ناموس اور زندگی کے تمام تراہم ترین فیصلے کو اپنے والدین کے آگے سر تسلیم خم کر کے۔

☆☆☆☆

شادی کے ایک ہفتہ بعد اگر وہ ظفری کے ساتھ خوش نہ تھی تو ایسی ناخوش بھی نہ تھی اگر اس دن انصافی حالہ نہ آجاتیں اور اس کی آرزو اور بلکتی ہوئی سستی ہوئی روح کی پرواز کے آخری پر بھی نہ کاٹ

ڈالتیں۔ صبا میگم قطعاً زواجی مسائل نہ تھیں بلکہ وہ نرگس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آرہی تھیں اس کی ہر بات میں ان کا رویہ مثبت تھا نرگس خرم اور نرگس گفتار تھیں مگر یہ نرگس گفتاری اور نرگس مزاجی اس وقت ختم ہو گئی تھی پل بھر میں جب انصافی نے آ کر ظفری اور صبا کے سامنے ان کی بہو اور اپنی بھانجی کو بددعاؤں کا تحفہ دیا تھا۔ صلواتیں سنائی تھیں اپنے بیٹے کی ناکام آرزوؤں کا مجرم نرگس کو اس کے والدین کو ٹھہرایا تھا نرگس کسی کٹہرے میں کھڑے ملزم کی مانند ہر لگائے جانے والے جرم پر سر جھکائے کھڑی تھی وہ اب دکھوں کو خود اپنی ذات پر پڑتے دیکھنا چاہتی تھی اگر وہ ایک مرتبہ آواز بلند کر سکتی تو شاید یہ شاید ہی تھا جو اس کو ڈستا تھا دن رات اس کے ضمیر کو ستاتا تھا اور پھانس بن چکا تھا اور آج جب اس کی اکلوتی نیا لہ نے آ کر اس کی تمام رواد میں مجرم گردانا تب بھی اس نے اس کی مخالفت میں ایک لفظ تک نہ کہا تھا۔

”کیا تصور تھا میرے معصوم بیٹے کا یہی کہ وہ غریب ماں کا غریب بیٹا تھا مگر کیا اس کی محبت میں کہیں کوتاہی ہوئی ارے وہ تو دور پردیس تیرے وعدے کا پاس رکھنے ڈال کر کمانے گیا تھا مگر تیرے باوا کی حرص و ہوس تمام رشتوں کو لے ڈوبی ایک بہن سے دوسری بہن چھین گئی۔ ایک خاندان اجڑ گیا اور میرا بیٹا جس دن سے وطن واپس لوٹا ہے اسے چپ لگ گئی ہے کمرے میں بند پڑا رہتا ہے آہ بوٹی آنسو تک بھی تو نہیں بہایا اس نیک بخت نے نہیں ہوں مجرم اس کی ناکام خوشیوں کی میرا بیٹا مر جھا گیا ہے تو قاتل ہے نرگس یاد رکھنا تو بھی ان پر آسائش اور پر تعیش زندگی کے باوجود کبھی خوش نہ رہ سکے گی ارے اگر تجھے میرا نہیں تو اپنی محبت کا ہی کچھ پاس ہونا اگر تو نے میرے لال کو توڑنا ہی تھا تو اپنے نام کے ساتھ اس کا نام جوڑا ہی کیوں تھا کیوں تو نے اس کو اتنے سال اپنے نام کی آسن پر رکھا بتا مجھے اب تو کس کو

دھوکا دینے پلٹی ہے اس عایشہ ان گنہگار میں اب میرے بیٹے کی موت پر قہقہے لگانا اگر میرے بیٹے کو کچھ ہوا تو میری بددعا ہے تو بھی خوش نہ رہ سکے گی تجھے بھی قرار نہ ملے گا تو بھی روئے گی جیسے تو نے میرے بیٹے کے دل کو رولایا ہے۔ افسیٰ خالہ نجانے اور کب تک اور کیا کیا بولتی رہی تھیں مگر وہ سن ہی کب رہی تھی اس کا محبوب اذیت سے دوچار تھا فقط اس کی وجہ سے اس نے خود کو لہرا کر گرتے ہوئے دیکھا تھا اس کو پھر کوئی ہوش نہ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کا زوریں بریک ڈاؤن ہوا تھا اس کو کوئی دن بعد ہوش میں آتے دیکھ کر افشاں نے شکر ادا کیا تھا، سبج ہاتھ میں تھا مے افشاں کبھی اسی اور کبھی روتی تھیں۔

”شکر ہے کہ ہمیں ہوش آ گیا، آج پانچویں دن ہے تم ہم سب کو دیکھ کر بار بار بے ہوش ہو جاتی تھیں دیکھو بتاؤ میں کون ہوں.....؟“ افشاں محبت اور آس سے پوچھ رہی تھیں اور زنگس ناں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”میری خوشیوں کی قائل۔ ایک آنسو تھا جو اس کے گال کو بھگو گیا تھا اس جال تک لانے والی کوئی اور نہ تھی بلکہ اس کی ماں ہی تو تھی اس کی مجرم اس کے دل کے ہر راز سے آگاہ مگر جان کر بھی انجان بن جانے والی مصالحت کی چادر اوڑھ لینے والی۔“

”ہاں مجھے بتا دیا ہے سب صبا آپا نے مگر میں نے بھی ان کی تسلی کر دی ہے معنی تھی اور سب کی معنی ہوا کرتی ہے ایسا کوئی خاص ناطہ نہ تھا کہ تم کو یوں تمہارے سسرال میں آ کر تماشا بنایا جائے اور رسوا کیا جائے۔“ افشاں بولیں۔

”خاص ناطہ.....“ وہ محض اتنا بول پائی تھی ناطہ تو درحقیقت دل کا ناطہ ہوا کرتا ہے باقی سب تو محض خرافات ہیں اس کے دل نے خرم کو اپنا سب کچھ اس دن مان لیا تھا جب شعور کی سیڑھی پر اس نے پہلا قدم رکھا تھا مگر اب ہر ناطہ ٹوٹ چکا تھا سب کچھ ختم ہو چکا تھا کچھ بھی باقی نہ رہا تھا اب نام کے رشتے تھے جو

زنگس کو بچانے تھے تا حیات۔ ظفری کا رویہ اس کے ساتھ سخت تلخ ہو چکا تھا وہ تو زنگس کو طلاق کا طوق دے کر فارغ کر دینا چاہتا تھا مگر وہ صبا بیگم ہی تھیں جن کو زنگس کی ای نے راضی کر لیا تھا اور ان کو یاور کرایا تھا کہ منتہی محض چند دن سے زیادہ نہیں رہی تھی اور ختم بھی کر دی گئی تھی یوں ظفری صبا کے کہنے میں مجبوری میں زنگس کے وجود کو برداشت کر رہا تھا مگر وہ اپنی تذلیل محسوس کرتا تھا دنیا کا کوئی بھی مرویہ گوارہ نہیں کر سکتا کہ اسے ٹھکرا کر کسی دوسرے مرد کو اس پر فوقیت اور ترجیح دی جائے یہ کنھن مرحلہ تھا کہ ظفری زنگس کو برداشت کر رہا تھا اب ظفری کو احساس ہوتا تھا کہ زنگس کیوں سراپا نم بنی رہی تھی اس کی آنکھوں میں حزن و ملال کی کیفیت کیوں جم سی گئی تھی ظفری دن رات زنگس کو خرم کے نام کے طعنے دینے لگا تھا اسے ظفری کی ذات سے پہلے بھی بہت گلے تھے مگر ان تمام باتوں کو وہ ہنسی میں اڑا دیا کرتی تھی ظفری ایک دل پھینک انسان تھا جو فطرتاً بے باک بھی تھا اس کا نظر بازی کا انداز بھی زنگس سے پوشیدہ نہ رہا تھا بلکہ اپنے عشق قہے وہ بے حد شوق سے فخر یہ انداز میں زنگس کو سنایا کرتا تھا مگر زنگس نے کبھی اس معاملے میں ظفری سے باز پرس نہ کی تھی۔ مگر زنگس کی معنی کی بابت جب سے ظفری کے کانوں میں ہنگ بڑی بھی ظفری نے دن رات زنگس کو خرم کے نام کے طعنے دینا شروع کر دیئے تھے۔

☆☆☆☆

زنگس سراپا صبر بن چکی تھی کئی مرتبہ اس کا بھی دل کرتا تھا کہ وہ ظفری سے اس کے اسکیڈلز کی بابت پوچھے مگر وہ لب بستہ رہتی تھی شکایت کرنا اور گلہ کرنا اس نے جیسے سیکھا ہی نہ تھا اسے یاد تھا کہ ایک دفعہ ظفری نے غصے میں آ کر جلتے سگریٹ کے ٹکڑے سے اس کے بازو کو جلا ڈالا تھا وہ سسکیاں بھرتی رہ گئی تھی اور اب وقت ایسا بھی آیا تھا کہ وہ بستر پر ڈھیر پڑا

خدا مان کر اسے شوہر کی مسند پر بٹھا دیا تھا وہ اس کی ہر بات پر بخوشی سر جھکا دیا کرتی تھی مگر ظفری نے نرگس کی کئی کئی بات پر راضی ہونا سیکھا ہی نہ تھا ظفری کو اس محتاجی میں بھی نرگس کی قربانیوں کی پردہ نہ تھی اس کو احساس تک بھی نہ تھا۔ نرگس پر قیامت ایک اور بھی ٹوٹی تھی اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے والد اب اس دنیا میں نہیں رہے ان کی سانس کی ڈر ٹوٹ چکی تھی وہ بے حد آزرده تھی آنسو تھے کہ تمہیں کا نام نہ لیتے تھے وہ کسی سے باپ کے گھر واپس آئی تھی۔ ہر آنکھ نم تھی اطراف چیخوں سے گونج رہی تھی مگر اس کی اپنی دکھ بھری چیخ کہیں دب گئی تھی۔ جنازہ اٹھا تو اکبر ام اٹھا تھا اور وہ تب بھی کسی گھر سے آئے اور صدے میں تھی اس کی آنکھ میں اس وقت بھی کوئی آنسو نہ آیا تھا پلکوں کی باز توڑ کر کوئی آنسو ایسا نہ تھا جو بہ کر اس کے غموں کو بھی دھو ڈالتا دوسرے دن بھی اس کی یہی حالت تھی گم صم سی تھی اور جب اس کی والدہ کو اپنے عم کے آگے اپنی بیٹی کی چپ کا احساس ہوا تو وہ چونک سی گئی تھیں ان کے بار بار گلے لگانے کے باوجود وہ روئی نہ تھی۔

”بیٹا! کیوں اس قدر سنگ دل ہو گئی ہو رولو بیٹا ان آنسوؤں کو بہنے دو تم جانتی ہو تمہارے بابا جان تمہارا عم ہی نے کر اس دنیا سے چلے گئے ہیں جب کبھی ظفری کا فون آتا کہ تم کو آ کر لے جائیں وہ مزید اب تم کو برداشت کرنے کا دار و مدار نہیں ہے تب پھر وہ دل برداشتہ ہو جایا کرتے تھے انہیں بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے تمہارے ساتھ زیادتی کر ڈالی ہے تمہاری رحمتی کے بعد ایک دن خرم آیا تھا اس نے تمہارے بابا کو ان کا وعدہ یاد دلا کر اس کی بابت دریافت کیا تھا اور پوچھا تھا کہ انہوں نے خرم کے ساتھ اور تمہارے ساتھ اتنی زیادتی کیوں کی؟ اگر انہوں نے اس رشتہ کو برقرار رکھا ہی نہ تھا تو استوار ہی کیوں کیا تھا پھر ان دونوں کا نام جڑ جانے کے بعد

تھا رُوڈ ایکسیڈنٹ میں حادثہ کی بدولت اپنی ٹانگ فریکچر کروا بیٹھا تھا بعد میں کئی طرح کے ٹیسٹ کرانے کے بعد بھی ڈاکٹرز نے بتایا تھا کہ شاید اب وہ اپنے قدموں پر تاحیات کھڑا نہ ہو سکے گا اور پھر نرگس کو ایک نئے طرح کے حادثے سے دوچار ہونا پڑا تھا ظفری کا سارا غصہ اب بھی نرگس کی ذات پر اترا کرتا تھا۔ اس کو ہی وہ اس حالت کا ذمہ دار اور قصور دار ٹھہراتا تھا بقول ظفری۔

”تم اول دن سے میری بن ہی نہ سکیں آج بھی تمہاری آنکھوں میں کسی نا محرم کے عکس جھلکتے ہیں تم وفادار نہیں وفا کیا ہوتی ہے تم نہیں جانتی ہو ہر وقت تمہارے یہ گرتے آنسو اس بات کا عین ثبوت ہیں کہ تم آج بھی اس کی یاد میں تڑپتی ہو تم کیسی بیوی ہو جسے اب بھی اپنے بستر مرگ پر پڑے شوہر کا خیال نہیں اس نا عیبی بعید کے رشتے کا آج بھی اتنا لحاظ اور پاس ہے۔“ وہ جب بولتا تو پھر لفظ خنجر بن کر اس کی روح کو گھائل کر دیا کرتے تھے نرگس اس کی کڑوی کسی باتیں صبر سے سنا کرتی تھی ہنوز خاموشی کے بادل چھائے رہتے تھے وہ بڑھ چڑھ کر ظفری کی خدمت کیا کرتی تھی اس کے بال سنوارنا کپڑے تبدیل کرانے میں مدد کروانی اس کو کھانا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی اور جب وہ کپڑے گندے کر دیتا تو بھی وہ بنا ماتھے برہمن لائے اس کو از سر نو کسی نوزائیدہ بچے کی مانند تیار کرتی تھی اب نرگس کو خدا کی حکمت سمجھ میں آئی تھی کہ شادی کے تین سال گزرنے کے بعد بھی اس کی گود کیوں سونی تھی وہ آج تک کیوں خالی گود رہ گئی تھی کیونکہ ظفری کے ساتھ یہ سانحہ پیش آتا تھا اس کے بعد اس نے ظفری کا خیال رکھنا تھا اور اس کی زندگی کا مرکز و محور فقط ظفری ہی تھا وہ اس لئے اب جیتی تھی اب اس کے دل میں خرم کی یاد کا کوئی عکس باقی نہ تھا۔ جس دن نرگس بیاہ کر ایک دہلیز مار کر کے دوسری دہلیز آئی تھی تب ہی اس نے ظفری کو اپنا محارمی

جب کے ان کے تمام صادق جذبے بھی ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے تھے اس رشتہ کو پل بھر میں کیوں فراموش کر کے نئے سرے سے کیا گیا ایک نیا فیصلہ نرگس پر مسلط کر دیا۔ جب تمہارے بابا کو تم پر گزرنے والے حالات کا علم ہوا تو وہ ٹوٹ سے گئے تھے ان کی جامد خاموشی ان کے پچھتاؤں کا منہ بولتا اظہار تھی وہ تنہائی میں روتے تھے مگر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا اور گیا وقت کبھی بھی لوٹ کر واپس نہیں آیا کرتا تم جانتی ہو آخری دنوں میں تمہارے بابا تمہیں بے حد یاد کیا کرتے تھے ان کے لبوں پر صرف تمہارا نام رہتا تھا جب کبھی میں کہتی کہ نرگس کو بلالائی ہوں تو بولتے تھے رہنے دو میں اب اس کا سامنہ کرنے سے کترانے لگا ہوں۔“ افشاں کی آخری بات پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی اس کے بابا نے اسی لئے اس کی ناراضی کے خوف سے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لی تھیں اس کی قسمت میں اس طرح بابا سے ملنا تھا افشاں بھی اس کے ساتھ ساتھ رو رہی تھیں مگر آنسو بھی اب اس کے بابا کو واپس نہ لاسکتے تھے۔

☆☆☆☆

وہ ہفتہ بعد واپس لوٹی تھی ظفری کے کمرے میں گئی ظفری آنکھیں موندے لیٹا تھا نرگس نے رکارا تو اس نے جھٹ آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان آنکھوں میں رقم ناراضی اور انتظار کی واضح تحریر پڑھی جاسکتی تھی اس نے بے رخی سے منہ پھیر لیا تھا۔

”اب بھی کیوں آئی ہو جانتی نہیں مجھے تمہاری کتنی ضرورت ہے پہلے سے بھی بڑھ کر۔“ یہ لہجہ ظفری کا لہجہ تو نہ تھا بھرا بھرا ٹوٹا ہوا لہجہ۔ اس کی بڑھی ہوئی شبیو اور بگڑا حلیہ اس کی اداسی کا سبب تھا وہ بے حد برمژدہ دکھائی دے رہا تھا۔

”شکر ہے نرگس! تم واپس لوٹ آئی ہو ظفری مجھے اپنا کوئی کام کرنے نہیں دے رہا تھا دیکھو کتنا برا حلیہ ہو رہا ہے میں جب بھی اس کے پاس آتی ہوں

یہ مجھے جھٹک دیتا ہے۔“ صبا نے چور لہجے میں کہا۔ نرگس نے سب سے پہلے الماری سے ظفری کے صاف ستھرے کپڑے نکالنے ظفری کا منہ ہاتھ دھلوا لیا، کپڑے تبدیل کروا کے اس کے بالوں کو برش سے سلجھایا، ظفری کس فرماں بردار بچے کی مانند اس کی تمام باتوں کو بلاچوں چراں مان رہا تھا پھر نرگس نے اسے سہارا دے کر بیڈ پر بیٹھے کے سہارے بٹھا دیا، اتنے کاموں میں ہی ظفری تھکن سے چور ہو گیا تھا۔ ظفری کو چھوڑ کر وہ واپس پلٹ کر یکن میں آگئی تھی ظفری کے لئے اس نے ایک فرائیڈز راس اور ساتھ میں ٹرانگل بنائے وہ کھانا بنانے کے بعد سیدھا ظفری کے پاس لائی تھی۔ اس نے پہلا چیخ ظفری کے منہ میں چا دلوں کا ڈالا تو ظفری کی آنکھیں نم تھیں۔

”رہنے دو میں خود کھا لوں گا۔“ ظفری نے رست آواز میں کہا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

نرگس نے سنی ان سنی کر کے دوسرا چیخ بھرا اور ظفری کے منہ میں ڈال دیا، ظفری نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”نرگس! اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھنا ہے میں تمہاری قدر و قیمت جان گیا ہوں تم میرے لئے کتنی ضروری ہو گئی ہو یہ بھی جان گیا ہوں نرگس اگر میں تم سے اپنی خطاؤں اپنے ناروا سلوک کی معافی مانگوں تو کیا تم مجھ گناہ گار کو معاف کر دو گی.....؟“ ظفری نے دکھ سے پوچھا تھا اس کے لہجے میں آس کے جگنو بھی تھے اور مایوسی کا خوف بھی پہاں تھا۔

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی اور مجھے آپ سے کوئی گلہ کوئی شکوہ نہیں ہے۔“ نرگس نے استعجاب سے پوچھا۔

”تمہارے جانے کے بعد میری آنکھیں جو تمہارے وجود سے تانوس ہو چکی تھیں پھر لہجہ ان کو

شعاری اور اطاعت گزار بھی تھی۔ ظفری کے چہرے پر ہلکا ہلکا جوش بکھرا تھا وہ زندگی کی نوید بن کر زگس کی زندگی میں چھائے اداسی کے بادل کو خوشی میں بدل دینا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ زگس نے سر جھکا کر اس کی بات سنی تھی اور بخوبی سمجھتی بھی تھی مگر اس کے چہرے پر کسی قسم کے خاص تاثرات نمودار نہ ہوئے تھے اس نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا ظفری کے منہ سے کہی جانے والی ہر بات اس کے لئے خود بخود حکم کا درجہ بن جایا کرتی تھی اس نے اپنا سب سے پیارا کام والا سوٹ نکالا اور زیب تن کیا تھا دل لگا کر تیار ہوئی تھی اس کا دل اداس تھا مگر جتنا سنورنا تو اس نے تھا بالوں کو اس نے کچھ میں جکڑا دوپٹہ کندھوں پر پھیلا یا اور باہر آنگن میں آگئی۔ ظفری نگاہیں جوں ہی اس کے چہرے پر ٹھہری تھیں ان میں محبت کے بہت سے دیپ روشن ہو گئے تھے۔ ظفری کو سنبھالی نکھری نکھری زگس بے حد دل کے قریب لگی وہ اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھ رہا تھا آج زگس کو بھی شرم سی محسوس ہو رہی تھی آج سے پہلے تو اسے ظفری کی نفرتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر آج ظفری کی نگاہوں میں نفرت نہیں بلکہ گہری محبت رقم تھی زگس خیران تھی اس کا پلٹ پڑا اس کو سمجھ نہ آ رہی تھی کہ قدرت اچانک اس پر یوں بھی ہریان ہو سکتی ہے اسے اپنی تقدیر پر یقین نہ آ رہا تھا مگر یہ سب کچھ کوئی حسین خواب نہ تھا بلکہ ایک سچائی تھی ظفری کی محبت کی حدت سے زگس اٹکلنے لگی تھی آج ظفری اور زگس نے ایک دوسرے کو سچے دل سے اپنا لیا تھا ظفری جان گیا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں زگس کو بہت سی تکلیفیں دی تھیں مگر اب وہ ان کا مداوا کرنا چاہتا تھا اور زگس بھی نئے سرے سے اپنی زندگی میں نکھار لانا چاہتی تھی اب ظفری اور زگس ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے منزل تھے۔

تمہاری آمد کا انتظار رہنے لگا تم پہلے بھی مجھے یوں چھوڑ کر ہی نہ گئی تھیں میں سمجھ ہی نہ سکا کہ تم تو میری زیست کا کل ہو تمہاری کی تو مجھے اس وقت شدت سے محسوس ہوئی جب تم ایک ہفتے تک نہ آئیں مجھے احساس ہوا تم یہاں نہیں ہو کہیں اور ہو میں نے جان لیا ہے کہ تم میری کل کائنات ہو میرے جینے کی اب واحد وجہ تم ہو پلینز زگس مجھے چھوڑ کر اب بھی مت جانا۔ وہ سچی انداز میں گویا ہوا تھا۔ زگس ہنوز خاموش تھی لب بستہ کیا بولتی اس کے پاس اب کہنے کا کوئی حرف نہ تھا۔

ظفری زگس کی تمہاری سے کی جانے والی دیکھ بھال کے نتیجے میں دن بدن صحت مند ہو رہا تھا اس کا جسم مکمل سا چہرہ اب ہر پل زگس کے چہرے کا طواف کرتے ہوئے طمانت لئے ہوتا تھا۔ اب وہ سہارے سے لاشی ٹیک کر چلنے لگا تھا اس کو اب زگس کے ساتھ کی عادت ہو چکی تھی۔ زگس اگرچہ اس کی ہر خدمت بجالاتی تھی مگر وہ خاموش رہتی تھی کوئی کائنات تھا جہاں بن کر ان دونوں کے رشتے کے بیج اٹکا ہوا تھا زگس یوں لگتا تھا جیسے مھن اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے وقف ہو چکی ہے اس کا اوڑھنا بچھونا مرکز و محور فقط ظفری کی ذات تھی۔



اس شام دھوپ دے ہی ڈھلی تھی شام اس طرح آنگن میں اتری تھی بالکل اسی طرح جیسے روز اترتی تھی آنگن میں۔ مگر اس شام کی خاصیت یہ تھی کہ ظفری نے زگس سے التجا کی تھی۔

”زگس! تم بحق سنورنی کیوں نہیں ہو میری خواہش ہے کہ تم میرے لئے سب سنورو بہت اچھا سا تیار ہو میرے لئے۔“ وہ بے حد جذب سے بولا تھا۔ اب وہ مکمل صحت مند ہو چکا تھا ہلکا سا لنگ تھا مگر بظاہر وہ ایک صحت مند مکمل انسان تھا جو ذہنی طور پر بھی آسودہ جاں تھا۔

افسانہ

زندگی کے رنگ

برسار ہی نہیں۔

”چلیں بھابی اندر“۔ فائزہ کو کندھوں سے تھام کے وہ اندر لے آیا۔ عاصم بھائی نے دھیرے سے صائم کا بازو پکڑتے ہوئے تانیہ کے برابر میں بٹھا دیا، چند ہی لمحوں میں مولوی صاحب نے نکاح کروا دیا۔ نکاح ہوتے ہی صائم بائیک لے کر نہ جانے کہاں نکل گیا، فائزہ اپنے کمرے میں بندھی، تاپا ابو چاچو سے بے حد شرمندہ تھے اور چاچو وہ تو سمجھ ہی نہیں پارے تھے کہ ان کا کونسا بیٹا قصور وار ہے، ذرا ٹھہریں؟ پھر ڈاڑھیچھے سے شروع کرتے ہیں۔

☆☆☆☆

جب اس بڑے سے گھر کے آگن میں چاروں طرف معصوم بچپن کا راج تھا، تائی اماں اور چچی آپس میں لگی بہنیں تھیں سو روایتی دیوارانی جینٹلمانی والی دشمنیاں نہ ہونے کے برابر تھیں، دادا ابو کو گزیرے کئی برس ہو چکے تھے اور کشادہ سے لی وی لاؤنج میں ایک طرف رکھے جہازی سائز تخت پر صرف دادی حضور کی حکومت تھی، صبح کے وقت اچھی خاصی بلچل مچی ہوتی، کسی کو آفس سے دیر، کسی کو اسکول جانے کی جلدی، کچن اچھا خاصا آباد ہو جاتا، اس کے بعد خواتین کے لئے صنائیوں اور دھلائیوں کے سلسلے شروع ہو جاتے، دوپہر میں پھر سے رفتہ رفتہ ادھم مچنا شروع ہو جاتا اور رات کا کھانا تو ہمیشہ سے ہی ایک روایت تھا، تائی برسوں سے چلی آئی ایک روایت پورا

”میں ندا سے شادی کرنا چاہتا ہوں“۔ پورے خاندان کے سامنے اس نے دھماکہ کیا تھا آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، منہ کھلے کے کھلے رہ گئے، صائم نے حیرانی کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے فائزہ کی طرف دیکھا تھا جو بے یقینی سے اپنے شوہر کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ انکار کرنا کسی اور نے تھا لیکن کر کسی اور نے دیا، جواباً اقرار کرنا کسی اور نے تھا لیکن..... کر کسی اور نے دیا۔

تاپا ابو حیران، چھوٹے چچا پشیمان اور دادی وہ اپنے پچاس سالہ جہازی سائز تخت پر لڑھک گئیں۔ ”دادی جان!“ عاصم بھائی اور چھوٹے چچا تیزی سے ان کی طرف آئے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے“۔ انہوں نے دیکھ سے عزیزین کی طرف دیکھا، فائزہ کسی بت کی مانند ساکت کھڑی تھی۔ ”برخوردار! تم بھی ابھی بتا دو تمہارے کیا ارادے ہیں“۔ ندا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے تاپا ابو نے صائم کی طرف دیکھا سارے پلان کا استیہانہ ہو چکا تھا تانیہ دم بخود اس کے فیصلے کے انتظار میں تھی۔

”جیسے آپ کی مرضی ابو!“ آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے کنویں میں پھلانگ لگا دی، عاصم بھائی اسے دیکھ کر رہ گئے، عتبہ نے ندا کے برابر سے اٹھتے ہوئے بازو سے پکڑ کے عزیزین کو وہاں بٹھا دیا۔

”بہت مبارک ہو“۔ اس کی آنکھیں چنگاریاں



میں اکثر اوقات تانیہ بھی آجاتی تھی، فائزہ کے ساتھ اسے ہی کمرہ شیئر کرنا پڑتا، کیونکہ ایک دفعہ واوی حضور نے اسے صائم اور عتبہ کے کمرے میں سوتا دیکھ لیا تھا تو انہیں ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے بجاتھا، دوپہر میں اوچی آواز میں گانے اور بے ہودہ ڈانس، تانیہ رونے والی ہو جاتی اور نتیجتاً وہ ان دونوں کے کمرے میں جلا وطن کر دی جاتی، بعض اوقات ندا اور عزیز بڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں دو دو جڑ بھی دیتے، لیکن۔ دوپٹیاں کتھے گھٹیاں (دو پڑیں۔ کہاں کہیں) کچھ دیر بعد پھر وہی ہو ہو ہاہا، ندا چڑ جاتی۔

”گھر ہے یا مچھلی بازار“

”مچھلی بازار“۔ تینوں کورس کی شکل میں گاتے دوپہر کے کھانے کے بعد ٹھنڈے ٹھار آم کھانے کا مقابلہ ہوتا، وہ کھائے کم جاتے اور ان بیچاروں کی بے حرمی زیادہ ہوتی، پورا لاؤنج پیلا پیلا ہو جاتا اور آموں کے بعد جی لسی سب سے زیادہ شامت فائزہ کی آتی، اسے جی لسی بالکل پسند نہیں تھی لیکن وہ دونوں زبردستی اسے گلاس، گلاس ٹھنسو دیتے، واوی حضور بمشکل اس بیچاری کی گلو خلاصی کروا تیں، سورج ذرا اچان مزاج دھیمہ کرتا تو گیند اور بلا لے کر لان میں نکل جاتے کسی کی کھڑکی کا شیشہ تو کسی کا مہنگا ترین گلازرات کو پکڑ خوفناک ترین لاؤنج چیخوں سے ہی گونجتا رہتا، کچھ اصلی اور کچھ نقلی، چھٹیاں ختم ہوتیں تو وہ واپس جاتے ہوئے بھامیں بھامیں رو رہی ہوتی، عتبہ تو باقاعدہ کمرے میں بند ہو جاتا، درمیان کے چار ماہ نہ جانے کیسے گزرتے اور بڑے دنوں کی چھٹیاں ہوتے ہی وہ پھر آدھکتی اب کے آموں کی جگہ کیو اور لسی کی جگہ کانی لے لیتی، بڑے دھڑلے سے وہ ان دونوں کے ساتھ ایک ہی رضائی میں گھس جاتی تائی اماں دھک لگا لگا کر باہر نکالتیں۔

”شیرم کر فائزہ اجوان ہو گئی ہے۔ وہ ایک کان

خاندان اکٹھا ہونا تانیا ابو کے تین بچے تھے سب سے بڑے عاصم بھائی جن کا کام ہمیشہ صلح صفائی کروانا ہوتا، ان سے چھوٹی ندا اور سب سے چھوٹا صائم چاچو کے آنگن میں بھی تین ہی پھول تھے سب سے بڑا عزیز جو عادت میں بالکل ندا جیسا تھا، خاموش طبع اور انتہائی نفاست پسند، اس سے چھوٹا عتبہ اور سب سے چھوٹی تانیہ۔ تانیہ حد سے زیادہ لئے دیئے رہنے والی لڑکی تھی سو اس کی صائم اور عتبہ سے کبھی نہ بن سکی، ہاں اگر اس گھر کے آنگن میں دوستی کی کوئی مثال قائم ہوئی تو وہ صائم عتبہ اور فائزہ کی تھی، واوی حضور کی انگلی اور لاڈلی نواسی فائزہ جس کا نام فائزہ دی پٹاخہ مشہور تھا، ان تینوں کا ایک ہی کام تھا ہر دم آفت پھیلانے رکھنا، گرمیوں اور سردیوں کی چھٹیوں میں اس کے آجانے کے بعد تو جیسے صائم اور عتبہ کو اور چھوٹ مل جاتی، تینوں مل کر وہ طوفان بدتمیزی مچاتے کہ خدا کی پناہ۔ عاصم بھائی کی جھڑکیاں اور عزیز کے ڈراوے بھی ناکام ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ وقت گزرا اور بچپن نے جوانی میں قدم رکھ دیا۔ عزیز نے وہ قد کاٹھ نکالا کے ماں باپ نظر بھر کر دیکھنے سے کترانے لگے۔ واوی ہر دم پلاٹیں لیتی چائیں اور اس کی برابری اگر کوئی کر پاتی تھی تو وہ ندا تھی، واوی حضور کی سب سے خوبصورت پونی بے نیازی تو اس میں پہلے ہی تھی جوانی کا نشہ چڑھتے ہی غرور بھی آگیا، گردن کچھ اور اکڑ گئی، سب کچھ بدل گیا سوائے ”تھری ایڈیشن“ کے وہ تینوں اب بھی ویسے ہی تھے بقول واوی حضور کے چھلاوے۔ بقول عزیز اور ندا کے لٹنگے۔ اور بقول عاصم بھائی کے دل والے۔ اب بھی جیسے گرمیوں کی چھٹیوں میں کالج بند ہوتا، فائزہ ماں باپ کی ایک بھی سنے بغیر نانی کی طرف بھاگ آتی اور وہ دونوں لٹنگے اسے باقاعدہ تاجتے ہوئے کندھوں پر بٹھا کے گھر لے کر آتے، صبح صبح ایک دوسرے کو جگانے کے ہنگامے جن کی لیٹ

ایکسی وقت میں فائزہ کے ماں باپ نے جانیں گنوا دیں وہ ایک دم تن تنہا ہو گئی۔ رویرو کرداوی کے بازوؤں میں تڑپ تڑپ جاتی اور سبھی وہ ہو گیا جو شاید نہیں ہونا چاہئے تھا آخری سانس لیتے ہوئے شاز یہ پھپھو نے عزین کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”میں فائزہ کو صائم اور عتبہ میں سے بھی کسی کو سونپ سکتی ہوں لیکن وہ بہت بے وقوف ہے بیٹے“ اسے کوئی ایسا چاہئے جو اسے سنبھال سکے ورنہ وہ خود کو بری طرح بکھیر لے گی عزین بیٹا اسے سنبھالو گے؟“ عزین ان کی التجا پر دم بخور رہ گیا۔

”لیکن پھپھو میں“۔ اس نے ہلکا سا احتجاج کیا۔ ”ابھی اس میں بچپنا ہے عزین! تمہارے ساتھ رہ کر ٹھیک ہو جائے گی۔“ پھپھو اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ فائزہ کے حد سے زیادہ لاپرواہ انداز کو کھڑی رہی تھیں اس کی آنکھوں میں جھانک ہی نہ سکیں۔

”میری بیٹی اب آپ کے حوالے ہے چھوٹے بھیا“۔ وہ فائزہ کا ہاتھ چاچو کے ہاتھ میں دے کر چپ چاپ رخصت ہو گئیں فائزہ کی چیخوں نے آسمان تک گونجا ڈالا عزین چپ چاپ اپنے نوزائیدہ پیار کو قربان ہوتے دیکھے گیا جب اس کا سوگ کچھ کم ہوا تو پتہ چلا کہ اس کا نکاح عزین سے ہو چکا ہے روتی، حیرتی اور ماتم کرتی داوی حضور کے قدموں میں آگری۔

”مجھے نہیں عزین سے شادی کرنی، اتنا ڈانٹتے ہیں وہ مجھے“۔ ایک کے بعد ایک شکوہ کر رہی تھی داوی حضور نے اسے سمجھانے کا کام اس کے لنگوٹیئے دوستو کے سپرد کر دیا جو اسے کھینچتے ہوئے اپنے مشترکہ حجرے میں لے گئے۔

”دیکھو فائزہ! عزین اتنے بھی برے نہیں ہیں۔ پورے خاندان میں سب سے خوبصورت ہیں“۔ صائم اس کے دائیں طرف بیٹھ گیا۔

”دیکھو فائزہ! عزین بھائی سے شادی کرنے

سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی، سردیاں اپنے عروج پر ہوتیں تو کالونی کی سیاہ کول تار سے سخی سنسان سڑکوں پر چہل قدمی کرنے کا مزہ آ جانا رات کا کھانا کھانے کے بعد سبھی نکل پڑتے وہ بڑے دھڑلے سے ان دونوں کے کندھوں پر چڑھ جاتی۔

”کڑی بڑی ڈرامہ کوئین ہے“۔ دونوں حلق پھاڑ پھاڑ کے گاتے۔

”تم تینوں انسان نہیں ہو، جانور ہو جانور“۔ تانیہ کی بس ہو جاتی۔ اور پھر کسی کو خبر ہی نہ ہو سکی کالونی کی انہی خاموش سڑکوں پر ندا اور عزین کی محبت نے جنم لیا، زبان سے دونوں ہی نہ بولے بس عزین نے یونہی چلتے چلتے اس کا ہاتھ تھاما اور ندانے چھیروانے کی کوشش نہ کی عزین نے ستاروں جیسی چمکدار آنکھوں سے اس کی طرف گلاب بڑھایا اور ندانے مسکراتے ہوئے قبول کر لیا، عزین نے خاموش لیوں سے اسے ہمیشہ کے لئے ساتھ چلنے کے لئے کہا اور ندانے سر جھکا دیا۔ وقت کچھ اور آگے سر کا تو عاصم بھائی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے انتہائی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے چپ چاپ ماں باپ کی پسند کے آگے سر جھکا دیا۔

☆☆☆☆

ہر طرف روشنیاں، قمقمے، شہنائیاں، بھنگڑے مہندی، چوڑیاں، پورے گھر پر رنگوں اور خوشیوں کی برسات ہو گئی صائم عتبہ اور فائزہ نے مل کر ان کی شادی کو یادگار بنا دیا، لیکن ان کی خوشیاں زیادہ پائیدار نہ نکلیں، شادی کے چند ماہ بعد ہی ان کی بیوی اور بچہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہر آنکھ نم تھی ہر دل رنجیدہ تھا بڑی مشکلوں سے وہ زندگی کی طرف واپس آئے بیٹے کے اس بڑے دکھ پر تاپا ابواورتائی اماں یکدم بوڑھے ہو گئے، داوی حضور بالکل ہی تخت سے لگ گئیں، غموں نے بھی شاید ان کے گھر کا رستہ دیکھ لیا تھا، اس واقعے کے صرف دو سال بعد ہی ایک

کے بہت فائدے ہیں تم ان کی بیوی بن کر ان پر رعب ڈالا کرنا ہمارا ایک دشمن کم ہو جائے گا۔ عتبہ اس کے بائیں طرف بیٹھ گیا۔

پورے دو گھنٹے وہ دونوں اس کی برین واشنگ کرتے رہے اور اسے ماننا ہی پڑا بڑی دھوم دھام سے اس کی رخصتی ہوئی، صائم اور عتبہ کو جہاں اس کے پرانے ہو جانے کا غم تھا وہاں اس کے ہمیشہ کے لیے ان کے گھر آ جانے کی خوشی بھی تھی، اس دھوم دھام میں ندا کے آنسو کوئی بھی نہ دیکھ سکا، اس کے اور عزین کے خاموش وعدے خاموشی سے ہی دم توڑ گئے۔

”اب یا تو فائزہ انسان بن جائے گی یا پھر عزین بھائی کا کباڑہ بن جائے گا۔“ اسے عزین کے کمرے تک لاتے ہوئے تانیہ نے کہا تھا شادی کے بعد دادی حضور نے اسے سدھارنے کی نئی مہم شروع کر دی، ہر لمحہ اسے عزین کی پسند اور ناپسند کے بارے میں بتاتی رہتیں۔

”آہستہ بولا کرو، جلد بازی مت کیا کرو، تمیز سے کام لیا کرو، گانے سننا بند، موویز دیکھنا بند، ادنیٰ آواز میں مت ہنسا کرو، ٹانڈی کی باتیں کیا کرو، کھیل تماشے بند، ہنسنا بولنا بند، عزین کی پسند کے کپڑے، عزین کی پسند کو حرکتیں عزین کی پسند کے کھانے۔“ الغرض دوسرے لفظوں میں وہ اسے دوسرا

عزین بننے کو کہہ رہی تھیں لیکن آخر کیسے۔ وہ اپنی 20 سالوں کی فطرت کیسے بھول جاتی اور وہ بھی صائم اور عتبہ کے ہوتے ہوئے ناممکن۔ وہ دونوں زبردستی اسے اپنے ساتھ لگا لیتے کچھ دیر وہ دل پر جبر کر کے دادی کے پاس بیٹھی رہتی اور جب ضبط ختم ہو جاتا تو فطرت سے مجبور ہو کر شور شرابے میں کود پڑتی، کچھ دیر کے لیے اپنی اور عزین کی زندگی کا تلاء بھول جاتی اور جب یہ سب فتاکشن اپنے عروج پر ہوتا کہیں نہ کہیں سے عزین کی آمد ہو جاتی، اس کی تہہ باز نظریں فائزہ کے آ رہا رہ جاتیں اس کے بعد بمشکل

”اسے بھابی کہا کرو تمیز سے۔“ ان دونوں پر عزین نے ایک نیا حکم جاری کیا تھا، دونوں حق حق رہ گئے جس لڑکی کو ہمیشہ اے چڑیل اور وی پٹاخہ کہہ کر مخاطب کیا اسے تمیز سے ”بھابی جی“ کیسے کہیں کیسے دادی کی عدالت میں پیش ہوا اور فیصلہ عزین کے حق میں ہوا، پہلے تو فائزہ کی ہی مشکل تھی اب ان دونوں کی بھی آگئی ہر وقت زبان پر قابو رکھنا پڑتا، اس دن بھی وہ آفس سے ذرا جلدی گھر آ گیا، اندر داخل ہوا تو ٹھنک کے رہ گیا عتبہ اور فائزہ دونوں گتھم گتھا ہوئے تھے اور صائم بڑے مزے سے دونوں کی ویڈیو بنا رہا تھا۔ طیش میں آ کر عزین نے بنا کوئی لحاظ کئے تینوں کے ایک ایک جزدی۔

”خبردار جو تم تینوں اب مجھے اکٹھے نظر آئے تو۔۔۔“ ان دونوں کی نیچے آنے پر بالکل ہی پابندی لگا دی گئی اور فائزہ۔

”ہمیں گولی مار دوں گا ان دونوں سے بات بھی کی تو۔۔۔“ عزین کی آنکھیں اس پر آگ برسا گئیں۔ گھر کی فضا میں عجیب تلاء سا آ گیا، سب ہی اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ بقول عزین گئے۔

”بڑے ہو گئے ہیں اب یہ تھوڑی تو عقل کریں، اتنی لئے پھپھوسے وعدہ نہیں کر رہا تھا میں کہ میرا اور فائزہ کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ ڈیڑھ سال میں بھی ہم دونوں کی ڈنڈی ہم آہنگی نہیں ہو سکی، مجھے اپنے لئے اپنے جیسی بیوی چاہئے تھی اتنی ہنگامہ خیز لڑکی کے ساتھ جینا انتہائی مشکل ہے میرے لئے۔“ بقول فائزہ کے۔

”اب میں ہوں ہی ایسی تو کیا کروں میری ہر ممکن کوششوں کے باوجود عزین راضی نہیں ہوتے ہر وقت طعنے، ہر وقت نصیحتیں اور ہر وقت جھڑکیاں، میں نہیں رہ سکتی اس قدر آپ جناب میں، گھٹن ہونے لگتی رہے مجھے میں جتنا بھی اچھا کرنے کی کوشش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف ایڈفرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریبنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

کردوں وہ کوئی نہ کوئی خای نکال دیتے ہیں۔“ اور بقول لفظوں کے۔

”ہمیں خواہ مخواہ مجرم بنایا ہوا ہے، بچپن کی دوست ہے وہ ایسے کیسے اسے دیکھ کے آنکھیں بند کر لیں ہمارے ساتھ مل کر اگر ذرا دیر کو خوش ہو جاتی ہے تو عزمین بھائی کو کیا تکلیف ہے کہ فیو لگا دیا ہے پورے گھر میں۔“ اور رفتہ رفتہ بجائے حالات ٹھیک ہونے کے خراب سے خراب تر ہوتے گئے عزمین فائزہ کو قبول کر ہی نہ پا رہا تھا، ندا کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو دیکھتا تو خود کو مجرم تصور کرنے لگتا، دادی حضور نے اس تناؤ کو ختم کرنے کے لئے ایک فیصلہ کیا، بڑوں کی ایک مشاورت بلوائی اور درشتے طے کر دیئے۔ عتبہ کا ندا سے اور صائم کا تانیہ سے۔

حیرت انگیز طور پر ندا کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا، عجیب سے خاموشی چھائی ہوئی تھی اس پر۔ عتبہ کی تو باپچیس کل کسے ندا ہمیشہ سے اس کی ڈریم گرل تھی، اور بات تھی کہ صرف ”ڈریم“ تک حقیقت میں تو کھلے دل سے تسلیم کرتا تھا کہ اس کا اور ندا کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ تانیہ نے جب چاہ دادی حضور کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا لیکن شخص نے سب سے زیادہ داؤد ایلانین، خاموش داؤد ایلانین، شور شرابے والا داؤد ایلانین، خاموش داؤد ایلانین۔ صرف لنگوٹیوں کے سامنے۔

”میری بہن میں کیا کمی ہے ذلیل؟“ عتبہ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گیا۔

”کمی اس میں نہیں مجھ میں ہے میں ساری عمر فائزہ کی طرح زندگی نہیں گزار سکتا، شادی کے بعد پھر وہی مسئلے..... یا تو میں تانیہ جیسا بنوں یا پھر وہ بیچاری مجھ جیسا بننے کی کوشش کرے اور نتیجہ وہی نکلے جو فائزہ اور عزمین بھائی کا نکلنا ہے، ٹھینکا۔“

وہ حرف یہ حرف درست کہہ رہا تھا، عتبہ بھی اس کا حامی بن گیا، آخر کار عتبہ کے شیطانی فریضے نے اسے

ایک پلان بنایا۔

”مشکل وقت میں ہمیشہ ہماری مدد کون کرتا تھا۔“ اس نے فائزہ اور صائم کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”عاصم بھائی۔“ وہ دونوں آخرا سی تھالی کے چنے بٹے تھے۔ تینوں نے پوری طرح عاصم کو گھیر لیا، تانیہ کی ہزار تفریہیں، صائم کی ہزار منتیں اور ہزاروں واسطے۔

”بس عاصم بھائی جب صائم منع کرے تو آپ اس کی جگہ تانیہ سے شادی کر لیجئے گا۔“ فائزہ نے انہیں ہاتھ جوڑ جوڑ کر منایا، وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئے شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے، ایک دفعہ پھر رنگوں اور شہنائیوں کی برسات آگئی، نکاح سے کچھ دیر پہلے عزمین اپنے کمرے میں تھا جب ندا اس کے پاس آئی، سرخ عروسی لباس میں سو جھبی ہوئی آنکھوں کے ساتھ لبوں پر ڈھیروں خاموش التجا میں لٹے۔

”عزمین مجھ سے پیار کرتے ہو؟“ وہ روئی تھی۔

”ہاں،“ عزمین اس کی خوشبو میں ڈوب گیا۔

”مجھ سے شادی کرو گے؟“ ندا نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ اقرار کر گیا اور ندا نے تانیہ اماں کے سامنے انکار کر دیا۔ مولوی صاحب بس آنے والے تھے تانیہ اماں دم بخود رہ گئیں۔

”لیکن انکار تو صائم کو کرنا تھا۔“ فائزہ تاجھی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”میں ندا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ عزمین اپنے برابر میں کھڑی فائزہ کو بالکل ہی بھول گیا، تانیہ ابو بے حد شرمندہ تھے۔

”برخوردار! تم بھی ابھی بتادہ تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ تانیہ ابو نے پوچھا تو صائم انکار نہ کر سکا، ماں باپ کی عزت کو مزید نہ اچھال سکا اس نے جب چاہ تانیہ سے شادی کر لی۔ پورا گھر عزمین اور ندا کے خلاف تھا تانیہ اماں اور چچی کا غم

جملے چہ بابتہا

Downloaded From
Paksociety.com

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک

سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ایک لفظ بھی بولا ہو میں نے اس کے آگے ویسے اس میں شاہ زیب کا کوئی قصور نہیں تھا تب وہ بہت چھوٹا تھا۔

”ہاں یار لیکن اب ایک مہینے بعد وہ بھی تو آنے والا ہے لاہور سے۔ ذرا سوچو کیسے سامنا کرو گی اس کا۔“

”کریں گی، میں نے کوئی اس کی چوری تھوڑی ننکی ہے۔“

آج سے ٹھیک ایک مہینے بعد ان کے اسکول میں پرنسپل نے پرانے اسٹوڈنٹس کو مدعو کیا تھا تا کہ سب اکٹھے ہو سکیں پھر سے پرانی یادیں تازہ ہو سکیں اور ایسے ہی موقع پر اس کا کزن یاسر بھی امریکہ سے پڑھائی مکمل کر کے آنے والا تھا تو دوسری طرف شاہ زیب جسے نامعلوم کس بات پر مریم سے دشمنی بھی آنے والا تھا۔ مریم کے لیے یہ ایک نہایت دلچسپ بات تھی پرانے دوستوں سے ملنا۔ بس شاہ زیب کا سامنا کرتے ہوئے وہ ذرا گھبرا رہی تھی۔

”عائشہ! اگر یاسر سے میری شادی نہ ہو سکی تو میں جیتے ہی مر جاؤں گی۔“

”لیکن وہ کیوں؟“

”کیونکہ یاسر ہی وہ لڑکا ہے جسے میں نے چاہا ہے۔“

یاسر مریم کا چچا زاد تھا۔ بچپن میں دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ شاہ زیب بھی اس کے ساتھ ہی اسکول میں پڑھتا تھا۔ طبیعت کا بہت خندی اور شریک تھا۔ اپنے سے چھوٹوں کو تنگ کر کے مزہ آتا تھا۔ دوسری طرف مریم بہت ہی سیدھی سادھی اور شرمیلی سی تھی۔ اس کے زیادہ دوست بھی نہیں تھے۔ شاہ زیب روزانہ اسکول میں بریک کے وقت مریم کو تنگ کیا کرتا۔ اس کی پنڈلیوں پر زور زور سے لاشیں مارا کرتا اور وہ چپ چاپ تکلیف برداشت کرتی رہتی۔ پھر ایک دن اس نے یاسر کو بتایا تو وہ بری طرح شاہ زیب کو پٹنے لگا۔ اس کے بعد سے شاہ زیب نے مریم کو تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا۔

☆.....☆

کچھ دن بعد یاسر امریکہ سے پڑھائی مکمل کر کے

”مریم! کتنے سوچوں میں غم ہو؟“ عائشہ نے اسے سوچوں میں گم بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

”بس یار! یاسر کی یاد آرہی ہے۔ آج اسے امریکہ گئے ہوئے پورے دو سال ہو گئے ہیں۔“

مریم نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

”تو اب وہ آنے بھی تو والا ہے۔“

”یہی تو سوچ کر پریشان ہوں کہ کیسے اپنے گھر والوں کو اس رشتے کے لیے رضامند کروں گی۔“

”کر لینا یار۔ اس سے پہلے بھی تو تمہاری بات مانتے آرہے ہیں وہ لوگ۔“

”ہاں لیکن اب معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ ہرگز بھی یاسر سے میری شادی پر رضامند نہیں ہوں گے۔“

”تو نہ ہوں، تم دونوں بھاگ کر شادی کر لینا۔“

”چپ رہو عائشہ! جب بھی بولتی ہو فضول ہی بولتی ہو۔ مجھے تو بس وہ دن یاد ہے جب یاسر نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر شاہ زیب کو مارا تھا۔ سچ سچ بے چارا شاہ زیب پورے دو دن تک اسکول سے غائب رہا تھا۔“ عائشہ نے افسوس سے کہا۔

”ہاں تو اسے چوٹیں بھی تو ٹھیک ٹھاک آئی تھیں نا۔“ مریم نے افسوس سے کہا۔

”سچ میں بڑا ظلم کروا لیا تم نے شاہ زیب پر۔“

”ارے میں نے کب کہا تھا کہ جا کر اسے مارنا شروع کرو۔ میں نے تو بس پہلی بار ڈرتے ڈرتے کسی سے اس کی شکایت لگائی تھی۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے کیسے اسکول میں جب تم چھوٹی سی تھیں تمہاری پنڈلیوں پر زور زور سے لاشیں مارا کرتا تھا اور تم کسی کو بتاتی بھی نہیں تھیں۔ بس پہلی بار اپنے کلاس فیلو اور کزن یاسر کو بتایا تھا۔ جس پر اس نے مل کر اپنے ساری دوستوں کے ساتھ اس کی خوب ہی درگت بنا لی تھی۔“

”ہاں بے چارہ شاہ زیب لیکن میں کرتی بھی تو کیا چپ چاپ روز اس کی یاد رہی تھی۔ مجال ہے جو آج تک

واپس آگیا۔ مریم اس دن صبح سے ہی کھانا بنانے میں لگی ہوئی تھی۔

”مریم! بریانی کے لیے تو رومہ تو جڑھا دیا ہے نام نے۔“ اس کی ای نے پوچھا۔
”جی جڑھا دیا ہے۔“

”بہت اچھے اب ذرا اچار گوشت کو بھی دیکھ لو۔“
”جی اچھا دیکھتی ہوں۔“ وہ اتنا کہہ کر کچن سدھاری۔ شام کے وقت کام سے فارغ ہو کر وہ جلدی جلدی تیار ہوئی۔ اپنا حلیہ درست کیا۔ ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا۔ وہ چاہتی تھی کہ یاسر اسے دیکھتے ہی اس کا ویوانہ ہو جائے بالکل ویسے ہی جیسے وہ اسے دیکھنے کو دیوانی ہوتی جا رہی تھی۔ یاسر اس سے محبت کرتا تھا۔ یہ بات وہ اسے امریکہ جانے سے پہلے بتا کر گیا تھا۔ دونوں میں کافی لمبی چوڑی گفتگو ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر بیل ہوئی۔ مریم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی چھوٹی بہن نانکھ نے جا کر دروازہ کھولا، وہ تو بہت نروس ہو رہی تھی۔ اس کے تو ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

پھر قدموں کی آہٹ ہوئی اور یاسر اپنے وجیہہ سراپے کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھا۔ اس نے شوخ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں عجیب بے باکی کی تھی جو مریم کو اچھی نہ لگی۔ وہ اس کی نظروں کی پیش برداشت نہیں کر پار ہی تھی سو اس نے نظریں پٹی کر لیں اور باقی سب سے ملنے لگی۔ یاسر کی بہن فارحہ بڑی تیز تھی۔ وہ ان دونوں کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ یاسر نے اسے سب کچھ بتا رکھا تھا۔ وہ بار بار گن آکھیوں سے مریم اور یاسر کو دیکھتی۔ لبوں پر شریری مسکراہٹ ہوتی، مریم نے یاسر کو سوائے سلام کرنے کے اور کوئی بات نہ کی تھی۔ رات کو کھانے کے بعد یاسر نے مریم کو جسکے سے باہر لان میں بلا لیا۔ مریم بہت گھبرائی تھی۔ وہ تو گئی تھی لیکن بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ یاسر نے ہی بولنا شروع کیا۔

”مریم! تم اپنے گھر والوں سے بات کرو۔ وہ میری شادی محلے کی کسی لڑکی سے کر رہے ہیں اور وہ بھی فوراً یہ اعلان آج کل میں ہی کرنے والے ہیں۔ ڈھائی تین مہینے تک میری شادی ہو جائے گی اور میری بات مانی نہیں جا رہی۔ اب تمہیں ہی کچھ کرنا ہے۔“ یاسر بول کر چپ ہوا تو مریم پر تو جیسے قیامت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔
”ٹھیک ہے میں اپنے گھر والوں سے بات کرتی ہوں۔“ وہ اتنا کہہ کر اندر چلی گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ یاسر اسے بے وقوف بنا رہا ہے۔ امریکہ جا کر یاسر بگڑ گیا تھا۔ وہ پہلے بھی عیاش فطرت کا لڑکا تھا۔ اسے تب بھی محلے کی اس لڑکی شازیہ میں دلچسپی تھی اور اب اس نے شادی کی خواہش بھی ظاہر کر دی تھی اور اس کے گھر والے اس شادی پر فوراً ہی سے رضامند بھی ہو گئے تھے۔ ان کے خیال میں اس شادی میں کوئی عیب نہیں تھا۔

☆ ☆

اور پھر مریم نے اگلے روز ہی نانکھ سے اور ای سے اس بات کا ذکر کر دیا۔

”پاگل تو نہیں ہو گئی تو وہ امریکہ سے پڑھ کر آیا ہے۔ سنا ہے وہاں جناب بھی کرے گا۔ اس کی اماں کہہ رہی تھیں کہ شازیہ نائی لڑکی سے اس کی شادی بھی کریں گی۔ اب اگر میں نے تمہارے رشتے کا کہہ دیا تو سوچیں گی کہ بیٹی کو امریکہ بھیجنے کے چکر میں ہوں۔ بھول جاؤ کہ تمہاری شادی اس سے ہو گی تمہارے لیے میں نے پہلے ہی ایک لڑکا دیکھ رکھا ہے۔ اس کی تصویر لا کر دکھائی ہوں۔ شاہ زیب نام ہے اس کا۔ صرف اور صرف ای سے شادی ہو گی تمہاری۔“ ای نے اسے بری طرح لتاڑ کے رکھ دیا۔

”کون شاہ زیب مجھے کسی شاہ زیب سے شادی نہیں کرنی۔ مجھے صرف یاسر سے شادی کرنی ہے۔ اس کے بغیر میں مر جاؤں گی۔“

”تو مر جاؤ میری بلا ہے۔“ ڈی غصے میں بولیں۔
”وہ شروع سے ہی غصے کی تیز نہیں لیکن بیٹی کے اس

داخل ہوا۔ مریم دوڑ کر اس کے پاس چلی گئی اور رو رو کر اسے ساری بات بتانے لگی۔ یاسر غصے میں مریم کی طرف بڑھا لیکن شاہ زیب نے ایک زنانے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ جواباً یاسر نے بھی اسے مارا دونوں سخت گتھا ہو گئے۔ مریم چیخنے چلانے لگی۔ وہاں دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ بڑی مشکلوں سے سب نے بچ بچاؤ کرایا۔ یاسر اور شاہ زیب دونوں کو ہی چوٹیں آئی تھیں۔ بعد میں مریم نے شاہ زیب سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاہ زیب کو تھوڑی حیرت بھی تھی کہ وہ اچانک شادی پر کیسے رضا مند ہو گئی لیکن وہ دل میں خوش بھی بہت تھا۔ اسے اس کے خواہوں کی شہزادی ملنے والی تھی۔ مریم کو بھی اب معلوم ہو گیا تھا کہ یہ وہی بہن والا شاہ زیب ہے۔

☆.....☆

پورا کمرہ گلاب کے پھولوں کی لڑیوں سے سجا ہوا تھا۔ معطر معطر خوشبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ مریم گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور شاہ زیب کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہ آہستہ سے چلتا ہوا اس کے سر ہانے بیٹھ گیا۔ پھر وچیرے سے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔

”کتنا بزدل تھا تا میں مریم جو تمہیں مارا کرتا تھا اسکول میں۔ اپنے سے کمزور پر ہاتھ اٹھانا کہاں کی بہادری ہے۔“ اس نے اس کی تھوڑی اونچی کی تو مریم رونے لگی۔ گالوں پر آنسو ٹپکھک گئے۔

”ارے یہ کیا آپ تو رو رہی ہیں کیا میں اتنا برا ہوں۔ سچ بتائیں یہ آنسو اسی لیے ہیں نا کیونکہ جسے چاہا تھا وہ میں نہیں ہوں۔“ مریم نے نفی میں گرون ہلا دی۔

”نہیں بلکہ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں کیونکہ آپ اس سے بھی بڑھ کر ہیں جسے چاہا تھا۔“ شاہ زیب نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مریم نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں۔ وہ رات بھی ان کے ملن پر مسکرا رہی تھی۔

☆.....☆

طرح اظہار محبت نے انہیں کچھ زیادہ ہی غصہ دلا دیا تھا۔ نانکے حیران پریشان کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ امی گئیں اور دوسرے کمرے سے ایک لڑکے کی تصویر لے آئیں وہ لڑکا شکل و صورت کا بہت خوب صورت تھا لیکن مریم کیا کرتی اس کے دل میں تو یاسر کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس نے پورا مہینہ روتے دھوتے احتجاج کرتے ہوئے ہی گزارا۔ صرف یاسر سے ملنے وہ اس دن اسکول بھی چلی گئی۔ ورنہ اب تو پرانے دوستوں سے ملنے کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

”سنو ایپھولوں کا بو کے لے جاؤ یہ شاہ زیب کو ہم سب گھر والوں کی طرف سے دیدینا۔ وہ بھی وہاں آئے گا۔“

مریم کو امی سے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ شاہ زیب بھی اس اسکول میں پڑھتا ہے وہ تو اس شاہ زیب سے ہی ڈر رہی تھی اور اب کہاں یہ تصویر والا شاہ زیب بھی آ گیا۔ اسکول پہنچی تو اس نے تصویر والے شاہ زیب کو ڈھونڈا اور بیولوں کا بو کے اسے دے دیا۔ اس نے مسکرا کر لے لیا۔

”کیسی ہیں آپ؟ مجھے پہچانتا؟“

”جی آپ سے امی میری شادی کرنا چاہتی ہیں لیکن میں نہیں کرنا چاہتی کیونکہ میں نے کسی اور کو چاہا ہے۔“ شاہ زیب کے چہرے سے ایک دم ہی مسکراہٹ غائب ہوئی اور وہ بے حد اداس سا نظر آنے لگا۔ مریم اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ اب وہ یاسر کی تلاش میں تھی۔ آخر کار یاسر مل ہی گیا۔ وہ کچھ لڑکیوں کے ساتھ بڑے فری انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھا تو اس کا ہاتھ پکڑ کے ایک خالی کلاس روم میں لے گیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

”بتاؤ اپنے گھر والوں سے بات کی تم نے؟“

مریم اس کی اپنی بے باک حرکت پر حیران رہ گئی۔ اس نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹانا چاہا تو وہ اس کے مزید قریب آنے لگا۔ مریم نے گھبرا کر اسے دھکا دیا۔ اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور شاہ زیب اندر

چوٹی قسط

زندگی بہوں میں جبریت ٹھونکتی ہو

فہر کئی لمحے سکتے میں آگیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا وہ لڑکی کال کر سکتی ہے۔ نمبر تو اس کے پاس آگیا تھا۔ نمبر بھی کئی دفعہ نرالی کر چکا تھا مگر سوچ آف جا رہا تھا۔



”عجیب لڑکی ہے کچھ اور بات ہی نہیں کی۔ بس غصہ ہی کرتی رہی۔“ فہر کے لب مسکرانے لگی۔
اسے کافی دیر خواب کی سی کیفیت میں مبتلا ہوئے اچانک سے اسے خیال آیا مغرب بھی ہو گئی تھی اور ساڑھے
سات بج گئے تھے۔ اسے تو ڈنر پر بھی پہنچنا تھا، آج آفس والوں نے میٹنگ کے ساتھ ڈنر بھی رکھا تھا۔
فہر کو یہ خوشی تھی اس لڑکی کا نمبر مل گیا اور اس بے وقوف لڑکی کو اندازہ بھی نہیں ہو گا بے وقوفی میں اپنا ہی نمبر
دے گئی ہے۔

جلدی جلدی وہ تیار ہو گیا بلیک ڈنر سوٹ میں ڈینٹ اور ڈیشنگ لگ رہا تھا۔
”آہا..... آپ آپی آپ سچ بہت دن بعد آئی ہیں۔“ فہر نے کنول کو دیکھا تو پر جوش انداز میں اس پاس آ کے

بیٹھا تھا۔
”دیکھ لیا تو کہہ دیا بہت دن بعد آئی ہیں تمہیں کبھی توفیق نہیں ہوئی گھر ہی آ جاؤ تم سے اچھا مہاد ہے کم از کم
خیر خیر لینے آ جاتا ہے۔“ وہ تپی ہوئی تو پہلے فہر کو اچھی خاصی سناوی۔

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

”آپی! آپ تو ہر وقت جلتے توے پر بیٹھی رہتی ہیں۔“

”تمہاری باتوں کی وجہ سے میں توے پر بیٹھتی ہوں۔“ کنول نے اس کی ناک سے تیاری پر جائزہ لیا بلیک

ڈز سوٹ میں ڈسٹنگ اور چارمنگ لگ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے بھائی کی دل ہی دل میں نظر بھی اتاری۔

”ایسے گھور گھور کے کیا دیکھ رہی ہیں۔“ اس نے جھینپ کے ان کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

”اصل میں بھائی آج آپی آپ کی تیاری پر چونک رہی ہیں۔“ مہاد نے مسکرا کے لقمہ دیا۔

”ڈز پر جا رہا ہوں۔ آفس کی طرف سے ہے۔“ فہر نے پہلو بدل کے جھٹ دھاحت دی۔

”تم تو ایسے گھبرانے لگے جیسے کسی لڑکی سے ڈز پر ملنے جا رہے ہو۔“ کنول نے بھی اسے تنگ ہی کیا۔

”آپ تو پتا نہیں کیا کیا سوچ لیتی ہیں۔“

”میں تو بہت کچھ سوچ رہی ہوں ارے سدھر جاؤ کب تک نوٹ کما تے رہو گے۔ شادی کا بھی سوچ لو۔“ وہ تو

بھڑک ہی اٹھیں۔

”آپ لوگوں کا یہی ٹا پک ہوتا ہے شادی جب کرنی ہوگی بتا دوں گا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”اور ہاں سنبے جانے کی ضرورت نہیں ہے میں دو دن کی چٹھی پر ہوں۔“

”کیا؟“ کنول تو خوش ہو گئیں۔

”ای! یہ کیا سچ کہہ رہا ہے۔“ انہوں نے امی سے تائید چاہی جو مہاد کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھی تھیں۔

”ہاں کہیے تو رہا ہے مگر پھر اچانک سے چلا جاتا ہے۔“

”امی! واقعی چٹھی پر ہوں اچھا چلتا ہوں دیر ہو رہی ہے۔“ وہ سیل میں ٹائم دیکھ کے کھڑا ہوا۔

فہر آج بہت خوش تھا۔ اس پری پیکر کی آواز جو سننے کو ٹٹی تھی مگر جانے حقیقت میں دوبارہ سامنا کب ہوگا۔ وہ

وہ بھی سوچ رہا تھا وہ اتنی ریزرو طبیعت کا تھا اچانک سے اس کی لائف میں چیخ آ گیا تھا کسی لڑکی نے اسے متاثر

کیا تھا۔



ایسیہ کی طبیعت بہتر ہو گئی تھی۔ اس دوران آریکہ نے ہی ان کا بچن بھی سنبالا تھا۔ حرا اسکول جاتی تھی پھر

اسے بچن کے خاص کام آتے بھی نہیں تھے۔

”بیٹا! بس کروکل سے کھانا میں خود بنا لوں گی۔“ انہوں نے آریکہ کی سلیقہ مندی اور نفاست پسندی کو ستائشی

انداز میں سراہا ہی تھا وہ بچن میں کھانا بنانے کے ساتھ بچن کو سیٹ کے رکھتی تھی ہر جگہ ہی اس نے صفائی رکھی تھی

اس نے ان کا بچن بھی صاف ستھرا کر دیا تھا۔

”آئی! میں نے آٹا گوندھ کے فریج میں رکھ دیا ہے۔“

”بس بیٹا! بس میں کر لوں گی تم اپنا گھر بھی دیکھتی ہو اور میرا بھی دیکھ رہی ہو۔ اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔“

جس گھر جاؤ گی تم سے سب خوش رہیں گے۔“

ایسیہ نے اسے بغور دیکھا اور لہجہ ان کا رشک بھرا تھا۔ آریکہ سبھی سبھی لڑکی تھی ہر کام اور ہر بات کو اچھی طرح

سمجھتی تھی۔ وہ اپنا ارادہ اگر ظاہر بھی کرتی تو کیسے حسین کو جانے کیوں وہ اچھی نہیں لگتی تھی۔

”امی! بہت بھوک لگی ہے۔“ حسین نے ان کی بات بھی سن لی تھی۔

آریکہ بھینپ کے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس نے سوچا اب یہاں سے عزت سے نکل جائے تو بہتر ہے۔

”کہاں جا رہی ہو کھانا تو نکال کے دیتی جاؤ۔“ اس نے نیچے سے ہانک لگائی۔

”بیٹا! میں نکال دوں گی پکی صبح سے لگی ہوئی ہے اور پر نیچے کے کاموں میں۔“

آریکہ کے قدم رک گئے تھے۔ وہ اسے دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھی وہ اس سے محتاط ہی ہو گئی تھی کیونکہ بے عزتی جو اتنی بے دردی سے کی تھی۔ ایسے منع کرتی رہ گئیں مگر اس نے پھر بھی حین کا کھانا نکال کے ٹرے میں ریڈی کر دیا۔

”امی! امی میرا ناول نہیں مل رہا۔“ حرا کی آواز آئی تو ایسے چونک گئیں۔

”یہ لڑکی بھی عجیب ہے آئی ہوں حین کا کھانا نکال دیا ہے کچن میں جا کے لے لو۔“ وہ حین کو کہتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

”تم نے کیا بنایا ہے؟“ حین نے ٹرے میں نگاہ ڈالی آلو گوشت تھا۔

”میں جا رہی ہوں۔“ وہ اپنا پنک آچل شانوں پر سمیٹ کے نگاہوں کو جھکائے اس کے سائیدے سے نکل کے جانے لگی۔

”ہاں ہاں جاؤ کون سا میں روک رہا ہوں اور کس رشتے سے روکوں۔“ اس نے آریکہ کو سلگا کے لقمہ منہ میں رکھ لیا۔

”پورا کچن صاف ستھرا بڑا تھا۔ آریکہ کا دل دھڑک ہی اٹھا اندر سے دل گھبراہٹا ظالم روک لے۔“

”مجھ سے فضول بات بالکل نہیں کریں۔“ وہ یہ کہہ کر کچن سے نکل گئی۔

حین بھی اپنی ٹرے اٹھا کے باہر ہی آ گیا۔ برآمدے میں رکھی ڈائننگ ٹیبل پر آ کے بیٹھ گیا۔

”جس گھر جاؤ گی لوگ خوش ہو جائیں گے۔“ لہجہ معنی خیز تھا۔

یہ آپ کا کوئی envelope آیا تھا۔“ حین کی بات سنا کر اس نے لفاظی فریج کے اوپر سے اٹھا کے دیا۔

”envelope.....!“ حین نے چونک کے تفراری سے لیا کیونکہ ہر وقت جا بے لے سیر کا ہی انتظار رہتا

تھا۔ حین نے جلدی جلدی لیسٹر کھولا اور پھر خوشی سے بھر پور سہرا لگایا۔ آریکہ کے قدم رک گئے وہ اوپر جا رہی تھی۔

”امی! امی۔“ حین کی خوشی سے بھر پور آواز رانیسہ دوڑی چلی آئی تھیں ان کا سانس پھول گیا تھا۔ طبیعت

خراب ہونے کی وجہ سے خاصی کمزوری بھی ہو گئی تھی۔

”امی میرا جا ب کا لیسٹر آ گیا۔“

”شکر ہے اس مالک کا۔“ انہوں نے حین کے خوشی سے کھلتے چہرے کو دیکھ کر اوپر والے کا شکر ادا کیا تھا۔

آریکہ کو بھی ایسا لگا کہ ناسکون کا احساس ہوا کب سے وہ اس کے لیے دعائیں ہی کر رہی تھی۔

”وہ ویسے تمہیں دیکھ کر کبھی میرا کام اچھا نہیں ہوتا آج تو بات ہی انوکھی ہو گئی۔“ وہ آریکہ کو سلگانے سے باز

نہیں رہا۔

”بدتمیز، کیوں بچی کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔“ انہوں نے حین کی پشت پر چپت لگائی۔

آریکہ جزبہ ہو گئی، اس وقت اسے حین کی یہ بات بری نہیں لگی تھی۔

”مبارک ہو آپ کو، ورنہ آپ تو مجھے ذلیل ہی کرتے رہتے۔“ وہ رکی نہیں اور لے لے قدم بڑھا کے

سیرھیاں عبور کر گئی تھی۔

حین کے لب مجھ سے سکرانے ضرور مگر اس نے بھی رکھے۔
 ”بیٹا! بہت بری بات ہے۔ کتنے دنوں سے ہمارے کاموں میں لگی ہے اور تم اس سے کتنی بدتمیزی سے بات کرتے ہو۔“ اسی کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔
 حین کو اس وقت یہ خوشی تھی اس کی جاب اس کی من پسند جگہ پر لگ گئی تھی، سیلری بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ رات میں ایسہ نے مٹھائی منگوا کے اوپر بیٹھی تھی۔

☆.....☆

ابو کو آج پھر اسپتال لے کے جانا تھا اور جانا بھی ضروری تھا مگر اس کا کہیں انٹرویو بھی تھا وہ عجیب کشمکش کا شکار تھی کیا کرے گھر کے حالات سدھرنے میں نہیں آرہے تھے۔ ایسے میں رمعنے کو اپنے کھوئے ہوئے بھائی کی یاد شدت سے آنے لگی۔

”کاش.....! بھائی آپ یوں اس طرح نہ جاتے تو آج حالات ہمارے ایسے نہیں ہوتے۔“ وہ تیار ہو کے اپنا بیگ اٹھانے لگی۔

”آپی کیا بات ہے؟“ نمرہ نے اس کی ادا اس صورت دیکھی۔
 ”کوئی بات نہیں تم ایسا کرو ابو کی پانی کی بوتل اور فائل نکال کے ریڈی کر لو میں آتی ہوں۔“ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائی پر کسی کی بھی فکر کو ان پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”یا اللہ! میری کہیں بھی جاب لگا دے کب تک ہم ایسے ڈگڑے رہیں گے۔“ رمعنے کی آنکھوں کے گوشے بھینکنے لگے۔

وہ کبھی بھی حالات سے گھبرائی نہیں تھی۔ ہمیشہ ڈٹ کے مقابلہ کرتی آرہی تھی اور اس گھر کو ایک بیٹے کی ذمہ داری کی طرح ہی ادا کر رہی تھی۔ وہ ابو کو لے کے اسپتال آگئی تھی۔ ابجد کو آج ساتھ نہیں لائی تھی۔ میٹرک میں تھا پڑھائی کا لاس بھی ہو رہا تھا۔

”آپ فائل دے دیں۔“ اندر روم سے چپڑا سی ان کے پاس آیا تھا۔
 رمعنے نے جلدی سے فائل دی ابو اس کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔
 ”لگتا ہے نمبر جلدی آجائے گا۔“ رمعنے کو کچھ سکون ہوا کم از کم تین بجے تک انٹرویو کے لیے جا سکتی تھی۔ ابھی بارہ ہی تو بجے تھے۔

”پہلے ان کی فزیو تھراپی ہوگی پھر ڈاکٹر انہیں چیک کریں گے۔“ وارڈ بوائے وہیل چیئر لے کے آ گیا تھا۔
 رمعنے حیران بھی تھی اتنی جلدی سارے کام اتنی آسانی سے کئے ہوئے تھے۔
 جب تک ابو کی فزیو تھراپی ہوئی وہ باہر بیٹھی رہی تھی ابو فارغ ہوئے تو انہیں سیدھا ڈاکٹر کے روم میں پہنچا دیا گیا۔

رمعنے نے لب بھیج کے سامنے ڈاکٹر شہیر کو دیکھا جو ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔
 ”گڈ! آج آپ جلدی لے آئیں۔ انہیں اسی طرح ہفتے میں دو مرتبہ لے آئیے جلدی امپرومنٹ آئے گی۔“
 شہیر، ابو کو چیک کر رہا تھا۔

”بیٹا! ہمارے حالات ایسے کہاں، میری بیٹی جگہ جگہ جاب کے لیے ماری ماری پھر رہی ہے۔“
 ”ابو بیٹا! آپ کیا باتیں لے لے کے بیٹھ گئے۔“ رمعنے کو اپنے حالات کسی کو بھی بتانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ شہیر نے

مسکراتے ہوئے کاسنی لان کے کپڑوں میں خود دار اور سادہ سی رمعنہ کو دیکھا جو اسے دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھی۔

”ویسے آپ کا بلڈ پریشر وغیرہ ٹھیک ہے۔ میڈیسن ویسے ہی جاری رکھیں اور ہاں گھر میں تھوڑی تھوڑی چہل قدمی ضرور کریں۔ آپ کی ٹانگوں کا خون کا دوران بڑھے گا تو آپ انشاء اللہ جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔“

”کیا آپ نے نئی میڈیسن لکھی ہے؟“ رمعنہ کو فکر ہوئی کیونکہ میڈیسن آتی ہی اتنی مہنگی تھیں اکثر میڈیسن رہ بھی جاتی تھیں۔

”تمہیں نہیں وہی ہیں صرف ایک ٹیبلٹ کا اضافہ ہے یہ آپ کو نیچے اوپنی ڈی سے مل جائے گی۔“

”نیچے! رمعنہ پوچھنے لگی۔“

”ہمارے پاس پینٹنٹ کے لیے Not for sale کی میڈیسن ہوتی ہیں، وہی آپ کو مل جائے گی۔“

شہبیر کو جیسے اس کی سوچیں پڑھنی آتی تھیں وہ سمجھ گیا تھا رمعنہ کن حالات سے دوچار ہے۔

”اگر آپ ماسٹرنڈ نہیں کریں تو ایک جا ب میرے پاس بھی ہے آپ کے لیے۔“ وہ چیسر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ رمعنہ نے چونک کے حیرانگی سے اسے دیکھا وہ مذاق تو نہیں کر رہا۔

”بیٹا بتائیے۔“ ابو کو جیسے جلدی تھی۔

”نہیں میں نے دو ایک جگہ اسٹریوڈینے ہیں ہو جائے گی جا ب بھی۔“ وہ جیسے اس کا احسان لینا نہیں چاہتی تھی۔

”یہاں لیب میں جگہ خالی ہے۔ ریسپشن کی آپ کی ایجوکیشن کتنی ہے۔“

”ماسٹرز کیا ہے اس نے۔“ ابو نے بتایا۔

”گڈ پھر تو سمجھئے آپ کے لیے ہی ہے۔ دیکھ لیں آپ کو ٹھیک لگے تو.....“ شہبیر اس کی خاموشی کو جانچ

رہا تھا۔

”سیلری بھی 18 ہزار ہے دو ایسٹیاں علاج یہاں آپ کا فری ہی ہوگا بلکہ پوری نیملی کا۔“

”سوری مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔“ وہ ابو کی فائل اٹھا کے کھڑی ہو گئی۔

”یہاں تجربہ نہیں مانگا ہے آپ سوچ لیں۔“

وہ کھڑا ہو گیا ابو کی وہیل چیسر کو اس نے خود کھسکا کے باہر نکالا جالا نکلے وارڈ بوائے موجود تھا۔ رمعنہ کا ذہن الجھ

گیا تھا جا ب کی ضرورت تھی اور اگر ان کی وجہ سے چھوڑ دی تو ٹھیک نہیں ہوگا۔

☆.....☆

اس کا کھاتے کھاتے دل گھبرانے لگا۔ نیمل سے اٹھ گیا۔ ماہا کی جانچتی اور گہری نگاہیں اس پر تھیں۔

”بیٹا کیا بات ہے کھانا تو کھاؤ۔“ بشری نے پوچھا۔

”آئی کھالیا۔“ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”شہزیل بھائی! اتنے خاموش رہنے لگے ہیں کچھ شہبیر بھی نہیں کرتے۔“ نوا اپنی پلیٹ میں جھکا کھا رہا تھا

اسے یوں ایک دم سے جاتے دیکھ کر تشویش بھی ہو رہی تھی۔

”ماں باپ یاد آتے ہیں اس لیے چپ رہتا ہے۔“

”مہم کیا نہیں وہ محبت و پیار نہیں دیتے؟“

”یہ بھی تو حقیقت ہے اس کے نان و باپ اور بہن بھائی ہیں انہیں بھولا تو نہیں ہے خون تو جوش مارتا رہتا ہے۔“

”کچھ بتاتے بھی نہیں ہیں بس آنس اور گھر آتے ہی رات کو سو جاتے ہیں۔“

”اگر اتنا خیال آ رہا ہے تو خود پوچھ کیوں نہیں لیتے ای کا سر کیوں کھا رہے ہو۔“ ماہا نے نواذ کو جیسے ڈانٹ ہی دیا کیونکہ کچھ دن سے وہ خود بھی جھنجھلائی کھسائی ہو رہی تھی۔ شہزیل کے سرد مہر رویے کی وجہ سے جو اس کی جانب رخ ہی نہیں دے رہا تھا۔

”ہاں پوچھ لوں گا۔“ اس نے ہاتھ تو اٹھا کے گویا جڑ کے ہی کہا۔

”خدا راب تم دونوں جھگڑنا نہیں، کھانا کھاؤ جلدی۔“ بشری دونوں کے آئے دن کے جھگڑوں سے بھی نالاں تھیں۔

ماہا کا تو ذہن شہزیل میں الجھا ہوا تھا اسے بھی تشویش تھی آخر وہ کھانے سے اٹھ کیوں گیا وہ کھانے سے فارغ ہو کے اپنے روم میں چلی گئی۔

تاہم دیکھا تین بج گئے تھے اور اس وقت گھر کی خواتین دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتی تھیں اور شہزیل سچ روز ہی گھر آتا تھا وہ اس چکر میں تھی کسی طرح بھی شہزیل کے روم میں جانے کا موقع مل جائے اس سے پوچھے تو آخر وجہ کیا ہے اتنا تو اسے پتا تھا شہزیل اسے ڈانٹ کے روم سے نکال دے گا مگر ماہا بھی ایک ضدی تھی اپنی بات منوانا اسے خوب آتا تھا۔

”کیا بات سے کھانا کیوں نہیں کھایا؟“ وہ آندھی طوفان کی طرح دروازہ تاک کیے بغیر اس کے روم میں چلی آئی تھی۔ شہزیل نے چونک کے ناگواری سے اسے دیکھا۔

وہ کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹا تھا اسے پھر واپس آفس جانا تھا نسیب احمد کے پاس۔

”آپ سے کس نے کہا میں نے کھانا نہیں کھایا؟“ وہ لہجے میں روکھائی اور ناگواری لیے گویا ہوا۔

ماہا بلیک سوٹ میں اپنی سرخ و سفید رنگت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ دلکش اور حسین تو وہ ویسے ہی تھی مگر شہزیل کو اس کی لالہائی اور لاپرواہی والی عادت سخت کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ اس پر نگاہ اور توجہ نہیں دیتا تھا مگر وہ پھر بھی اس کے پیچھے پیچھے رہتی تھی۔

”میری کیا آنکھیں نہیں ہیں۔ ادھر دیکھو میری طرف۔“ اس نے شہزیل کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کیا جو بیڈ سے اٹھ کے باہر کھڑکی سے دیکھنے لگا تھا۔

”ماہا! فارگا ڈسک آپ میرے پیچھے نہیں رہا کریں مجھے اچھا نہیں لگتا آپ کو بار بار ٹوٹو کنا۔“ وہ کھسیا کہ تلخی اور ترش روی سے گویا ہوا۔

”تم مجھ سے جتنا بھاگو گے میں تمہارے پیچھے پیچھے رہوں گی۔“ اس کے لہجے میں بھی ضد اور اعتماد تھا۔

”کوئی فائدہ نہیں میرے اور آپ کے راستے الگ ہیں۔“

”راستے تو میرے اور تمہارے ایک ہی ہیں مگر تم نگاہ چراتے ہو۔“ اس نے شہزیل کی آنکھوں میں دیکھا اونچا لہا تو اتنا وجہہ ونگھیل شہزیل ہر لڑکی ہی کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ ماہا کو اندازہ تھا۔

”نہیں ایک دن یہاں سے چلے جانا ہے۔ کبھی تو میرے گھر والے ملیں گے۔“ اس کے لہجے میں یقین اور وثوق تھا اور ہر طرح سے کوشش میں بھی تھا لگتا تھا رشتے داروں میں اپنا کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے یاد آتا ایک چچا

تھے ان کا گھر بھی اسے یاد نہیں تھا کیونکہ اب ان سے کم ہی ملتے تھے۔

”تمہارے ساتھ میں بھی تو جاؤں گی۔“

”کیوں بچوں والی بات کرنی ہیں میں اپنی حیثیت جانتا ہوں میں آپ لوگوں کے برابر کا نہیں۔“ وہ افسردگی سے بول رہا تھا۔

”یہ تمہاری سوچ غلط ہے کہ برابر کا نہیں اگر برابر کے نہیں ہوتے تو بابا اور امی اور اس گھر کے افراد تمہیں الگ رکھتے بابا نے ہمیشہ تمہیں آگے ہی رکھا ہے۔“ ماہا کو اس کی سوچ پر دکھ بھی ہوا۔

”یہ میں احسان اس گھر کا کبھی نہیں بھولوں گا مجھے سب نے عزت و اہمیت سے رکھا۔“ وہ اس کا دل سے اعتراف کرتا تھا۔

”اور میرے بارے میں کیا خیال ہے میں تمہیں کیسے رکھتی ہوں۔“ وہ آنکھوں میں سوال لیے اس سے مخاطب تھی۔

”ماہا آپ ہر بات میں اپنی بات کیوں نکالتی ہیں اور وہ بھی زبردستی۔“ وہ پشت پھیر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا ماہا اسے دیوانوں کی حد تک چاہتی ہے مگر یہ بالکل سمجھ نہیں رہی جب بات رشتہ جوڑنے کی آتی ہے تو نکال اس درمیان میں آجاتی ہے اور وہ ویسے بھی کوئی بھی بات اپنی طرف سے نہیں چاہتا جس سے اس گھر کے افراد کے اعتقاد کو ٹھیس پہنچے۔

”کیوں اپنی بات کیوں نہیں نکال سکتی تمہیں چاہتی ہوں تم سے محبت کرتی ہوں اس وقت سے جب میں اور تم شعور کی منزل پر نہیں پہنچے تھے۔“ اسے شہزیل کے اکھڑ اور روکھے سرد مہر رویے سے دکھ ہوتا تھا۔

”مگر میں نے آپ کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی دیکھوں گا انڈرا سٹینڈ۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کے اس کے اندر کے جذبات اور احساسات کو دبانے کے لیے کہا تا کہ وہ اس کے رویے سے دور ہو جائے۔

”شہزیل! تم خود بھی اپنے اندر کے جذبات کی نفی کر رہے ہو تم بھی مجھے چاہتے ہو۔“ ماہا کو اس کی آنکھوں کی چمک ہمیشہ ہی چونکا دیتی تھی جو اسے دیکھتا تو تھا۔

”پلیز ماہا! آپ یہاں سے چلی جائیے، لیکن آپ کیوں جائیں گی آپ تو ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔ مجھے ہی چلے جانا چاہیے۔“ وہ اس کے طنز اور ناگواریت سے بولتا ہوا جانے لگا۔

”شہزیل! ضدی اور ہٹ دھرم بول کے تم مجھے چیلنج کر گئے ہو۔ تم دیکھنا ایک دن میں تمہیں پا کے ہی رہوں گی۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“ وہ جھینپ گیا۔

دل کی حالت ایسی تھی کہ وہ پکار رہا تھا، ایک مرد ہی تو تھا وہ بھی تو انا اور جذبات سے پر، ماہا کو دل میں جگہ دینا نہیں چاہتا تھا مگر اسے وہ جان بوجھ کے انکوریے ہوئے تھا۔

☆.....☆

اسے یہ بات بھول کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ ابونے اسے ڈرائیور کی بھانجی بتایا تھا اور تو اور وہ فہر کو کال کر کے بھی اس سے الجھ ہی پڑی تھی۔

”تم فضول اتنا سوچ رہی ہو انکل نے مجھ کو بتایا ہوگا۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



”آخر تک یہ مجبوری چلے گی، میری اپنی کوئی پہچان نہیں ہوگی اسی طرح ساری زندگی وہ مجھے چھپا کے رکھیں گے۔“ نیل فری آنکھوں کے گوشے بھگ رہے تھے۔
 ”بیٹا! اگر تم بولتو تو میں بات کروں نکلیل بھائی سے۔“

”بہنش خالہ! بالکل نہیں میں انہیں اپنی وجہ سے پریشان بھی نہیں کرنا چاہتی مگر مجھے یہ دکھ ہے میں اپنے باپ کو کسی کے سامنے کھل کے باپ بھی نہیں کہہ سکتی۔“ وہ لب چل رہی تھی۔
 شہوار نے خالہ کی طرف دیکھا وہ بھی اداس اور پر سوچ لگ رہی تھیں۔

”تم خود کو سوائے بور کرنے کے کچھ نہیں کر رہی ہو۔ اٹھو چلو باہر نکلو اور یہ فضول باتوں کو دفع کرو ایک دن تم دیکھنا سرائٹھا کے انکل کے ساتھ ان کے گھر جاؤ گی پتا ہے کیوں، انکل کے دو بیٹے ہیں اور تم ان کی اکلوتی بیٹی ہو اور ان کے بیٹوں کو جب تمہارے بارے میں پتا چلے گا تو وہ خود تمہیں لے کے جائیں گے کیونکہ تم ان کی اکلوتی بہن ہو۔“ شہوار اسے ہمیشہ مثبت انداز میں ہی سمجھاتی تھی۔

”ابو کی بیگم مجھے کیا قبول کر لیں گی۔“ اندر کا خوف یہ بھی تو تھا۔
 ”انشاء اللہ تعالیٰ دیکھنا وہ بھی قبول کر لیں گی انکل بتاتے ہیں وہ بہت اچھی نیچر کی ہیں۔“
 ”ہاں بیٹا! نکلیل بھائی سے میں نے بھی کئی دفع پوچھا ہے۔ وہ اپنی بیگم کی تعریف ہی کرتے ہیں خالہ نے بھی تائیدی انداز میں اسے یقین ہی دلایا۔“

”ارے وقت جب آئے گا تو حالات تمہارے ہی موافق ہوں گے اس لیے تم سوچ سوچ کے خود کو ہلکان نہیں کرو چلو ہم آئیں کریم کھا کے آتے ہیں۔“ شہوار کسی طرح بھی اس کا موڈ اچھا کرنا چاہتی تھی۔
 ”میرا دل نہیں کر رہا۔“

”کیا سے نیل فری مجھ غریب کا بھی سوچ لیا کرو۔ تمہارے طفیل مجھے بھی انجوائے کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔“ شہوار حُظلی سے بولی۔

”بیٹا! باہر نکلو خود ہی تمہارا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔ اٹھو شہا بش۔“ خالہ نے اسے پیار سے اٹھایا۔
 ”ای! آپ جلدی سے تیار ہو کے آجائیں کیونکہ آپ کے بغیر تو یہ بالکل نہیں جائے گی۔“

”ہاں، ہاں مجھے پتا ہے۔“ وہ مسکرائی ہوئی انہیں شہوار نے زبردستی اس کے کپڑے بھی چینج کر دئے۔ کڑھائی والی کرتی اور اس پر کنٹراسٹ میں ٹراؤز اور رنچ اور شاکنگ پنک میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ دوپٹہ وہ ہمیشہ بڑا ہی ادرہ تھی۔

قریبی آئس پارلر پر وہ لوگ آگئی تھیں۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے خاصی گہما گہمی تھی۔
 نکلیل احمد نے اس کے لیے گاڑی کی بات کر لی تھی۔ دو ایک دن میں آنے والی تھی اس کے لیے نیل فری کو ڈرائیونگ اسکول میں ایڈمیشن لینا تھا۔

آئس کریمر وغیرہ سے فارغ ہو کے وہ لوگ گھر کی طرف واپسی کا قصد کر رہی تھیں ابھی موڈ سے وہ تینوں مڑنے ہی والی تھیں کہ اسپورٹس بائیک پوری اسپید سے آئی تھی۔ نیل فری نے چیخ ماری تھی اور وہ بائیک والا فٹ پاتھ سے بائیک ٹکرا کے زمین پر گر چکا تھا۔

”اللہ خیر کرے۔“ خالہ نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ نیل فری وحشت زدہ سی اس لڑکے کو دیکھنے لگی جو کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہوا تھا۔

”یہ چیخ آپ دونوں میں سے کس نے باری تھی؟“ وہ بہت پرہیزگار تھا۔
”ارے آپ ہی پوری اسپید سے آرہے تھے۔“ شہوار نے جواب دیا۔

”دیکھئے باجی میں.....“

”کیا باجی تمہارا دماغ تو درست ہے مجھے باجی کہتے ہو، خود کو کیا سمجھتے ہو؟“ شہوار تو اس پر چڑھ دوڑی۔
”ایسا کیا غلط بول دیا۔“ حمزہ کب دبنے والا تھا۔ نیل فرنے اس لڑکے کو دیکھا واقعی عمر میں وہ کم ہی تھا بمشکل
بیس سال کا ہوگا۔

”دیکھئے آپی! میں ان سے چھوٹا ہوں ناں۔“

”لو تمہیں آپی بنا لیا۔“ شہوار نے اسے گھورا۔

نیل فر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اسے اس لڑکے کی خود اعتمادی اچھی لگی تھی اور پھر وہ خود کتنی عزت سے
باجی اور آپی کہہ رہا تھا۔

”اے بیٹا! بچیاں ڈر گئی تھیں تمہاری گاڑی کے بارن سے۔“ زبیدہ خالہ نے صفائی دی۔
”واٹ بچیاں آئی! یہ اتنی بھی بچیاں نہیں ہیں اگر بچیاں ہیں تو انہیں گود میں لے کے نکالیں بے چاری ڈر
جاتی ہیں۔“ وہ طنز ہی کرنے لگا۔

”اے لڑکے ذرا تیز سے۔“ نیل فر نے اسے گھورا۔

”آپی! اتنی تو تیز سے بول رہا ہوں ایک تو میری کوئی بہن نہیں ہے اس لیے اپنے سے بڑی لڑکی کو ضرور
عزت سے باجی اور آپی کہتا ہوں۔“ وہ بتانے لگا۔
”اچھی بات ہے۔“ نیل فر مسکرائی۔

”اچھا سوری میری چیخ سے آپ گر گئے۔“

”اٹس اوکے مگر پلیز آئیندہ خیال رکھیے گا۔“ وہ اپنی بائیک اٹھانے لگا۔

”کیوں دوبارہ بھی لٹنے کا ارادہ ہے۔“ شہوار نے حیرانگی سے پوچھا۔

”دیکھئے دنیا گول ہے جب ایک بندہ مل جاتا ہے تو بار بار ضرور ملتا ہے یا یوں سمجھیں جن سے ہمارے
تعلقات ہوتے ہیں ان سے ہم بھی نہیں ملے تو وہ لوگ بھی لائف میں ضرور ٹکراتے ہیں یہ الگ بات ہے
رشتہ کا پتا نہیں چلتا۔“

نیل فر نے اس کی اتنی لمبی وضاحت پر چونک کے دیکھا۔ کتنی گہرائی سے اس نے بات کی تھی۔

”اوہو لگتا ہے فلاسفر ہو۔“ شہوار کا انداز فہمائی تھا۔

”فلاسفر تو ہمارے خاندان میں خاصے بھرے پڑے ہیں سب سے بڑی فلاسفر میری ماں ہے۔ اچھا بھئی
چلتا ہوں ویسے خاکسار کو حمزہ کہتے ہیں یاد رکھیے گا۔“

”حمزہ.....“ نیل فر نے چونک کے نام دہرایا۔

”حمزہ شکیل احمد۔“

”بیٹا تم۔“ خالہ اس سے آگے کچھ بولتیں نیل فر نے ان کا ہاتھ دبا یا۔

حمزہ اپنی بائیک اشارت کر کے جا چکا تھا مگر نیل فر کی سوچوں کا رخ اپنی طرف ہی کر گیا اگر یہ وہی حمزہ ہے
تو.....!



وہ اس کی آواز میں ہی کھویا ہوا تھا۔ سیل پر کئی دفعہ ٹرائی کیا مگر رسیونس نہیں کر رہی تھی اور فہر کی بے قراریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ بھی ارادہ باندھ چکا تھا اس سے ملے گا تو ضرور اور کسی بھی طرح۔

”آپ کے بیٹے کو تو اتنی فرصت بھی نہیں کہ ہمارے پاس بیٹھ جائے۔“ رضمن علی نے اس کی تیاری دیکھی جو جانے کے لیے کہیں نکل رہا تھا ان کے شکوے پر فہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ریگ گئی۔

”ابو! آپ بھی آپنی کی طرح شکوہ کرنے لگے۔“ وہ بلیک پینٹ پر پیچ کلر کی شرٹ میں ڈیسینٹ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔

”تم تو لگتا ہے بس پیسہ کمانے کی دھن میں لگ گئے ہو۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ فہر جھینپ گیا۔

”میں تمہارا باپ ہوں تمہاری عمر میں ہمیں بھی یہی دھن سوار تھی۔“

”سچ ابو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل میں آپ خود ہی جانتے ہیں میری جیسی جاب ہے اس میں ہر وقت

الٹ ہی رہنا پڑتا ہے اس لیے آپ کو ایسا لگتا ہے۔“

رضمن علی مسکرائے لگے کیونکہ وہ پریشان ہو کے انہیں وضاحت دینے لگا۔

”تمہاری ماں تو مجھے یہی الزام دیتی ہے کہ میں نے تمہیں بول انجینئر کیوں بنایا۔“

”ابو! آپ میرے بچپن کے شوق کو جانتے ہی ہیں مجھے روڈ اور فلائی اوور بنانے کا شوق تھا۔ بچپن میں

سارے کھیل ایسے ہی کھیلتا تھا۔“

”دیکھا کیسے اپنے ماں باپ کو بہلا رہا ہے۔“ زہرہ نے ہاتھ اٹھا کے انہیں کہا۔

”ارے میں تو مذاق کر رہا تھا میرا ذمے دار بیٹا تو گھبرا ہی گیا۔“

”ابو! آپ نے ایسے لہجے میں شکوہ کیا تو میں تو پریشان ہی ہوں گیا۔“

”مائے بوائے! ایسی کوئی بات نہیں جاؤ تم کسی میٹنگ میں جا رہے تھے۔“ انہوں نے نک سٹ سے تیار ہوئے

فہر کے شانے پر پھکی دی۔

وہ زہرہ کے گلے لگ کے نکل گیا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے سیل نکالا اور دوبارہ اس لڑکی کا نمبر پر لیس کیا۔

”کم ان پک کرو۔“ وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار رہا تھا۔

”تھینک گاڈ پک تو کی کال۔“

”کون؟“ دوسری طرف سے اس کی جھجکتی ہوئی آواز آئی۔

”ارے وہی شاہر زوالے خاکسار ہیں سیل کیوں آف کیا ہوا تھا۔“

”آپ.....“ وہ توجیح ہی پڑی۔

”آہستہ، شکر ہے پہچان لیا۔“ فہر نے ہنس کے کہا۔

”آپ کو ضرورت کیا پڑی ہے کال کی۔“

”آپ سے ملنا ہے۔“ اس نے جھٹ کہا۔

”میں فضول اور ابرے غیروں سے نہیں ملتی۔“ اس نے توجیح کے کہا۔

”ٹھیک ہے نہیں ملو میں گھر بیچ جاؤں گا وہ ڈرائیور آپ کا ناموں ہے ہمارے کے ساتھ۔“
 ”نہیں آپ ایسا بالکل نہیں کریں گے۔“ نیل فر تو گھبرا گئی۔
 ”پھر ملنے کی ڈیٹ فکس کر لیں۔“
 ”کبھی نہیں۔“ نیل نے لائن ہی کٹ کر لی۔

”محترمہ آپ جو کوئی بھی ہو میں ایسے تو نہیں چھوڑوں ہر نی جیسی آنکھوں والی وحشت زدہ سی لڑکی مجھے جانے کیوں اچانک سے متاثر کر گئی۔“ اس نے خود سے ہمکلامی کی اور مسکرا کے گاڑی اشارت کر دی۔
 وہ ایسا بالکل نہیں تھا کہ لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے والا۔ جانے کیوں اس کے خواب و خیالوں میں آنے لگی تھی۔

”فہر علی! جس کے پیچھے پڑ جائے اسے چھوڑنا نہیں ہے۔“ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ آج بھی اس کا ارادہ نکلیل ماموں کی طرف جانے کا تھا۔ کسی طرح تو ان کے ڈرائیو سے کچھ تو پتا چلے مگر ماموں جان اتنا کھبرائے کیوں تھے وہ ان کے اپنی گیٹ کے باہر گاڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔

”فہر علی! تم پر یہ حرکت بالکل اچھی نہیں لگ رہی لڑکی کا ایڈریس معلوم کرو گے۔ یہ اچھی بات تو نہیں ان کا ڈرائیو کیا سوچے گا پھر ماموں جان کے سامنے عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔“
 ”ہشت یہ مجھے کیا ہو گیا ہے فہر علی تو سویری شخصیت ہے وہ لڑکی اگر میری قسمت میں ہوگی تو مجھے ضرور دوبارہ نکرائے گی۔“ اس نے اپنی گاڑی کا رخ موڑ لیا تھا۔

اس نے اپنے لقمہ اور حورے کام نمٹائے اور واپسی پر کنول کی طرف چلا گیا۔ کافی کچھ لے کے۔ وہ اس کی یوں اچانک آمد پر ہی خوش ہو گئی تھیں اور بچے الگ اپنے مصروف ماموں کو دیکھ کر پھولے نہیں سمارے تھے۔

☆.....☆

جاب اس کی بہت اچھی تھی اور یہ سب اوپر والے کی مہربانی تھی جو جاب اس کی مرضی کی بل گئی تھی۔ اسے جوائن کیے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ آریکے کا اور اس کا سنا نہیں ہوا تھا۔ ایسے نے اس کی جاب کی خوشی میں میلا اور قرآن خوانی بھی کروائی تھی وہ اسے اس دوران بھی نظر نہیں آئی تھی۔ شرمہ اور آنٹی ہی نظر آتی تھیں۔
 حنین کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی امی سے پوچھنے کی، مگر دل میں اندر بے چینی ضرور تھی وہ جب سامنے ہوتی تھی اس سے چڑچڑ کے بولتا تھا اور اب جب کہ وہ اس کے سامنے تھی تو چڑچڑا ہوا رہا تھا۔

”حسن کو بھی اٹھا دو، ساتھ ہی ناشتہ کر لے گا بار بار مجھ سے نہیں ہوتا۔“ امی اس کے آگے دوپراٹھے اور آلیٹ رکھنے لگیں حنین نے چونک کے سر اٹھایا تھا۔

”آپ جانتی تو ہیں چھٹی والے دن وہ دیر تک سوتا ہے۔“

”اتنی دیر تک بھی کیا دوپہر ہو جاتی ہے دوپہر کے کھانے میں دیر ہو جاتی ہے۔“ وہ بھی چیخ کر کھسا کے بیٹھ گئی تھیں۔

”حرا نے کر لیا ناشتہ؟“

”ہاں کر کے گئی ہے اوپر شرمہ کے پاس گئی ہے۔“ انہوں نے بتایا۔

”خیر بیت؟“ حنین نے چونک کے پھر پوچھا۔

”آریکے کو کچھ لوگ دیکھنے آ رہے ہیں شرمہ، آریکے کا وہ کیا ہوتا ہے چہرے کا فیشن کروا رہی ہے۔“ وہ سادہ

خسین نے بے چینی سے پہلو بڑلا۔

”کس لیے دیکھنے آرہے ہیں؟“ انجان بن کے استفسار کرنے لگا۔

”ارے بیٹا بیٹیاں پر ایادھن ہوتی ہیں چھٹی جلدی ہوماں و باپ کے سامنے اپنے گھر کی ہو جائیں تو اچھا ہے۔“

”لگتا ہے انکل اور آنٹی بیٹیوں سے بے زار ہو گئے ہیں۔“ وہ چائے کے سپ لینے لگا۔

”ایسی بات نہیں، مجھے تو اپنی حرا کی بھی فکر ہے۔“

”امی! حرا ابھی بچی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس کی شادی اچھے خاندان میں ہوگی اس کے دو بھائی موجود ہیں۔“ اس نے امی کو تسلی اور اطمینان دلایا۔

”تمہارے ابو کی لاڈلی بھی اس کے دنیا میں آتے ہی اس کے اتنے لاڈ اٹھائے نہیں اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ بیٹی کو بڑا ہوتا دیکھتے۔“ امی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”امی آپ پھر ابو کو یاد کر کے رونے لگیں۔ ہم دو بیٹے ہیں تو آپ کا سہارا۔“ اس نے ناشتے سے فارغ ہو کر ان کے کندھے تھام لیے۔

”اچھا چھوڑو تم یہ برتن اٹھاؤ اور کچن میں رکھ کے آؤ۔“ انہوں نے اپنے آنسو صاف کر لیے اپنے بچوں کو اپنی وجہ سے پریشان اور افسردہ بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

انہیں اصل اداسی تو آریکہ کی بھی ان کے دل میں یہ خواہش تھی یہ سگھڑ اور سمجھ دار لڑکی ان کے گھر کی بہو بن جائے مگر خسین کا ٹیکھا اور حرا مزاج انہیں بات ہی نہیں کرنے دے رہا تھا۔

”کیا رشتہ پکا ہو رہا ہے آریکہ کا؟“ خسین نے قدرے توقف کے بعد رک رک کے پوچھا۔

”نہیں ابھی تو دیکھنے آرہے ہیں جب پسند آجائے گی تو بات آگے بڑھے گی۔“

”اللہ کرے بات آگے بڑھے ہی ناں۔“ خسین نے دل میں دعا کی۔

”کیا کہا؟“ امی کو ایسا لگا اس نے کچھ کہا ہو۔

”نن..... نہیں تو۔“ وہ کڑبڑا ہی گیا۔ کیونکہ دل کا چور چرے سے عیاں بھی ہونے لگا تھا۔

امی نے اس کا چہرہ کالی نقبتی نگاہوں سے جانچا خسین کے چہرے پر انہیں آج کچھ خاص رنگ لگا کر وہ اس رنگ کو زبان دینے سے ڈرتی تھیں۔ اگر انہوں نے اس سے کچھ پوچھا تو کہیں وہ ٹہنی نہ کر دے۔

”بھالی صاحب ایک کے فرض سے فارغ ہوں گے تو ہی دوسری کی باری آئے گی۔“

”امی آپ کو اچانک سے دوسری کی بھی فکر ہونے لگی۔“ وہ اٹھ کر بیسن پر آ گیا اور ہاتھ دھونے لگا۔

”دونوں بچیاں بہت اچھی ہیں سلیقہ شعار اور تمیز دار۔“ وہ آریکہ اور شمرہ کی تعریفوں میں لگ گئیں۔

”آج خسین احمد تمہیں اتنی بے چینی کیوں ہو رہی ہے۔ اچھا ہے نا وہ تمہارے سامنے سے چلی جائے گی تمہیں چڑ بھی ہوتی تھی۔“

”نہیں وہ چڑ نہیں وہ ایک الگ احساس تھا جو شاید تم سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ آج تمہیں ایک دم سے اس کے پرانے ہونے کا احساس ہوا تو تمہارے اندر ہلچل مچ گئی۔“

”ارے خسین! کیا سہرے ہو گئے ہو۔“ امی کی تیز کار پر وہ سوچوں سے باہر نکلا۔

”جی امی!“ وہ چونک بھی گیا۔

”بیٹا! حسن کو انھاد میں دوپہر کے پکانے کے لیے سامان منگواؤں گی ہو سکتا سیلہ کو بھی منگوانا ہو۔“ انہوں نے آریکہ کی امی کا نام لیا۔

”آپ بار بار کیوں اتنی فکر کر رہی ہیں۔“

”بیٹا! ان کے گھر کوئی لڑکا تو ہے نہیں جو بھاگ بھاگ کے بازار جائے اور رہے بھائی صاحب وہ کون سا صحت مند ہیں ہم پڑوسی ہیں کچھ تو ہمارا بھی فرض بنتا ہے۔“ وہ ڈائمنگ ٹیبل سے برتن اٹھانے لگیں۔

”اگر اتنا ہی فرض بنتا ہے تو ان کی بیٹی کو بیاہ کے بیٹھ لے آئیں۔“ حسین نے روانی میں ایسی بات کہہ دی ای تو متحیر زدہ ہی سکتے میں آگئیں۔

اور حسین وہ تو گڑ بڑا گیا اسے خود اندازہ نہیں تھا وہ بے وقوفی میں ایسی بات کہہ دے گا۔

”کیا بک رہے ہو۔“

”واقعی بک دیا ہے۔“ وہ خود بخجل ہو کے اندر کی طرف بڑھ گیا۔

حسین خود پر حیران تھا۔ اس نے یہ بات کہہ کیسے دی۔

”حسین احمد! جو تمہارے دل کی سچائی تھی وہ خود تمہاری زبان سے ادا ہو گئی۔“ اندر سے اسے گھر کوئی کہہ

رہا تھا۔

”حسین احمد یہی سچ ہے وہ لڑکی تمہاری زندگی کا حصہ ہے جب ہی تو وہ ہر وقت تمہاری سوچوں میں ساتھ رہتی

ہے۔“

حسین سر تھام کے اپنے بید پر بیٹھ گیا۔ آریکہ کے رشتے کا سن کے تو اسے کچھ اچھا ہی نہیں لگ رہا تھا اگر واقعی

وہ لوگ اسے پسند کر کے چلے گئے تو وہ تو چلی جائے گی اور پھر وہ کس سے لڑے گا۔

”نہیں وہ میری زندگی میں شامل رہے گی۔“ وہ خود سے بولا تھا۔

”ای! پتا نہیں کیا سوچ رہی ہوں گی۔“ اسے یہ بھی فکر تھی۔

☆.....☆

رمعہ نے بہت سوچ اور سمجھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا اسے شہیر کی آفر قبول کر لینی چاہیے کیونکہ کہیں اور تو اس

کی جاب کا کوئی بھی سلسلہ نہیں بن رہا تھا۔ پھر گھر کے اخراجات اور ابو کا علاج یہ سب بہت ضروری تھے۔ نمبرہ

اور اجب کی فیس بھی رہتی تھی۔ آج ابو کو پھر اسپتال چیک اپ کے لیے لے جانا تھا۔ ابو پہلے سے کافی بہتر ہو گئے

تھے ان کا پاؤں تھوڑا تھوڑا حرکت کرنے لگا تھا۔ بعض دفعہ وا کر سے وہ واک بھی کر لیتے تھے۔ کافی حد تک ان

کے علاج سے مطمئن بھی تھی کیونکہ ڈاکٹر شہیر نے یہ بھی تو کہا تھا ابو کا علاج یہاں فری ہو گا اگر وہ جاب

کر لے گی تو۔

”ابو! تیار ہو گئے ہیں تو ای ان کی فائل اور پانی وغیرہ بیگ میں رکھ دیں۔“ رمعہ کے چہرے پر کچھ اطمینان

نظر آ رہا تھا۔

گھٹ نے اسے کافی سمجھایا تھا وہ اس جاب کو قبول کر لے تو اچھا ہے، چاہے وہ ساتھ ساتھ دوسری جاب بھی

تلاش کرنی رہے۔ گرین برینڈ ڈیکٹروں میں ملبوس پریشانی اور فکروں جتنا وہ ہاسپٹل آگئی تھی۔

ابو کا بہر خلاف توقع آج پھر جلدی آگیا تھا۔ ڈاکٹر شہیر نے ان کا نفسیاتی چیک اپ کرنے کے بعد انہیں

معنہ کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ بات کرے۔ شہیر ڈاکٹر تھا وہ چہرے پڑھنا خوب جانتا تھا وہ معنہ کے تاثرات جانچ رہا تھا۔

”سر! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ ابو کو باہر چھوڑ آئی تھی اور خود اس سے بات کرنے آگئی۔ شہیر نے چونک کے سر اٹھایا۔ وہ خوش بھی ہوا وہ آگئی تھی۔

”جی کہیے۔“ وہ اس کی جانب مکمل متوجہ ہو گیا۔

معنہ نے جھینپ کے سر جھکا لیا۔

”بولے کیا کہنا ہے۔“

”مجھے آپ کی آفر قبول ہے۔“

”کون سی آفر؟“ وہ انجان بنا۔

”آپ لیب میں جاب کی بات کر رہے تھے لاسٹ ٹائم۔“

”اوہاں یاد آیا آپ تیار ہیں۔“ وہ تاثرات ایسے دینے لگا جیسے یاد ہی نہیں ہو۔

معنہ کو اس کا انجان بننا پسند نہ لگا رہا تھا مگر اس وقت مجبوری تھی۔

”جی میرے پاس جب تک کوئی جاب نہیں ہے، میں اس جاب کو کرنے کو تیار ہوں۔“ نگاہ اس کے پیچھے کی ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے آپ باہر وٹ کریں میں کال کر کے بلاتا ہوں آپ لیٹر وغیرہ ابھی لے جائیں۔“

معنہ حیران رہ گئی اتنی جلدی وہ سب کچھ کروا رہا تھا۔

”کوئی انٹرویو نہیں ہوگا۔“

”انٹرویو مجھے لینا تھا میں نے لے لیا آپ زیادہ سوچے نہیں آپ کو اپنا نمونٹ لیٹر ابھی مل جائے گا۔“ شہیر اس کی حیران وہ پریشان صورت دیکھ کر مسکرانے لگا۔

معنہ جزبہ ہو گئی جب تک وہ باہر انتظار کرتی کچھ ہی دیر میں شہیر اپنے روم سے باہر آ گیا تھا۔

”یہ آپ کا لیٹر ہے آپ کل صبح نو بجے آجائے گا باقی کا سارا کام آپ کو انچارج سنبھال دے گی۔“

”جی اچھا تھینک یو۔“ معنہ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اب تو بس حیرانگی سے دیکھ رہے تھے، کیونکہ معنہ نے ان کی بات جو مان لی تھی۔

”انکل! آپ اسی طرح واک جاری رکھیے گا آپ انشاء اللہ اپنے پیروں پر جلد کھڑے ہو جائیں گے۔“

”بیٹا! آپ کی توجہ اور دعا سے میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ معنہ وہیل چیئر کھسکا کے باہر لے جانے لگی تھی۔

شہیر نے اس پر سوچ اور افسردہ لڑکی کو دور تک جاتے دیکھا جو بلا ضرورت کوئی بات ہی نہیں کرتی تھی۔ یہ بھی لگتا تھا اس نے جاب مجبوری میں قبول کی ہے۔

☆.....☆

شہیریل کو ماہا کی طرف سے فکر ہو رہی تھی۔ وہ پاگل پن میں کسی حد تک بھی جاسکتی ہے اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے زیادہ سے زیادہ اپنا وقت آفس میں گزار رہا تھا، اکثر سچ پر بھی گھر نہیں آ رہا تھا۔

”شہیریل بیٹا! آپ زیادہ پریشان نہ ہوں آپ کی آنٹی کہہ رہی تھیں آپ لنچ بھی کرنے نہیں

آرے۔ ”نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے فیب احمد کی بات کی نفی قدرے سنبھل کے مسکرا کے کی۔
”آج فیب احمد آفس سے گھر اس کے ساتھ جا رہے تھے تاکہ راستے میں وہ اس سے بات چیت بھی کر لیں۔
”دیکھو بیٹا! میں سمجھ سکتا ہوں آپ اپنے گھر والوں کو بہت مس کرتے ہو اور ایک آس بھی ہے وہ مل جائیں
گے۔“ انہوں نے ڈرائیو کرتے سنجیدہ سے شہریل کو بغور دیکھا جو بچپن سے ہی سنجیدہ تھے گھر کے بچوں کے
مقابلے میں وہ الگ ہی مزاج کا تھا۔

”پتا نہیں انکل۔“ لہجے میں افسردگی اور مایوسی بھی تھی۔

”بیٹا! کبھی بھی آس و امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ زندگی دی ہے تو اس نے
آس و امید کو بھی پیدا کیا ہے تاکہ اس کے بندے مایوس نہیں ہو جائیں، ان کے ذہن میں یہ نہیں رہے ایک دن
سب ختم ہو جاتا ہے۔ ختم تو اپنے وقت پر ہی ہوگا مگر اللہ نے انسان کے لیے خوشیاں بھی رکھی ہیں جو اس کے حصے
میں ضرور آتی ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بندہ سوچ کو اپنی مثبت رکھے۔“ وہ اسے مدبرانہ انداز میں ہی
سمجھاتے تھے۔ اسی وجہ سے ہی تو شہریل کی آس و امید بندھی تھی اگر وہ کبھی مایوس ہوتا تو فیب احمد اس کا حوصلہ
بڑھانے کو آجاتے تھے۔

”سر! میں صرف آپ کی وجہ سے اتنا مضبوط ہوں، ورنہ شاید میرے اندر کی ساری امیدیں دم توڑ دیتیں۔“
اس نے آہستگی سے موڑ کاٹا۔ گاڑی وہ بڑے مہمل انداز میں ڈرائیو کرتا تھا اور دماغ کو حاضر بھی رکھتا تھا۔
فیب احمد اس کی اس خوبی کے معترف بھی تھے۔

”مجھے خوشی اس وقت اور ہوگی جب تم اپنی امیدوں میں کامیاب ہو گے۔ بس اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا کیونکہ اس
نے ہی تمہاری تقدیر بھی بنائی ہے۔“ شہریل نے سر ہلایا۔

”سر! شہیر کی کال آئی تھی کہہ رہا تھا واپسی میں مجھے بھی لے لینا۔“ اسے یلزم ہی یاد آیا۔

”ٹھیک ہے لے لو۔“ انہوں نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں وہ لوگ اسپتال کے پارکنگ ایریا میں تھے۔ شہیر کو وہ کال کیے جا رہا تھا وہ ریسیو ہی نہیں
کر رہا تھا۔

”کیا بات ہے کال ریسیو نہیں کر رہا؟“ فیب احمد نے اسے مسلسل سیل کے ساتھ لگے دیکھا۔

”کال تو جا رہی ہے ریسیو نہیں کر رہا۔“ اس نے سیل اپنی پاکٹ میں رکھا۔

”آپ ایک سنٹ رکے میں خود اندر جا کے دیکھتا ہوں۔“ وہ گاڑی سے اتر گیا۔

اس کے چہرے پر اتنے فکروں کے جال تھے اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

اندر وہ آچکا تھا ریسیپشن سے پتہ کیا وہ لیب میں تھا۔

پھر دوبارہ کال کی مگر ندارد۔

”ایکسیکوزی ڈاکٹر شہیر ہیں۔“ ریسیپشن پر موجود چھوٹی اور پیاری سی لڑکی کو مخاطب کیا جو کمپیوٹر پر لگی
ہوئی تھی۔

”جی۔“ اس نے چونک کے سر اٹھایا۔

شہریل بھی ایک لمحے کو چونکا، جانے کیوں یہ نقوش اسے کسی کی یاد دل رہے تھے۔ لڑکی گڑبگڑ گئی کیونکہ ابھی

وہ بھی تھی۔

”ڈاکٹر شہبیر اندر ہیں۔“ وہ رک رک کے بولی۔

”پلیز انہیں بلائیے۔“ وہ اپنی بلیک پینٹ کی پاگ میں سیل رکھنے لگا اسکائی بلیو شرٹ کی آستین فولڈ کیے وہ

خاصا ڈیسنٹ اور سویر لگ رہا تھا۔

”یار عجیب شخص ہو سیل کس کو نے میں پھینکا ہے۔ ریسیو نہیں کر رہے تھے۔“ شہزیل اس پر چھوٹے ہی برہم

ہونے لگا۔

”سوری، سوری۔“ شہبیر مسکرا کے بولا۔

”سر آپ کا سیل یہ رہا۔“ اس نے سیل اٹھا کے ویا۔

”تھینک یو۔“ شہبیر نے سیل اس کے ہاتھ سے لیا۔

”کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے نا سمجھ آگیا کام۔“ وہ رمعہ سے مخاطب تھا۔

شہزیل کی نگاہ اس پر لگی تھی جانے کیوں وہ چہرہ اتنا مانوس سا لگ رہا تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں۔“ رمعہ کو شہزیل کی نگاہیں کنفیوژ کرنے لگیں شاید شہبیر کو احساس ہو گیا تھا۔ اس نے شہزیل

کی پشت پر ہنسی دی۔

”تم چلو میں اپنا سامان لے کر آ رہا ہوں۔“

”آں ہاں جلدی آ جانا۔“ وہ چونک گیا اور تیزی سے مڑ گیا۔

”اتنی مانوس سی کیوں لگ رہی ہے میری بہن رمعہ بھی اتنی ہی بڑی ہو گئی ہوگی۔“ وہ سوچتا ہوا جا رہا تھا پورا

راستہ اس نے خو سے اچھتے ہی گزارا تھا۔ شہبیر اس سے باتیں بھی کرتا رہا مگر وہ ہوں ہاں ہی کرتا رہا نہایت احمد سمجھ

گئے تھے وہ بہت زیادہ ڈسٹرب ہے اسی وجہ سے وہ بات بھی نہیں کر رہا تھا۔

☆.....☆

”اگر میں بائیک فٹ پاتھ پر نہیں گرانا تو ضرور وہ لڑکی تھک جاتی۔“ وہ شریا کو اپنی گزشتہ دن کی گزری ہوئی

واردات بتا رہا تھا۔

”میں تو سخت خلاف ہوں تمہاری بائیک کے۔ ابھی تم اتنے بڑے ہوئے نہیں ہو اور تمہارے باپ نے ولا

وی۔“

”کم ان امی! میں بڑا ہو گیا ہوں۔“ حمزہ اپنی باؤی کوتان کران کے سامنے آ گیا۔

”ابھی بیس کے بھی نہیں ہو جو اپنی باؤی دکھا رہے ہو۔“ شریا نے اسے ڈانٹ ہی ویا۔

”ارے بھی کیا گفتگو ہو رہی ہے ماں بیٹے میں۔“ نکلیل احمد رات کو کھانے کے بعد دو گھنٹے نیوز چینل ضرور

دیکھتے تھے ان کی لاؤنج سے گاہے بگاہے نگاہ ڈانگ ہال کی سمت بھی اٹھ رہی تھی جہاں حمزہ اور شریا باتوں میں

مصروف نظر آ رہے تھے۔

”صاحبزادے کو اور اسپورٹس بائیک لے کے ویس ایکسیڈنٹ کر دیتا کسی لڑکی کا وہی بتا رہا تھا۔“

”ای! میں آپ کو اس لڑکی کے متعلق بتا رہا تھا اس نے چیخ ایسی خوفناک ماری تھی میں حواس باختہ ہو گیا تھا۔“

وہ تو نکلیل احمد کے سامنے گڑ بڑا ہی گیا۔

”ارے بیٹا! کسی کو مار تو نہیں دی۔“

”ابو ایسا کچھ نہیں کیا میں تو امی کو صرف بتا رہا تھا ویسے ابو وہ باجی تھی بڑی خوب صورت۔“
”زبان سنبھال کے ابھی سے لڑکیوں کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“
”کم آن ابو میں باجی کہہ رہا ہوں ایسا کوئی رومانس نہیں جھلک رہا میری باتوں میں۔“ اس نے تو اپنا سراہی پیٹ لیا۔

”آپ اپنے بڑے بیٹے کی خبر گیری رکھا کریں۔“
”اس..... یہ تم میرے پیچھے کیوں پڑ رہے ہو۔“ ضیاء کو دیکھ کر اس نے لقمہ ہی دیا تھا۔
”میں نہایت ایمانداری سے آفس کے معاملات سنبھالے ہوئے ہوں۔“ اس نے برامان کے کہا۔
”ای! یہ آپ کی عادت اس میں آگئی ہے۔“
”ہاں بیٹا! یہ تم نے ٹھیک کہا تمہاری ماں مجھ پر بھی شک کرتی ہے وہ بھی اس عمر میں۔“ ٹکلیل احمد کو بھی موقع مل گیا جب کہ ثریا تو خفیف ہی ہو گئیں۔
”آپ باپ بیٹا ہر وقت میری کھینچ پانی کرتے رہا کریں۔“ وہ تو باقاعدہ ناراضی اور خفگی دکھانے لگی تھیں۔
”ای! ویسے ہماری ایک بہن تو ہونی چاہیے تھی جو آپ کا ساتھ دیتی۔“ حمزہ نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔ ثریا نے اس کی پشت پر پھپھر سید کر دیا۔

”ای! میں ابھی کون سا کہہ رہا ہوں۔“
”کیا اس آتی ہے تمہیں تو۔“ وہ پہلو بدل کے رہ گئیں۔ ٹکلیل احمد نے لب بھینچ لیے ان کی ایک پیاری سی بیٹی تو موجود ہے مگر وہ اس گھر میں لانے کے لیے کوئی مناسب وقت ہی دیکھ رہے تھے۔
”ای! آپ تو سیریس ہو گئیں۔“ ضیاء نے ثریا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔
”اسے ہی بہن کا ارمان ہو رہا ہے تو اپنے باپ کی دوسری شادی کروادو۔“
”فرض کریں کروادی تو آپ قبول کر لیں گی ان کی بیوی اور بیٹی کو۔“ حمزہ نے اچانک سے بول دیا۔
ٹکلیل احمد نے حیرانگی سے اس کی بات سنی۔
”شرم تو نہیں آتی ماں کو سنا تے ہوئے تمہارے ابو میرے علاوہ کبھی کسی کا سوچ ہی نہیں سکتے۔“ ان کے لہجے میں وثوق اور یقین تھا۔
”ٹکلیل احمد نے نگاہ چرائی وہ تو خود ایک حقیقت چھپا کے بیٹھے تھے ان کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کیسے وہ شروعات کریں۔“

”حمزہ! ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔“ ٹکلیل احمد نے سرزنش کی۔
حمزہ کو بھی احساس ہوا وہ غلط ہی بول گیا تھا۔
”ابو! کل کی میٹنگ کا کیا کرنا ہے۔“ ضیاء نے ہی خود بات کا رخ بدلا۔
”کل تم میٹنگ رکھ لو مجھے ضروری کہیں جانا ہے۔“ انہوں نے کالی دن سے نیل فر کے لیے گاڑی بک کروائی تھی اسے لے جانا تھا۔
”آپ اچانک سے کہاں چلے جاتے ہیں۔“ ثریا کو جانے کیوں ایسا لگتا رہتا تھا کہ ٹکلیل احمد ان سے کچھ پھپھار رہے ہیں۔

”گھر بلا لیں۔“ ثریا پھر گویا ہوئیں۔
”مناسب وقت دیکھ کر بلا بھی لوں گا۔“ لہجہ ان کا جانے کیوں معنی خیز ہو گیا۔
”ٹھیک ہے ابو میں اٹینڈ کر لوں گا۔“ ضیاء نے سعادت مندی سے سر جھکایا۔
نگلیل احمد اپنے روم میں چلے گئے تھے۔ ثریا اور وہ دونوں وہیں بیٹھے تھے۔
”ابو نے کل پندرہ لاکھ روپے بھی نکلاوائے پتا نہیں کیوں؟“ ضیاء کو تشویش بھی تھی۔
”تم پوچھتے۔“

”اچھا نہیں لگتا ہے ابو کو آپ جانتی ہی ہیں اچانک سے سر پر از دینے کی عادت ہے جیسے مجھے اسپورٹس بائیک
دلانی۔“ حمزہ نے ہی وضاحت بھی دی۔

”ہوں..... ہو سکتا ہے کسی کو دینے ہوں۔“ ضیاء نے خود ہی بات بھی بنائی۔
ثریا بھی اٹھ کے روم میں چلی گئی تھیں ضیاء اندر ہی اندر نگلیل احمد کو نوٹ کرنا تھا مگر ثریا سے کچھ نہیں کہا تھا۔

☆.....☆

”مجھے ایسے کیوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ سچ میں پہچانتا ہی ہو۔ اس کی شکل شہزیل بھائی سے بھی مل رہی تھی۔“ جب
سے وہ اپنی جانب سے واپس آئی تھی رمعہ کا ذہن شہزیل کی طرف ہی بھٹک رہا تھا۔
”لگتا ہے ڈاکٹر شہیر کے کزن تھے۔ ارے میں کیوں سوچے جا رہی ہوں۔“ اس نے خود ہی اپنے خیالات کی
نفی بھی کی۔ کاش..... شہزیل بھائی ہمیں مل جاتے تو ہمارے گھر کے ایسے حالات بھی نہیں ہوتے۔“
رمعہ کیا بات ہے سوئی نہیں۔ ”امی عشاء کی نماز پڑھ کر اسے اور نمبرہ کو دیکھنے آئی تھیں۔ نمبرہ تو سو گئی تھی۔
جب کہ وہ جاگ رہی تھی۔“

”نیند نہیں آرہی گی۔“ وہ سیدھی ہو گئی۔
”ابو سو گئے؟“

”ہاں سو گئے ہیں۔“ وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔
”جواب تو اچھی ہے نا؟“

”جی امی! بہت آسان اور اچھی ہے۔“ رمعہ کو ہی خوشی تھی۔ زیادہ محنت نہیں تھی اسپتال کی گاڑی ہی گھر
چھوڑنے بھی آ جاتی تھی۔
”تنخواہ۔“

”تنخواہ اٹھارہ ہزار ہے۔“ اس نے بتایا۔

”شکر ہے مالک کا۔“ امی نے شکر ادا کیا۔

”امی شہزیل بھائی ہمیں ڈھونڈتے تو ہوں گے۔“

”آج کیسے یاد آنے لگی۔“ وہ تو اسے ہر لمحہ ہر گھڑی یاد کرتی تھیں۔ ماں تھیں دل کو چین و قرار ہی نہیں تھا۔

”پتا نہیں میرا بچہ کیسا ہوگا۔“ وہ رونے لگیں۔

”انشاء اللہ تعالیٰ اچھے ہی ہوں گے۔“ رمعہ ہمیشہ انہیں تسلی اور اطمینان دلاتی تھی۔

”ہم نے تو وہ گھر بھی چھوڑ دیا میرا بچہ کیا پتا ڈھونڈتا ہوا آیا ہو۔“

(جاری ہے)

زور شور کا موسم

پھولوں کی مہک سے معطر فضا تاروں سے پھوٹی خنکی نے
اس کی آنکھیں خیراں کر دی تھیں، اس کا جی چاہا کہ اس

وہ کھڑکی کھولے باہر سے اندر آتی ٹھنڈی ہوا کی
تازگی کو اپنے اندر اتارنے میں مگن تھی، تازہ چینیلی کے



وہ ایک چھوٹے سے شہر کی پروردہ بڑے شہروں کے رہنے والوں جتنا بڑا دل نہیں رکھتی تھی، سارا دن وہ شہباز کے صحیح سلامت گھر آجانے کی دعائیں مانگتی تھی اور جو کسی دن اس کو در ہو جاتی تو وہ چلے پیر کی بلی کی طرح اس چھوٹے سے گھر میں دائیں بائیں چکر لگا لگا کر اپنے پیر شل کر لیتی تھی۔

کمرے کے کونے میں بیٹھ کر وہ زار و قطار روتے ہوئے اللہ کو اس کے نبی کے واسطے دیتی کہ شہباز کی زندگی بخش دے، اس کو صحیح سلامت گھر بھیج دے اور جب وہ دیر سے گھر آتا تو اس سے الجھ پڑتی، کبھی اکھار جو وہ بڑے موڈ میں ہوتا تو اس کو بے نقط سنا ڈالتا۔ ایک دن تو لڑائی اتنی بڑھی کہ شہباز نے غصے میں آکر اس کو اپنا سامان باندھنے کا کہہ دیا۔

”کیا بکواس کر رہا ہے تو؟“ وہ تنک کر بولی۔
 ”دیکھ ماریہ! تو جاہل ہے اور جاہل رہے گی، تو نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ میں یہاں کمانے آیا ہوں، عیاشیاں کرنے نہیں آیا، ابھی کام پر نکلتا ہوں کہ تیرا فون آجاتا ہے، شام کو آٹھ بجتے ہیں اور پھر سے تو میرا دماغ خراب کرنے لگ جاتی ہے، کیا تیرے کھونٹے سے بندھ کر بیٹھ جاؤں؟ تو اماں کے پاس حاصل پور چلی جا، میں ہتھ میں ایک بار آکر مل جایا کروں گا تجھ سے، جلدی کر سامان باندھ میں افتخار سے کہتا ہوں تجھے چھوڑ آئے گا۔“ وہ کہہ کر کمرے میں چلا گیا اور ماریہ وہیں صحن میں بیٹھ کر زار و قطار رونے لگی تھی پھر روہاسی ہو کر بولی۔

”میں چلی جاؤں گی حاصل پور، نہیں رہوں گی یہاں، میرے رہنے سے تو پریشان ہوتا ہے ناں تو سن خوش ہو جا میں جارہی ہوں۔“

”تو پھر چلی جاناں، مرا کون جارہا ہے تیرے لئے، جان چھوڑ میری۔“ وہ کمرے کی کھڑکی کے قریب آ کر دھڑا دھڑا ایک وہ وقت بھی تھا جب یہی شہباز چلا جاتی

وقت اس کے پہلو میں شہباز کھڑا ہوا تو یہ منظر کتنا دلکش و مکمل ہوتا لیکن وہ تو جانے کہاں رہ گیا تھا۔ آج پھر اس کو دیر ہو گئی تھی، رات کے 9 بج گئے تھے اس کی جان سولی پر لٹکنے لگی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا منظر پس منظر ہو گیا تھا اب تفکرات کی تہی چادر نے اس کے ارد گرد بکل مار لی تھی، اس نے اس کا نمبر ملایا، نمبر بند تھا، خوف کی تند و تیز لہروں نے اس کی ریڑھ کی ہڈی سننا دی تھی، وہ چھ بار دروازے پر جا کر پلٹ آئی تھی لیکن اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا، تھک ہار کر اس نے افتخار کا نمبر ملایا، دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

”ہاں بھر جانی کیا ہوا ہے؟“ افتخار کی آواز میں کسی قدر خیریت کی پرچھائیاں رقصاں تھیں، وہ جانتا تھا کہ ماریہ بھی بغیر کام کے اس کو فون نہیں کر سکتی تھی۔
 ”بھرا! وہ شہباز ابھی تک گھر نہیں آیا۔“ اس کی متشکر آواز سن کر وہ بے ساختہ ہنسنے لگا تھا۔

”وہ میرے ساتھ ہی تھا ابھی کچھ دیر پہلے گھر کے لئے روانہ ہوا ہے، اب تو پہنچنے والا ہوگا۔“ اس نے اچھا کہہ کر موبائل بند کر دیا تھا جبکہ اماں بی کہتی تھیں کچھ عرصے سے اس شہر کے حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے ہیں، جانے کتنے واقعات اماں بی کہاں کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس کو سنانے کے لئے لے آتی تھیں اور وہ دم بخود وہ سارے واقعات سننتی تھی۔

”نسیم ہے ناں، تم تو جانتی ہو پہلے اسی محلے میں رہتی تھی کچھ عرصے کے لئے سسرال والوں کے ساتھ رہنے چلی گئی، ایک دن کچھ لڑکے اس کے گھر گھس گئے اس کے شوہر کو کوئی ماردی، اس کے شوہر کا تعلق کسی تنظیم سے تھا، دشمن تھے اس کے شوہر کے، جوانی میں بڑھاپے کی چادر اوڑھادی بے چاری کو، اس کے متعلق سوچتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، ارے جانے یہ کون سے مسلمان ہیں، کلمہ گو ہیں اپنے جیسے بھائیوں کے جان و مال پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، دنیا سے لحاظ و مروت ختم ہو گیا ہے، قیامت کی نشانیاں ہیں سب۔“ اماں بی بی آہ بکا اس کا مزید دل دہلا

میں اس کا دم ہر وقت گھٹتا رہتا تھا، اب وہ دھڑلے سے اس کو بے نقط سنا تا گالیاں دیتا تھا اور اب تو مارنے بھی لگا تھا۔

”اب اگر تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں تیرا منہ توڑ دوں گی۔“ وہ دھاڑی تھی اور اس کے دھاڑنے نے شہباز کا غصہ سوا نیزے پر پہنچا دیا تھا، اس نے بے درپے جانے کتنے ہی پھٹراس کو دے مارے، اس کا غصہ کم نہ ہوا تو لاتوں کا بھی خوب استعمال کیا، وہ نیلونیل جسم لئے وہیں صحن میں پڑی سسکتی رہی، اور وہ غصے میں تن فن کرتا گھر سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کے کسی پہر وہ گھر میں داخل ہوا تھا، اس نے اس کا ٹوٹا بکھرا وجود آہستگی سے اٹھا کر پیٹنگ پر ڈالا اور ساری رات وہ اس کی پیٹی سے لگا اس کے زخموں پر مرہم لگانا رہا، وہ نیم بے ہوشی میں تکلیف سے کراہتی رہی اور اس کی ہر کڑاہ اس کی پشیمانی میں اضافہ کر رہی تھی۔

”میں اب ہر سے صحیح صحیح کر کے آتا ہوں، تو جانتی ہے رکشہ چلانے والے تو بارہ بارہ بجے گھر جاتے ہیں، میں تو پھر بھی تیری تنہائی کا سوچ کر ہی جلدی آجاتا ہوں، اگر گھر بیٹھا ہوں گا تو گھر کا خرچہ کیسے چلے گا، پر سے اماں کو الگ پیسے بھیجنے ہوتے ہیں، تو بجائے میری پریشانیاں سمجھنے کے مجھ سے الجھتی ہے۔“ وہ اس کے بال آہستگی سے سہلا رہا تھا اور ماریہ کو ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے چلتے اعصاب پر کوئی نرم آہستگی سے مرہم رکھ رہا ہو، آنکھوں کے کناروں سے گرم سیال مادہ سا بہ رہا تھا اور وہ بہت پیار سے اس ماہبے کو سمیٹ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تو افتخار کے ساتھ چلی جا، وہ بھی حاصل پور جا رہا ہے۔“ کچھ دنوں سے ماریہ اماں (ساس) سے ملنے کی ضد کر رہی تھی جبکہ شہباز کا شہر میں کام بڑھ گیا تھا، اس لئے اس نے اپنے بچاؤ اور افتخار کا نام لے لیا جس کو سنتے ہی وہ ہنسنے سے اکھڑ گئی تھی۔

دوپہر میں گھنٹوں کھڑا اس کا انتظار کیا کرتا تھا اور اب دن بدن بیزار سے بیزار تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی اور اپنا چھوٹا سا ایچی کیس کپڑوں سے بھرنے لگی۔

”چھوڑ کر آ مجھے اسٹیشن۔“ وہ اس کے قریب آ کر بولی جبکہ وہ بیڈ پر چت لیٹا ہوا تھا اور اپنا بازو آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔

”افتخار آ رہا ہے تجھے چھوڑ آئے گا۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

”میں اس کی نہیں تیری ذمہ داری ہوں تو مجھے چھوڑ کر آتو نے نکاح کیا ہے مجھ سے اس نے نہیں۔“ وہ اس کے قریب آ کر بولی اور ساتھ ہی اس کا بازو آنکھوں سے ہٹا دیا۔

”خود چلی جا میرا دماغ نہ کھا ورنہ تجھے پیٹ ڈالوں گا۔“ اس نے اگشت شہادت اٹھا کر وارننگ دی۔

”مجھے چھوڑ کر آ ورنہ میں اکیلی جا رہی ہوں۔“ وہ چلائی تھی۔

”زبان درازی کرتی ہے میرے ساتھ، تجھے تیری بھائیوں کے حوالے کر کے آتا ہوں، ان کی جھڑکیاں کھا کر تو ٹھیک رہتی تھی، میری ماں نے بہو کیا بنایا ہے تو مزاج دار بن گئی ہے، مجھ سے لڑتی ہے ذلیل عورت، زندگی اجیرن کر دی ہے تو نے میری، شام کو تمہا کا ہارا آتا ہوں بجائے اس کے کہ مجھ سے کھانا پوچھ لڑنا شروع کر دیتی ہے۔“

”تو بکواس کر پتا رہ میں اکیلی جا رہی ہوں۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھنے لگی تھی۔ معا شہباز نے پیچھے سے اس کی چوٹی کھینچی، ایچی کیس نیچے جا گرا تھا شہباز کا بھاری ہاتھ اس کے گال پر نشان بنا گیا تھا، اس کا دماغ ایک منٹ کے لئے سن ہو گیا تھا۔ کیا واقعی یہ وہی شہباز ہے جس کے لئے وہ اپنے بھائیوں کے سامنے ڈٹ گئی تھی، اس کے پیچھے اس نے ایک دنیا کو چھوڑ دیا تھا، اپنا گھر اپنے بھائی اپنے بھائی کی زمین سب کچھ چھوڑ کر وہ دوبارہ دارا اس کے ساتھ یہاں آگئی تھی، اس ایچی باجول میں، جس

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ، سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

دماغ سے نکال، کوئی باتیں نہیں بنانا، اماں کی اجازت سے میں تجھے اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں اور سب سے بڑی بات جب مجھے اعتراض نہیں تو اور کون بولے گا، اب مزید میرا دماغ نہ کھتا، جا کر تیاری کر۔ ماریہ نے شکوہ کناں نظروں سے اس کو دیکھا، وہ مزید اس سے الجھ کر اُس کے غصے کو ہوا نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اس کے سر کا سامنے تھا، جب اس کو کوئی اعتراض نہیں تھا تو وہ کون ہوتی تھی مین میخ نکالنے والی۔

اس نے اپنے کپڑے اچھی کیس میں ڈالے، کچھ سامان جو اس نے اپنی نند کے لئے خریدا تھا وہ بھی رکھ لیا اور اگلے ہی دن وہ افتخار کے ساتھ حاصل پور روانہ ہو گئی۔ افتخار نے راستے میں اس کا بہت خیال رکھا تھا، اس نے کرایہ دینا چاہا تو ڈبٹ کر بولا۔

”بھرجانی سے پیسے لینے سے پہلے مر نہ جاؤں میں، اپنے پاس رکھ۔ اور اس کے جواب کو سن کر ماریہ نے مزید بحث ترک کر دی، ہراسیشن پر جب گاڑی رکتی تو وہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ لے آتا اور اس کے لاکھ منع کرنے پر اس کو زور زبردستی کسانے کا کہتا۔ افتخار بہت شریف لڑکا تھا اس نے ایک بار بھی ماریہ پر ایسی ونسی نظر نہ ڈالی تھی، ماریہ کے سارے خدشات بھاپ بن کر اڑ گئے تھے، وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

”افتخار بھرا! آپ کب شادی کر رہے ہو، آپ تو شہباز سے بھی دو سال بڑے ہو، جبکہ ہماری شادی کو سال ہو گیا ہے، آپ تو شہباز سے بھی زیادہ کماتے ہو۔“ افتخار کے گھر کے افراد بھی مختصر تھے، صرف اس کا باپ اور دو بھائی افتخار کے علاوہ تھے، بڑا شادی شدہ تھا پھر افتخار تھا اور اس سے چھوٹا بلال تھا۔

”بس بھرجانی! قسمت کے کھیل ہیں سب، کوئی آپ کے منہ کا نوالہ چھین کر بادشاہ بن جاتا ہے اور کوئی سب کچھ گنوا کر لٹوا کر کنگمال ہو جاتا ہے، قسمت کسی کو سکندر بنا دیتی ہے تو کسی کو گدا۔ وہ شعر سنا ہے ناں ”سب کھید سقدراں دے، کوئی جنت گیا کوئی ہار گیا۔“ اس کی

”میں اس کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی، تیرے ساتھ جاؤں گی۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”وہ کوئی غیر تو نہیں ہے میرے بھائیوں جیسا ہے تجھے بھر جانی کہتا ہی نہیں سمجھتا بھی ہے۔ دیکھ ماریہ! میرے پاس وقت نہیں ہے، اماں کلثوم (بہن) کی شادی کر رہی ہے ہر روز فون کر کے نیا مطالبہ کرتی ہے، میں نے جنتے اور اتوار کو سامان لوڈ کر کے پہنچانا ہوتا ہے، میرے پاس ٹیم نہیں ہے یا پھر ایسا کر نہ جا۔“ اس نے اس کی ڈکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

”ٹھیک ہے میں نہیں جاؤں گی یہیں رہوں گی، جب تو فارغ ہو جائے گا بھی تیرے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ اڑیل بن سے بولی۔

”تجھے مصیبت کیا ہے آخر تو ایک ہی بار میں میری بات کیوں نہیں مان لیتی، افتخار کے ساتھ حاصل پور جانے میں آخر کیا برائی ہے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا تھا، اس کی آواز بلند اور سختی لئے ہوئے تھے، خوف کی تند و تیز لہروں نے ماریہ کے اعصاب سنسنا دیئے تھے۔ آخری بار کی مار نے اس کے سارے کس بل نکال دیئے تھے، کتنے ہی دن کی لگاتار نگور کے بعد وہ اٹھنے کے قابل ہوئی تھی اور اب مزید اس سے الجھ کر پٹنا نہیں چاہتی تھی اس لئے تری سے بولی۔

”تو جانتا ہے ناں افتخار بھرا کا رشتہ میرے لئے تیرے چاچے نے ڈالا تھا، میرے سب بھرا انھی تھے، بس میں اڑ گئی تھی اب اگر اس کے ساتھ میں جاؤں گی تو سب مجھ پر باتیں بنا میں گے، پچھلی بار تیرے کہنے پر وہ مجھے پیو کے گھر چھوڑنے گیا تھا اور پورے خاندان نے باتیں بنائی تھیں، قصے بنائے تھے، تجھے اچھا لگے گا کوئی تیری بیوی پر الزام لگائے۔“ اس نے رساں سے اس کو سمجھانا چاہا لیکن اس کی مت ہی نہ تھی، جلدیلا کر بولا۔

”دیکھ ماریہ! تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، تو اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتی ہے۔ افتخار یہاں ایک لڑکی کے ساتھ فٹ ہے، تیرا دماغ بہت چھوٹا ہے یہ خرافات اپنے

پہلے سے بھی زیادہ حیرانت ہو گزرتی ہے، کیا انہاں نے تیرا خیال نہیں رکھا؟“ وہ اس کو بازوؤں میں بھر کر بولا۔

”تیرے گھر والے سب اچھے ہیں سوائے تیرے۔“ وہ اس کی بانہوں کے چلتے میں پھڑپھڑائی تھی لیکن اس نے گرفت اور تنگ کر لی تھی۔

”میں بھی بہت اچھا ہوں، بس آنکھ اٹھا کر غور سے دیکھو کبھی یہ آنکھیں یہ چہرہ تجھے چاند کی طرح لگتا تھا، کیا اب نہیں لگتا؟“ اس کی دیکھی سرگوشی نے اس کا منہ لال بھجھوکا کر دیا تھا، شرم نے اس کا روم روم تر کر دیا تھا، اس نے شرم کرنا پنا منہ اس کے سینے میں چھپا دیا۔

”افتخار شادی کر رہا ہے۔“ رات کے کھانے کے بعد شہباز نے اس کو بتایا، اس کا دل ایک دم سے دھڑکا تھا چہرے کا رنگ سرخ پڑ گیا تھا۔

”افتخار گھنا ہے مجھے تو چاہیے نے بتایا ہے کتنا گلے ماہ شادی کر رہے ہیں، میں نے افتخار کو جتایا تو پھر پھڑکا ہے۔“

”اتنی جلدی، اگلے ماہ تو کلثوم کی بھی شادی ہے؟“ اس نے پھیلی آواز میں کہا۔

”پاں اب ہم دو شادیوں کی تیاریاں کیسے کریں گے؟ وہ تو کہہ رہا تھا کہ بھابی سے کوئیندرہ دن میں میری بری بناوے، میں نے کہا ذرا پان سی ہے میری بیوی، کس کس کے کام کرے گی، صرف میرے کام کر لے وہی کافی ہے۔“ وہ شرارت سے ہنسا تھا اور اس کی شرارت سمجھ کر وہ جھینپ گئی تھی۔

”لیکن پھر اس کے منتوں ترلوں پر میں نے حای بھری ہے۔“

”کیا... میں نہیں جاؤں گی اس کے ساتھ۔“ افتخار کی خود پر جمی نظریں اس کو شرمندہ کر دیا کرتی تھیں، وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم تصور کرتی تھی، اس لئے وہ فی الحال اس کے سامنے جانے سے کتراتے تھی۔

لیکن وہ یہ بات کیسے شہباز کو سمجھائی، وہ خود کو عقل کل سمجھتا تھا اور جانتا تھا سب اس کی مانیں اور انار داغ کم سے کم

باتیں ماریے کے سر کے اوپر سے گزرتی تھیں۔
”کہیں عشق و شوق کا روگ تو نہیں لگا بیٹھے۔“ اس نے مخول کیا اور اس کی خود پر تنی لہورنگ آنکھیں دیکھ کر وہ ایک لمحے کو شپٹا گئی، پھر بات تبدیل کرتے ہوئے بولی۔
”کتنی دیر ہے حاصل پورا آنے میں؟“

”بس منزل قریب ہے بھر جائی!“ وہ کہہ کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا اور اس کی شکست خوردگی و مایوسی پر وہ آنکھیں پھیلائے اس کو جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

اماں اور کلثوم اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں اور جب اس نے کلثوم کے لئے خریدے گئے کپڑے دکھائے تو دونوں ماں بیٹیاں اس کے صدقے واری جانے لگیں۔

اس کو یہاں آئے ہوئے پورا ہفتہ ہونے کو آیا تھا اور شہباز نے محض ایک دو بار فون کر کے اس سے سرسری بات کی تھی اور اس کے بعد تو جیسے نون کرنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس سے شکوہ کناں تھی شہباز کے لئے اس کے دل میں ہر گزرتے دن کے ساتھ کدورت بڑھتی جا رہی تھی۔

”کیا وہ بے زار ہو گیا ہے مجھ سے؟“ دل میں جانے کتنی بار اس طرح کے ہزاروں سو سے اس کے دل میں ڈیرہ جما کر بیٹھ گئے تھے اور وہ خود سے ابھنا شروع کر دیتی تھی۔

دو ہفتے گزارنے کے بعد وہ افتخار کے ساتھ کراچی واپس آ گئی تھی، حسب معمول شہباز گھر میں نہیں تھا، مایوسیوں نے اس کے ارد گرد ڈیرے جمائے تھے، شام کو شہباز آیا اور اس کو دیکھ کر خوشگوار لہجے میں بولا۔

”ارے تو کب آئی ہے، مجھے بتایا بھی نہیں تو نے۔“

”تجھے میری پرواہ ہے۔“ اس نے کینہ تو ز نظروں سے اس کو دیکھا۔

”کیا بات ہوئی ہے جیسے گئی تھی ویسے آئی ہے، بلکہ

شہباز اس کی وجہ سے تو نے مجھے ٹھکرایا تھا، تیرے پیر کی دھول کے برابر بھی نہیں ہے وہ تو کیا گئی اور اس کی مار کھا کھا کر کیا ہو گئی ہے، ہنستا ہے وہ تجھ پر کہ تو مجنوں بن چکی ہے اس کے پیچھے، تو اس کے پیر کی جوتی بن گئی ہے اور میں تجھے رانی بنا کر پیر پر بٹھانا چاہتا تھا، اور تو نے مجھے ٹھکرا دیا، بتا کس چیز کی کمی تھی مجھ میں۔ وہ جنونی لہجے میں بول رہا تھا جبکہ خوف کی تند و تیز لہروں نے ماریہ کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا دی تھی۔

”تو کیا بکواس کر رہا ہے، ہٹ راستے سے مجھے جانے دے۔“ اس نے افتخار کے پہلو سے نکل جانا چاہا لیکن اُس نے اس کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ”تو کہیں نہیں جائے گی، اس وقت تک جب تک میں نہیں چاہتا۔“ اُس نے کہہ کر دروازہ بند کر لیا، وہ چیخنا چاہتی تھی اس کو کوسنا چاہتی تھی لیکن اس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا، اس کی چیخیں آدھ زاریاں سب دم توڑ گئی تھیں، خود کو آزاد کرنے کی ساری توہمیں خود بخود سلب ہوتی گئیں۔

جینا ہی چھوڑ دیا تھا۔
”افتخار جا رہا ہے پرسوں حاصل پور تو اسی کے ساتھ چلی جا، اماں وہاں تیرا انتظار کر رہی ہے، وہاں جا کر تیاریاں کروا دے اماں کے ساتھ۔“

”میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی، سنا تو نے۔“ وہ پھراٹھی تھی جبکہ شہباز نے حیرت سے اس کو دیکھا، اتنے دنوں میں پہلی بار اس نے پھر سے اس لہجے میں بات کی تھی، ماریہ نے غصے میں شیشے کا گلاس دیوار پر دے مارا اور رونا شروع کر دیا، شہباز نے تیورا کر اس کو گھورا۔
”آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے جو تو یوں جنونی ہو گئی ہے۔“

”میں افتخار کے ساتھ نہیں جاؤں گی چاہے تو مجھ سے لڑے یا مجھے مارے، میں نہیں جاؤں گی۔“
”کیوں آخر کیا کیا ہے اس نے جو تو اس سے یوں خار کھا کر پیشی ہے، وہ علیحدہ شرمندہ شرمندہ بھڑ رہا ہے۔“
”وہ شرمندہ نہیں ہے وہ شرمندہ نہیں ہو سکتا، سنا تو نے اس جیسے لوگ اس لفظ کے مطلب نہیں جانتے۔“

☆.....☆.....☆
”پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے اس کو، ہر وقت کھوٹی رہتی ہے میں پکارتا ہوں تو ڈر جاتی ہے، کاٹنے لگتی ہے راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی ہے، مجھے تو سمجھ نہیں آتا اس کو ہو کیا گیا ہے آخر۔“ اس نے اماں سے کہا، وہ کافی دنوں بعد آئی تھیں اور ماریہ کی حالت دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔
”تو خیال رکھا کر اس کا، کسی کی نظر بد لگ گئی ہے، دیکھا نہیں تو نے آنکھوں میں کیسی وحشت سی اتر آئی ہے اس کے، کسی نے کچھ کروا نہ دیا ہو۔“

”اس نے کیا کیا ہے آخر؟“ اس کی پانٹ دار آواز کے جواب میں وہ زار و قطار روتے ہوئے وہیں بیٹھتی چلی گئی، اب وہ اس کو کیا بتانی کہ اس نے کیا کیا ہے، اس کی ہستی کا مان اس کے وجود کی سرخروئی سب چھین لیا تھا، سب کچھ اور اگلے ہی دن شہباز کے مارنے پینے پر وہی ماریہ افتخار کے ساتھ حاصل پور جا رہی تھی، افتخار نے آخری بار اس سے کہا تھا۔

”ارے نہیں اماں! کون کروا سکتا ہے اس شہر میں ہمارے علاوہ ایک کڑن ہے میرا بس۔“ اور افتخار کا نام سنتے ہی وہ پھر گئی تھی، اس نے پھر سے چیخیں مارنا شروع کر دی تھیں، اماں بی نے اس کو دم کیا ہوا پانی پلایا اور چلی گئیں۔

”دیکھ ماریہ! جو ہو اس کو بھول جا، اس بات کا ذکر تو نے شہباز سے کیا تو تو جانتی ہے وہ ایک منٹ نہیں لگائے گا تجھے اپنی زندگی سے نکالنے میں، تو کہاں جائے گی اگر اتنا بڑا جگر رکھتی ہے تو اس کو بتا دینا، میں تجھ سے نکاح کر لوں گا۔“ لیکن اس نے چپ سا دھ لی تھی، مہر یہ لب وہ پھرائی ہوئی آنکھوں سے گزرتے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆
ہفتے بعد اس کی منہ کی شادی کا ضلع چاہوا تھا، کلثوم

ناولٹ

رشتہ کی ڈور

شہر کی مشہور کالونی کے سادہ و عام طرز تعمیر کے
حال وقار ولا میں غم کی چار سالہ آندھی کے بعد
خوشیوں کے شادیاں بچ رہے تھے۔ وقار صاحب
کے دوسرے بیٹے ضرار اور پہلوٹھی کی بیٹی نمرین کی

Downloaded From
WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے لیے شاد رشتے آتے مگر کہیں بات نہ بن پاتی کوئی نہیں پسند نہ آتا تو کسی کو نمرین پسند نہ آتی۔ یوں بات رک جاتی۔ نمرین کی تیزی سے بڑھتی عمر انہیں پریشان کیے رکھتی۔ آخر تھک ہار کر انہوں نے مجبوراً ضرار کی پہلے شادی کر دی۔ زرینہ سلجھی ہوئی صلیح جوڑ کی تھی۔ سال گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ ضرار کے ہاں نہایت خوب صورت اور معصوم سے شیراز نے جنم لیا تھا۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ننھا شیراز بمشکل تین ماہ کا ہوا تھا کہ ضرار کا معمولی ایکسڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ گھر میں کہرام برپا ہو گیا۔ خوشیوں

شادیاں نہیں۔ گھر کو سادگی سے سجایا گیا تھا، گھر کو بھور دیکھ کر شادی والے گھر کا گمان ہوتا تھا اندر داخل ہونے پر ہلکی ہلکی گہما گہمی بھی نظر آتی تھی۔ فر دوس اور وقار کے چہروں پر خوشی اطمینان بن کر جھلک رہی تھی۔ ان کی پانچ اولادیں تھیں۔ نمرین سب سے بڑی تھی اور پھر چار بیٹے تھے۔ ضرار، ضرار، فاخر اور ذاکر۔ وہ بھی عام والدین کی طرح بیٹی کی جلد شادی کے خواہاں تھے مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود نمرین کا کہیں رشتہ نہ ہو سکا تھا۔

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

انجو کیفٹ اور بہترین انم والا دامہ چاہیے تھا جو انہیں بالآخر ضرار کی صورت مل گیا تھا۔ انہوں نے بخوشی دوہرے رشتے پر حامی بھر لی تھی۔ وردہ کی عمر بھی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی اور وہ ہنوز کنواری تھی۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں دو دو یا تین تین بچوں کی مائیں تھیں۔ انہوں نے بیوی کو راضی کر لیا تھا اور یوں یہ رشتہ طے پایا تھا۔

☆.....☆

”اوہ سوری بھائی۔“ ویسے کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ضرار کی اس کے دوست کے ہاں دعوت تھی۔ وہ تک سب سے تیار ماں کو بتانے کے لیے آگیا۔ ذاکر چائے کے خالی کپ اٹھائے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ دونوں کا ٹکراؤ ہوا تو منتحماً بقیہ چائے اس کے کپڑوں پر نقش و نگار بنا گئی۔ ذاکر تادم ہو کر سائیڈ پر ہو گیا۔ ضرار کو دیر ہو رہی تھی۔ ان کی نعمان کے ہاں دعوت اٹھ بچے تھی اور انہیں وہاں پہنچتے پہنچتے آدھ گھنٹہ لگ جانا تھا۔ وہ پہلے ہی لیٹ تھے اور اب مزید دیر لازمی تھی۔

”تم دیکھ کر نہیں جاسکتے تھے میں تمہیں کب سے کہہ رہی تھی کہ خالی کپ اٹھاؤ۔“ فردوس غصے سے بیٹے پر برس پڑیں انہیں ذاکر پر شدید غصہ آیا تھا۔ اس کی وجہ سے ضرار کی تیاری غارت گئی تھی۔ ذاکر ماں کے ساتھ چائے پی کر باتوں میں ایسا لگن ہوا کہ ان کے بارہا کہنے پر بھی اٹھ کر نہ دیا تھا اور اب باقی ماندہ چائے ٹکراؤ کی صورت ضرار کے کپڑوں کو خراب کر گئی تھی۔ ذاکر کی ندامت ماں کی ڈانٹ نے بڑھا دی تھی۔

”اٹس او کے ای! میں چیخ کر لیتا ہوں۔“ فرار نے برا مانے بغیر نری سے ماں کا غصہ اور بھائی کا کندھا دبا کر اس کی ندامت کم کرنا چاہی تھی۔ وہ شرٹ کے بٹن کھولتا پلٹ گیا۔ ذاکر نے چکن کی راہ لئے ہیں عافیت جانی۔ فردوس بیگم کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہ

کی جگہ سسکیاں گونجنے لگیں۔ فردوس اور وقار کو نمرین کی ہی فکر کھائے جانی تھی کہ اب ان پر دوہری افتاد آن پڑی تھی۔ زرینہ عدت پوری ہوتے ہی شیراز کے ہمراہ میسے گئی تو لوٹ کر نہ آئی۔ وقار صاحب نے زرینہ کا رشتہ چھوٹے ذاکر کے لیے مانگا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ دراصل ان کی نظر ضرار پر تھی۔ وہ ڈاکٹر تھا اور پرائیویٹ اسپتال میں جاب کرتا تھا۔ وہ شام کو اپنا کلینک بھی چلاتا تھا۔ وقار صاحب بدلتے حالات کے تناظر میں نمرین اور ضرار کا دہرا رشتہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ نمرین کا چھوٹی پھپھو نے برسوں پہلے رشتہ مانگا تھا وقار نے انکار کر دیا تھا۔ یوں زرینہ لوٹ کر نہ آئی تھی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ان کا صاف انکار وقار اور فردوس پر پوتے کی چاہت کا دباؤ بڑھا دے گا اور وہ مان جائیں گے مگر وقار صاحب مجبور و بے بس تھے، نمرین کی تیزی سے بڑھتی عمر انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر رہی تھی۔ ناخر کا کلا خراب تھا اس کے بولنے میں پیدا ہی نقص تھا۔ اسی لیے انہوں نے چھوٹے بیٹے کا رشتہ ڈالا تھا وہ بھی بیٹی دالے تھے اور دوسروں کی بیٹیوں کے مسائل اور ان کی مجبوریوں کا ادراک رکھتے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا بیٹی والا ان کی وجہ سے پریشان ہو مگر زرینہ کے گھر والوں نے کوئی احساس و خیال نہ کیا اور وہ اپنے زعم میں رہے مجبوراً وقار صاحب کو انکار کرنا پڑا تھا۔

گھر میں ویرانی اور اداسی نے ڈیرے ڈال دیے تھے جو چار سال بعد دور ہوئے تھے۔ نمرین وداع ہو کر سرال چلی گئی اور وردہ بیاہ کر گھر آ گئی۔

☆.....☆

اسلم صاحب کی فیملی بظاہر ایجوکیٹڈ، ویل آف اور سلجھی ہوئی لگتی تھی۔ ان کے تمام بچے پڑھے لکھے اور برسر روزگار تھے۔ گھر میں خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ وقار صاحب ان کے ملنے جلنے والوں میں سے تھے، اسلم بھی بیٹی کے لیے پریشان تھے، انہیں کوئی ہانی

سوئیاں آٹھ بج رہی تھیں انہیں اس وقت نعمان کے ہاں ہونا چاہیے تھا جب کہ وہ معمولی بات کو بلاوجہ طول دینے جا رہی تھی۔

”چلیں۔“ وردہ تیار ہی تھی اس نے شرٹ غصے سے پختی اور باہر نکل گئی اور سارے راستے اس کا موڈ خراب رہا۔ صد شکر کہ ان کے ہاں پہنچ کر اس کا موڈ کافی بہتر ہو گیا تھا۔ ضرار اطمینان و تشکر بھری طویل سانس خارج کرتا نعمان سے ملنے لگا۔

☆.....☆

وہ کمرے میں بری کے دونوں جہازی ساز اٹیچی کیس کھولے اپنی بری کے سوٹ الگ الگ کر رہی تھی۔ اسے جو سوٹ پسند آ رہے تھے وہ انہیں اپنے قریب ترتیب سے رکھ رہی تھی اور جو نا پسند آ رہے تھے وہ انہیں اتنی بے دردی سے بیڈ پر پھینک رہی تھی کہ وہ بند پیکٹ میں سے نکل کر بیڈ پر بھر رہے تھے۔

”ارے۔“ ضرار کمرے میں آیا تو کمرے میں بکھراوا پھیلا دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اپنے کام میں مگن وردہ نے چونک کر اچھتی نگاہ شوہر پر ڈالی اور دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو گئی تھی۔ ضرار بیڈ پر پھیلے بکھراوے میں اپنے لیے جگہ بنا کر بیٹھ گیا اور خاموشی سے اس کی سرگرمی نوٹ کرنے لگا۔ وہ اس سے دو روز خفا رہا تھا لیکن وردہ نے شوہر کی خفگی کی رتی بھر پرواہ نہ کی تھی۔ آخر اسے ہی نمرین کی خاطر ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ وہ اپنے گھر خوش و خرم تھی۔ ضرار نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے نمرین کی ازدواجی زندگی ڈسٹرب ہو۔ اس کے لب دھیرے سے بڑ بڑائے اس کی بڑ بڑاہٹ وردہ کے کانوں تک نہ پہنچ سکی تھی۔

”یہ سوٹ آپ آنٹی کو واپس کر دیں۔ مجھے بالکل پسند نہیں آئے ہیں۔ یہ اولڈ فیشن ہیں۔ بھلا آج کل کون اتنے بھاری بھر کم سوٹ پہنتا ہے۔“

فردوس نے بے حد امانتوں سے بری کے سوٹ

☆.....☆

”ارے کیا ہوا؟“ ضرار نے کمرے میں داخل ہوتے ہی شرٹ اتار کر صوفے پر رکھی اور وارڈروب سے نئی شرٹ نکالنے لگا تھا۔ وردہ اس کی پشت پر کھڑی صوفے پر رکھی شرٹ اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پھیلائے بغور جائزہ لے رہی تھی وہ جو مکی پلٹا وردہ نے قدرے خفگی و تحیر سے استفسار کیا تھا۔

”ذاکر سے چائے گر گئی۔“ ضرار مختصر جواب دے کر بجلت واش روم میں گھس گیا۔ دس منٹ بعد فریش و تیار ہو کر لوٹا تو وردہ ہنوز منہ پھلائے شرٹ کے ماتم میں غرق تھی۔ یہ شرٹ وردہ نے بے حد چاؤ سے اس کے لیے سلوائی تھی اور اس کا کلر بھی فرار پر بے حد سوٹ کر رہا تھا۔ وردہ کا نازک دل ٹوٹ گیا تھا وہ خاصی افسردہ تھی۔

”وردہ۔“ ضرار نے قریب آ کر نرمی سے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

”اسے نظر نہیں آیا تھا کیا وہ اندھا تھا۔“ وردہ منہ پھٹ و خود پسند تھی۔ ”بہرحال غلطی سے پھٹ پڑی اس کا صدمہ کم ہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ ضرار ہر بار بکا رہ گیا۔ حقیقتاً دو دن کی بیانی لڑکی کی بدزبانی نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔

”وردہ! اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا ہے بس اچانک.....“ ضرار، بھائی کی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا حالانکہ اس سے بیوی کا تہ خوب و لہجہ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

”کیا اچانک ہاں اس کی آنکھیں بند تو نہ تھیں۔ اس نے اتنی جیتی شرٹ خراب کر دی۔“ وردہ کا شاک کم ہی نہ ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سننے اور سمجھنے پر قطعاً آمادہ نہ تھی۔

”کم آن وردہ! کہا ہو گیا ہے تمہیں۔“ ضرار کو بھی اس کی بدچالگی اور فضول غصے پر بناؤ آ گیا۔ کھڑکی کی

اسے شوہر کی رتی بھر پرواہ نہ تھی اس نے شروع دن سے حقیقتاً شوہر کو جوتے کی نوک پر رکھا تھا۔ وہ وہ سٹہ کا نا جائز فائدہ اٹھا رہی تھی۔ جہاں ضرار احتجاج کرنے لگتا وہیں زمین کی شامت بیٹنی تھی۔ ضرار بری طرح پھنسا تھا۔

☆.....☆

کمرے میں موت کا سانسنا تھا۔ فردوس کی دبی سسکیاں خاموشی کو چیر رہی تھیں۔ وردہ کی بری کے سوٹ سینٹرل نیبل پر دھرے تھے۔ چونکہ شادی چٹ مٹکنی پٹ بیاہ کے مصداق ہوئی تھی۔ انہیں تیاری کا زیادہ ٹائم نہ مل سکا تھا۔ انہوں نے نمبرین کے لیے اکیس اور وردہ کے لیے پچیس سوٹ اور جنٹ آرڈر پر بنوائے تھے وردہ نے صرف آٹھ سوٹ رکھے تھے۔

”بس کرو فردوس! تم کیوں خود کو ہلکان کیے جا رہی ہو۔ ان کی مسلسل کوہنجی سسکیاں بچوں اور وقار کو پریشان کر رہی تھیں۔ وردہ کان لپیٹے اپنے کمرے میں پیٹھی ڈھٹائی سے میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی اس کا سارا دھیان اٹھ رہا تھا مگر اسے کوئی سن گن نہ مل رہی تھی۔ ماحول خاصا گھمبیر تھا۔ ضرار، فاخر اور ذاکر ملول چہرے لیے بے بسی سے ماں کو نگے جا رہے تھے۔ وقار نے ماحول پر جھایا تاؤ کم کرنا چاہا تھا۔

”کیا میں بیٹوں کی بریاں واپس لینے کے لیے رہ گئی ہوں، ارے اسے یہ نہیں پہننا تھے تو نہ پہنتی، کسی ملازمہ یا ضرورت مند کو دے دیتی مگر یوں یہ سوٹ تو نہ لوٹاتی۔“ فردوس کا غم ہلکا ہی نہ ہو رہا تھا۔ ماحول مزید گھمبیر ہو گیا تھا۔

”فردوس! دیکھو بچے کتنا پریشان ہیں۔“ وقار نے فردوس کو احساس دلانا چاہا تھا وہ خود بھی بے حد رنجیدہ تھے۔ ”ای! میں اس کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔“ ضرار نے ماں کے گرد بازو حائل کر دیئے تھے۔ ضرار نے حد شر مندو تھا۔ وردہ نے اسے اس کے اپنے گھر

”واٹ.....؟“ ضرار کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وردہ کا ہر نیارنگ اس کے لیے حیران کن تھا۔ اس نے کہیں نہ دیکھا نہ سنا تھا کہ ذہن اپنی بری واپس کر دے۔

”اٹس امپاسیبل۔ تم یہ سوٹ رکھو، امی نے تمہارے لیے اتنے ارمانوں سے بنوائے ہیں۔“ ضرار نے نری سے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ فردوس، زرینہ کی بری واپس آنے پر دونوں روٹی رہی تھیں۔ ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ گھر کا ماحول الگ سوگوار رہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر والے اسی کرب سے دوبارہ گزریں۔ ضرار نے قطعیت سے انکار کر دیا تھا۔ اسے ای کے کرب کا سوچ کر ہول اٹھنے لگے تھے۔

وہ بے رحمی دستکدلی کی انتہا پر تھی۔ اس کا لہجہ بے لچک اور ٹھوس تھا۔ وہ جھکنے والوں میں سے نہ تھی۔

”وردہ! تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ضرار لاجاری کی انتہا پر تھا۔ وہ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی ان سے کوئی لڑائی نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ یہ کوئی بھولی بات نہ تھی۔

”اگر نمبرین تم لوگوں کی بری واپس کرتی تو تمہیں کیسا لگتا؟“ ضرار کو خطبے کے باوجود شدید تاؤ آئے جا رہا تھا۔ اس نے اسے سمجھانے کے لیے نکتہ اٹھایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی بات سن کر اس کا حکم مان لے گی مگر وہ بھی اسے نام کی ایک تھی اس نے شوہر کی کسی خواہش یا مرضی کو ماننا سیکھا ہی نہ تھا بلکہ وہ تو ضرار کو اپنی مرضی اور خواہش پر چلانا چاہتی تھی۔

”ہونہہ..... ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا ہماری بری ایسی نہیں تھی کہ کوئی انہیں واپس کرنے کا سوچ بھی سکتا۔“ وردہ نے تفاخر بھرا ہنکارا بھرتے ہوئے اس کی دلیل کو چٹکیوں میں اڑا دیا۔ اس کا لہجہ دانداز غرور ناز سے پُر تھا۔ ضرار نے بے بسی سے اپنا سر بیکھ لیا اور وہ لاپرواہی سے بکھرے سوٹ تمہ کرنے لگی اس کے چہرے پر

بچھ رہے تھے وہ نمرین کو کچھ نہ بتاتے۔ مبادا وہ پریشان ہو یا پھر وہ گھر میں کوئی بات کرے تو معاملہ بگڑ جائے ضرار سہاؤ سے معاملہ چلانا چاہتا تھا مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ جوں جوں ورودہ کھل کر سامنے آ رہی تھی وہ ضرار کی برداشت و ضبط کا امتحان بنتی جا رہی تھی۔

”میری ایک بات کان کھول کر سن لو، میں یہ رنگ نہیں واپس نہیں کروں گا اور نہ ہی یہ چین واپس لوں گا۔“ وہ ورودہ کے رنگ پہچاننے لگا تھا۔ وہ ورودہ کی چین گھماتی انگلیاں دیکھ چکا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رنگ کے بعد چین کا ذکر کرے گی اس نے قطعیت بھرے ٹھوس بے چلک لہجے میں اسے انگلی اٹھا کر باور کروایا۔

”تو واپس کون کر رہا ہے یہ دونوں چیزیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ان دونوں کو سلامی کے پیسوں کے ساتھ ملا کر دو تولے کالا کٹ سیٹ بنالوں۔ آپ نے بری کا زیور جہاں سے بنوایا ہے مجھے وہاں لے چلیے گا یا پھر ڈیزائن کی کاپی گھر لے آئیے گا۔ میں ڈیزائن سلیکٹ کر لوں گی۔“ سہجائے وہ کیا شے تھی۔ وہ شوہر کے غصے و ناراضی سے رتی بھر مرعوب ہوئے بغیر رعوت تحکم بھرے لہجے میں بولی تھی۔ ضرار کھونچکارہ گیا۔ اس کا اندازہ غلط نہ تھا۔ وہ ورودہ کی ذہنیاتی پر جتنا حیران ہوتا، اتنا کم تھا اس کی شادی کو مہینہ بھر ہونے کو تھا اور وہ ابھی سے میاں پر رعب و حکم چلانے لگی تھی اس نے اپنی شادی کے اولین دنوں کی سحر انگیزی کا بھی خیال نہ کیا تھا۔ ان کی چند روز میں دوبار لڑائی ہو چکی تھی اور دونوں بار ضرار کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ اس نے نہ تو ہار مانی تھی اور نہ ہی شوہر کو منانے کی کوشش کی تھی۔

”پھر آپ کب لارہے ہیں کاپی؟“ اسے احساس ہو گیا تھا کہ ضرار شکاٹڈ ہے۔ ضرار کے لبوں پر جامد سناٹا تھا جسے اس نے جھکیوں میں اڑا دیا تھا۔ ضرار

والوں کے سامنے نظریں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔
”تو کیوں معافی مانگتا ہے پانگلے۔ بھلا اس میں تیرا کیا تصور۔“ فردوس نے تڑپ کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ ورودہ کا شاہانہ اور خو و پسندانہ مزاج بخوبی سمجھ گئی تھیں۔ فردوس نے ضرار کا پر ملال چہرہ محبت سے چوم لیا۔

☆.....☆

”ضرار! یہ رنگ کس نے پسند کی تھی؟“ دونوں کے درمیان کچھ دنوں سے کھنچاؤ چلا آ رہا تھا جب کہ دوسری طرف نمرین بالکل خوش باش تھی، یہ بھی ورودہ کے گھر والوں کی چال تھی۔ وہ نمرین کو خوش رکھ کر بدلے میں ورودہ کی خوشیاں کیش کر وارہے تھے اگر کہیں ضرار ورا سا بھی الجھتا یا احتجاج کرتا تو نتیجتاً نمرین کو واپس بھیج دیا جاتا۔ ضرار اور اس کے گھر والے ورودہ اور اس کی فیملی کی بددلتی اور بدفطرت بخوبی بھانپ گئے تھے۔ ضرار لیب ٹاپ پر آفس ورک میں بزی تھا۔ ورودہ نے منہ دکھائی میں وی گولڈ رنگ انٹن میں گول گول گھمائی۔

”اے نے۔“ دونوں میں کھنچاؤ میں کمی ضرار کی نری سے آئی تھی۔ فردوس نے اس کے لیے ہاتھ کی نازک گولڈ رنگ اور ضرار نے اسے اپنی طرف سے گولڈ کالا کٹ دیا تھا۔ اس نے سر اٹھائے بغیر مختصر جواب دیا۔

”لگتا ہے آئی کو آج کل کے فیشن کا نہیں پتا ہے۔ اب یہ ڈیزائن کون پہنتا ہے۔“ ورودہ نے سفاکانہ تبصرہ کیا اسے کسی کے جذبات کی رتی بھر پرواہ نہ تھی۔ اسے صرف اپنا آپ پیارا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے ذریعے نمرین کا جینا محال کر دیتی۔ اس کے میکے میں ماں کی چلتی تھی اور اس کا پھائی ماں کی مٹھی میں تھا اور وہ ماں کی بے حد لاڈلی تھی۔ ماں بیٹی کی خاطر کچھ بھی کر سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ بیٹے کا گھر بھی اجاڑ سکتی تھی۔ ضرار اور اس کے گھر والے بخوبی حالات

”تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے بات کرنے کی۔“ فردوس ساری بات سن چکی تھیں وہ ڈاکر پر الٹ بیٹیں۔ وہ بہو کے بگڑے تیور اور ماتھے کے بل دیکھ چکی تھیں۔ وہ گھر میں بدمزگی نہ چاہتی تھیں وہ اس کا مزاج پہچاننے لگی تھیں۔ وہ یقیناً اب فرار کے کان بھرے گی۔ انہیں نمرین کا خیال ہر اسماں کرنے لگا تھا۔

”امی! اتنا کچھ گھر میں ہو رہا ہے آپ ڈرنا چھوڑ دیں پلیز۔“ ڈاکر کو ماں کی تشویش بری لگی تھی۔ گھر والوں سے وردہ کی منہ دکھائی چینیج کر دانا مخنی نہ رہا تھا اور سبھی کو شدید قلق پہنچا تھا۔ ڈاکر تو غصے سے بھر کر بھالی کو کھری کھری سنانا چاہتا تھا۔ اسے فردوس نے بمشکل سمجھا بھجا کر ٹھنڈا کیا تھا۔ فردوس کا دل مستقبل کے تصور سے ہولتا رہتا تھا۔ ان کے دل میں انجانا سا ڈر بیٹھ گیا تھا۔ وہ آئندہ صورت حال کے لیے خود کو تیار کرنے لگیں۔ ڈاکر لا پرواہی سے ان کے قریب بیٹھ کر پانی پینے لگا تھا۔

☆.....☆

”آپی! آپ شادی کی پکس نہیں لائیں؟“ نرین شادی کے بعد دوبار سے آئی تھی۔ وہ صبح آ کر شام کو لوٹ جاتی تھی۔ وہ پہلی بار ہفتہ میکے میں رہنے آئی تھی۔ سب ہال روم میں جمع تھے گھر والوں نے ابھی تک نمرین کے دیسے کی پکس نہ دیکھی تھیں۔ ڈاکر نے گلہ کرتے ہوئے صوفے پر رکھا کشن اپنی کہنی کے نیچے دبایا تھا۔

”اوہ..... مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ تم وردہ کے موبائل سے دیکھ لو۔“ نمرین پچھلی بار آئی تھی تو اسے ڈاکر نے بطور خاص تاکید کی تھی پکس لانے کی۔ وہ اپنی ازلی لا پرواہی میں پھر بھول آئی تھی۔ اس سے بھالی کا خفا خفا ساموڈ نہ سہا گیا تو اسے مشورہ دے ڈالا۔

”یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا میں ابھی بھالی سے

برسی کی انتہا پر تھا اس کے پاس وردہ کی بات ماننے کے علاوہ کوئی آپشن نہ تھا۔ اسے مہینہ بھر میں وڈ سٹدی شادی پر تشویش ہونے لگی تھی۔ فردوس اور وقار کا خیال تھا کہ وہ بہو کو خوش رکھیں گے تو ان کی بیٹی بھی خوش رہے گی۔ اسی لیے وہ نرین سے کام لیے جا رہے تھے۔ ضرار بھی بہن کی خاطر نرین سے کام لیے جا رہا تھا اور یہی بات وردہ کو شہ دیئے ہوئے تھی اور پھر اسی شام ضرار نے ڈیزائن کی کاپی لا کر اسے تھما دی تھی۔ وردہ کے چہرے پر ہلکی سی بھی خفت یا سراسیمگی کا عکس نہ ابھرا تھا وہ سرشاری سے کاپی تھام کر ڈیزائن دیکھنے لگی تھی۔

ڈاکر مشین سے سرف کی جھاگ ابل ابل کر رہا ہر آ رہی تھی۔ جھاگ سے فرش پر پھسلن ہوئی جا رہی تھی اور کسی کو پرواہی نہ تھی۔

”انتاز زیادہ سرف۔“ ضرار اور ڈاکر کسی کام سے گھراوٹے تو ڈاکر نے نظر پڑتے ہی بے اختیار کہا۔ فردوس کو شوگر تھی، جھاگ سے ان کے پاؤں میں زخم بن جاتے تھے۔ وہ مشین لگاتیں تو ہر بار ان کے پاؤں کے زخم ٹھیک ہونے میں وقت لیتے تھے۔ انہوں نے بھی نمرین کو مشین نہ لگانے دی تھی اور ابھی وردہ سے گھر کے کام بھی نہ شروع کروائے تھے۔ ڈاکر کو ماں کی فکر ہوئی تو تیزی سے آگے بڑھا۔

”بھالی! آپ سرف کم ڈال لیتیں یہ پھسلن کر رہا ہے۔“ ڈاکر بولے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ وردہ کے وجود میں ناگواری کی شدید لہر ابھری مگر وہ خاموش رہی۔ اس نے ڈاکر پر نگاہ غلط تک ڈالنا نہ گوارا کیا تھا۔ وہ شادی کے بعد پہلی بار کوئی کام کر رہی تھی۔

”امی کو شوگر ہے جھاگ ان کے پیروں کو زخمی کرتا ہے۔ میں اسی لیے کہہ رہا تھا آپ تھوڑے کپڑے دھو رہی تھیں تو سرف بھی اتنا ہی ڈالیں۔“ ڈاکر اپنی بات کی وضاحت کر کے پلٹ گیا۔ وردہ خاموش رہی، اس کی مسلسل خاموشی اس کی ناگواری ظاہر کر رہی تھی۔

دوسرے سے نظریں جزار ہے تھے۔ وہ اس سے کچھ چھپا رہے تھے اسے یہی بات زیادہ پریشان کر رہی تھی۔

”ضرار کیا بات ہے؟“ اسے یقین ہو گیا تھا کہ امی ابو اسے کچھ نہ بتائیں گے۔ اسی لیے اس نے ڈائریکٹ ضرار سے استفسار کیا جس کے چہرے پر خفت واضح تھی۔ ضرار چپ تھا اور وہ جواب کی منتظر۔

”میرا موبائل کون لایا ہے ادھر؟“ اسی اثناء میں وردہ کی کال آئی۔ وہ واش روم سے آتے ہی موبائل ڈھونڈ رہی تھی۔ دراصل وہ چھوٹی بہن سے چبٹ کر رہی تھی۔ وہ نیل سن کر تیزی سے آتے ہی خفگی بھرے غصے سے قدرے اونچا بولی تھی۔ سب کی نظریں اس پر جم گئیں جب کہ اس کی متلاشی نظریں موبائل کی کھوج میں تھیں۔

”آپ کم از کم تاکر ہی لے آتے، میں کب سے ڈھونڈ رہی تھی۔“ جوں ہی اس کی نظر ضرار کے ہاتھ میں موجود موبائل پر پڑی اس نے جھپٹنے کے انداز میں موبائل اٹھایا اور یہ جا وہ جا۔ نمرین کو شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا تھا۔ ذاکر کو موبائل لائے ابھی پانچ چھ منٹس بمشکل گزرے ہوں گے اور اس نے ”کب سے“ بول کر کہا تھا، جیسے وہ گھنہ بھر سے ڈھونڈ رہی ہو۔ یہ بھی مقام شکر تھا کہ موبائل ضرار کے ہاتھ میں تھا اگر ذاکر کے پاس ہوتا تو اس کا لہجہ یقیناً درشت و رکھائی بھرا ہوتا۔ کمرے میں جا دسنا ٹا پھیل گیا اور نمرین صورت حال سمجھنے میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

☆.....☆

”امی پلیز! مجھے ساری بات بتائیں، وردہ آپ لوگوں کے ساتھ صحیح تو رہتی ہے نا؟“ اگلے روز صبح مردوں کے کام پر جاتے ہی نمرین نے ماں کو گھیر لیا تھا۔ فردوس نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لینا چاہا مگر آخر کار تکتا۔ انہیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور

موبائل لاتا ہوں۔“ ذاکر بچوں کی ایسی معصومیت جبری خوشی سے کہتا اٹھ گیا۔

”یہ تم کس کا موبائل اٹھا لائے ہو۔“ وہ وردہ کے روم میں گیا تو وہ واش روم میں تھی وہ چند ثانیے انتظار کرتا رہا پھر اس کے نہ آنے پر خود ہی موبائل اٹھا لیا تھا۔ وہ موبائل پر پکس دیکھ رہا تھا کہ فردوس کا دھیان اس کی طرف گیا۔ وہ وردہ کا موبائل پہچان گئی تھیں۔ انہوں نے خفگی سے ذاکر کو جھڑکا تھا۔ فردوس وردہ کے مزاج سے خائف رہتی تھیں۔ انہیں پھر کسی سنگینی کا احساس ستایا تو انہوں نے فوراً بیٹے کو گھر ک دیا تھا۔

”امی! کیا ہو گیا ہے۔ اسے دیکھنے دیں خیر ہے۔“ ضرار بیوی کی وجہ سے گھر والوں میں بیٹھتے خفت محسوس کرتا تھا۔ اسی لیے گھر میں کوئی بھی اس کے سامنے کوئی کسی بات کا ذکر نہ کرتا تا کہ وہ شرمندگی اور ٹینشن سے بچا رہے۔ ضرار نے فوراً بھائی کی سائیڈ لی۔

”ضرار بیٹا! صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے وردہ کا مزاج خائف رکھتا ہے۔ میں مزید کوئی ٹینشن گھر میں نہیں چاہتی ہوں۔“ فردوس نے بیٹے سے موبائل چھین کر ضرار کو تھمایا۔ ذاکر اپنی جگہ خفا بیٹھا رہا۔ اس نے ناراضی سے منہ پھلا کر رخ پھیر لیا۔

”خیریت! گھر میں کون سی ٹینشن چل رہی ہے۔“ نمرین حق دق رہ گئی۔ ماں کی بات نے اسے شدید پریشان کر دیا تھا وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی تھی۔ اسے گھر والوں نے کبھی کبھی نہ بتایا تھا تا کہ وہ اپنی نئی ازدواجی زندگی میں خوش و خرم رہے۔

”بیٹا! تمہاری ماں کی عادت ہے۔ یہ غصے میں بناء سوچے سمجھے بول جاتی ہے۔“ وقار نے بیوی کو آنکھوں سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بیٹی کو تسلی دی فردوس چپ کر گئیں۔

”آپ سب مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“ نمرین نے بالکل یقین نہ کیا۔ سب غصے آبل

”ای امی! اسی لمحے پھپھو زاد اوبھین نے ماں کو آواز لگائی تو وہ اٹھ کر چلی گئیں۔“

”آئی! مجھے برقع نہیں اتارنا ہے۔ پلیز آپ مجھے اب دوبارہ نہ کہیے گا۔“ وردہ اپنی مخصوص ہٹ دھرمی اور بدتمیزی سے پھپھو کے جاتے ہی رخ موڑ کر بولی۔ فردوس اپنا سامنہ لے کر رہ گئیں چاروں نفوس کو سانپ سونگھ گیا۔ ذاکر کے سر پر لگی اور پاؤں پر بچھی۔ نمرین الگ متحیر حق وق تھی۔ اس نے ماں کی زبانی وردہ کی بدتمیزیوں اور ہٹ دھرمی کے قصے سنے ضرور تھے مگر اس کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا۔

”وردہ! امی اور پھپھو تمہارا خیال کر کے کہہ رہی ہیں اگر تمہیں گرمی میں سڑنے کا شوق ہے تو دست اتارو۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوگا۔“ نمرین نے سرنی سے بنا گوارمی جھلکتے لہجے میں اسے ٹوک کر احساس دلانا چاہا تھا کہ یہ ان کا گھر نہیں ہے۔ وہ کسی اور کے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔

”میری عادت نہیں ہے کہیں جا کر گاؤں اتارنے کی۔“ وردہ نے بھی جواباً نرمی مگر ناگوارمی سے جواب دیا تھا۔ نمرین نے خاموشی میں بہتری جانی۔ اسی اثناء میں پھپھو کو لڈ ڈرنگس لے کر آئیں۔ گرم و تلخ ماحول نے یکدم گرمی بڑھا دی تھی۔

☆.....☆

”بھائی! آپ بھابھی سے پوچھیں کہ آخر انہیں مسئلہ کیا ہے۔“ نمرین کو انہوں نے واپسی پر اس کے سرال ڈراپ کر دیا تھا۔ ان کی واپسی قدرے تاخیر سے ہوئی تھی۔ ابو اور ضرار گھر آ چکے تھے۔ ذاکر نے آتے ہی ساری بات بھائی کو بتا دی تھی اس کا غم کم ہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ اسے زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ وردہ نے امی سے بدتمیزی کی تھی اور وہ بھی گھر سے باہر۔ یوں تو بات خاندان میں پھیل سکتی تھی اور اس سے وردہ اور ان کی بدنامی ہو سکتی تھی۔

”ذاکر! تم چپ کرو۔ تم بھی کچھ نہ کہنا کل میں خود

انہوں نے سب کچھ بیٹی کے سامنے اگل دیا۔ وہ تو اسے پریشانی سے بچانے کے لیے سب کچھ چھپا رہی تھیں مگر وہ چھپانے سے زیادہ پریشان ہو رہی تھی۔

”امی! اتنا سب کچھ ہو گیا اور مجھے کسی نے بتانا تک ضروری نہ سمجھا۔“ نمرین کی آواز دکھ کی انتہا سے پھٹ گئی تھی۔ اسے بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ سرال میں اس کی ساس کا سکہ چلتا تھا اور اس کی ساس کو اپنی دونوں بیٹیاں بے حد پیاری تھیں۔ اپنے بیٹوں سے بھی بڑھ کر انہیں بیٹے صرف کمائی کی حد تک عزیز تھے۔ اس کے حسین کھڑے پر فکر کا جال پھیلا تھا۔

”اللہ بہتر کرے گا بیٹا۔“ فردوس نے محبت سے بیٹی کا ہاتھ چوم کر اسے تسلی دی تھی۔ نمرین ماں کی آغوش میں ساکنی۔ ماں کی محبت بھری آغوش میں ساکر وقتی طور پر اس کی پریشانی کم ہو گئی۔

☆.....☆

”وردہ بیٹا! تم گاؤں اتار لو، گرمی بہت ہے۔“ اس روز نمرین کا دل چھوٹی پھپھو سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ حالہ اور پھپھو اس سے عمر میں آٹھ سال بڑی تھیں۔ دونوں میں خاصی بے تکلفی بھری دوستی تھی۔ پھپھو نے اس کے میکے آنے کا ساتھ خصوصی طور پر اس کی دعوت کر ڈالی تھی۔ وقار اور ضرار کو آفس میں ضروری کام تھا۔ وہ دونوں نہ جاسکتے تھے۔ ان کے ساتھ ذاکر اور فاخر گئے تھے گرمی زوروں پر تھی امی اور نمرین نے جاتے ہی گاؤں اتار دیئے جب کہ وردہ نے نہ اتارا تھا۔ اس کی عادت تھی وہ کہیں جا کر گاؤں نہ اتارتی تھی۔ پھپھو نے اسے دوسری بار کہا تھا مگر وہ سنی ان سنی کر کے بیٹھی رہی تھی۔ نمرین اور فردوس اس کی عجب عادت پر دل میں نادم تھیں۔

”بیٹا! تم گاؤں اتار لو۔“ پھپھو نے بھابی کو آنکھ سے اشارہ کیا تو انہوں نے بہو کو مخاطب کیا۔ پھپھو کو اس کی گرمی لگنے کا احساس ستا رہا تھا۔ اسی لیے وہ چاہتی تھیں کہ وہ ایزی ہو کر بیٹھے۔

بات کروں گا اس سے۔“ وقار نے سختی سے ڈاکر کو خاموش کروا کر ضرار کو تائید کی جو نہایت پریشان لگ رہا تھا۔ ضرار کو اس سے یہ توقع نہ تھی اس کی پریشانی فطری تھی۔ اب اسے خود سے زیادہ بہن کی فکر رہنے لگی تھی فردوس کھانا تیار کرنے کے لیے اٹھ گئیں۔

☆.....☆

”السلام علیکم!“ شام کا ملگجا اندھیرا گہرا ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ گھر میں اس کا چھوٹا دیور تھا۔ آنٹی اور دردانہ کہیں گئی ہوئی تھیں۔ نعمان اس کے آتے ہی باہر نکل گیا تھا۔ اسے اپنے دوست کے ہاں ضروری کام سے جانا تھا۔ وہ ماں اور بہن کی واپسی کا منتظر تھا اور ان کا دور دور تک کہیں نام و نشان نہ تھا۔ وہ نمرین کے آنے پر کلمہ شکر ادا کرتا فوراً اسے بتا کر گھر سے نکل گیا تھا۔ نمرین اپنے کمرے میں جا کر سستانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے آہٹ سنائی دی تو وہ کمرے سے نکل آئی۔ دردانہ آنٹی کو پانی کا گلاس تمہارا رہی تھی۔ دونوں نے ابھی اپنی چادریں بھی نہ اتاری تھیں۔ نمرین نے آتے ہی جھٹ سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“ آنٹی اور دردانہ نے بیک وقت جواب دیا۔ آنٹی کا لہجہ نرم و خشک جب کہ دردانہ کا لہجہ روکھا اور کرخت تھا۔ سدا کی نرم نمرین کے اندر انجانے خطرے کی گھنٹی زور سے بجی تھی۔ کہیں کچھ گڑبڑ تھی مگر کیا؟ وہ سمجھ نہ سکی تھی وہ اگلے پل خود کو تار مل کرئی آنٹی کے قریب آ بیٹھی۔

”نمرین بیٹا! تم دال چاول پکالو۔“ وہ مسلسل دردانہ کو فونو کس کیے ہوئے بھی آنٹی نے نرمی سے اسے اٹھایا۔ اس نے سسرال میں ہفتہ بھر بعد ہی گھر کے کام کاج شروع کر دیے تھے۔ دردانہ کالج سے آ کر کسی کام کو ہاتھ تک نہ لگاتی تھی۔ وہ وردہ سے چیٹ میں مشغول تھی۔ وردہ اسے آج کی تمام روئیداد بتا رہی تھی۔

”جی آنٹی! وہ سعادت مندی سے سر ہلانی اٹھ

گئی۔ اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے ایک چور نگاہ دردانہ پر ڈالی۔ وہ مسلسل چیٹنگ میں مجھھی اور اس کا چہرہ کرخت و سخت تھا۔ اس کے ماتھے پر بل بھی پڑے تھے۔ وہ جونہی باہر نکلے دردانہ آخری میسج کر کے ماں کے قریب آ گئی اور انہیں سرگوشی میں کچھ بتانے لگی تھی۔ ان کے چہرے پر تفکر کا جال پھیلنے لگا۔ ان کا عیار ذہن تیزی سے بیٹی کو پہچاننے کے لیے تانے بانے بننے لگا۔ انہیں اب وقار صاحب کے وردہ سے بات کرنے سے پہلے کچھ کرنا تھا تا کہ وہ وردہ سے بات نہ کر سکیں ان کا ذہن تیزی سے سوچ کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ دردانہ بھی سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ نمرین اپنے خلاف ہونے والی سازشوں سے بے خبر کھانا پکانے میں مگن تھی۔ ابھی اسے علی کے آنے سے پہلے خود بھی تیار ہونا تھا۔ علی کے آفس سے آنے میں بمشکل گھنٹہ بچا تھا۔

☆.....☆

اس کی آنکھ کھٹکے سے کھلی تھی۔ وہ کھانا کھانے کے بعد کچن کا شمارا کام نمٹا کر فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو دس بجے والے تھے۔ وہ روزانہ کام سمیٹتے سمیٹتے دس بجا دیتی تھی اس کا جسم تھکن سے چور تھا اسے تیار ہونے کا بھی وقت نہ مل سکا تھا۔ وہ ذرا سستانے کو لیٹی تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، ساڑھے بارہ ہو چکے تھے۔ وہ جھپکے سے بال میسجی اٹھ بیٹھی۔ وہ تقریباً اڑھائی گھنٹے سوئی تھی اور اسے خبر تک نہ ہوئی تھی۔

”آپ کب آئے؟“ نمرین نے جمائی روکتے ہوئے علی سے پوچھا تھا۔ اسے ابھی بھی نیند کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ وہ شام سے مسلسل کاموں میں مگن تھکن سے چور تھی۔

”ابھی۔“ علی آہستگی و بیگانگی سے مختصر جواب دے کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ نمرین حیران رہ گئی، وہ گیارہ بجے تک کمرے میں آجاتا تھا۔ وہ سمجھ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

پر گرایا تھا۔ وہ اسے برا بنا کر اپنی بیٹی کی راہ ہموار کرنا چاہتی تھیں۔
علی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اسے ماں کو ناراض نہیں کرنا تھا۔

”میں جب گھر آئی تو صرف فیضی گھر پر تھا۔ امی اور وردانہ کہیں گئی ہوئی تھیں وہ جب آئیں تو میں ان کے پاس بیٹھی تھی۔“ نمرین نے اپنی صفائی دی تھی۔ اسے اپنا وہم حقیقت میں ڈھلتا محسوس ہوا تھا۔ علی کی سرد مہری و خاموشی بلا وجہ نہ تھی۔

”تم تھوڑی دیر بیٹھی تھیں تمہیں زیادہ بیٹھنا چاہیے تھا۔“ علی نے اس کی صفائی رد کر دی تھی۔ وہ حیران رہ گئی۔ نہ جانے کیوں اسے اس پل غصہ نہ آیا تھا اور نہ ہی اسے دکھ ہوا تھا۔ اسے صرف حیرانگی ہو رہی تھی۔ شدید ترین حیرانگی۔ اسے ساری بات بتا دی گئی تھی۔ بات سو فیصد سچ تھی وہ تو واقعی تھوڑی دیر بیٹھی تھی پھر اسے آنٹی نے کھانا پکانے کے لیے اٹھا دیا تھا۔ اس کے الفاظ منجمد رہ گئے۔

”نمرین تمہیں یہاں کسی سے کوئی تکلیف یا شکایت ہے؟“ علی کے اگلے سوال نے اسے مزید حیران کر دیا۔ اسے بات بتانی ضرور گئی تھی مگر اپنے من چاہے الفاظ اور من پسند ہوا ہے۔

”نہیں۔“ اس نے معاملہ فہمی میں ناکام ہو کر ہولے سے گردن لٹی۔ میں ہلانے برا کتنا کیا تھا۔ وہ لاعلم تھی کہ اس کے خلاف بات کو کس حد تک بڑھا چڑھا دیا گیا ہے اور کانوں کا کچا اور ماں کا فرمانبردار علی اس کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہے۔

”پھر تمہارے گھر والوں نے باجی کے ناک میں دم کیوں کر رکھا ہے۔“ آج کا سورج اس کے لیے حیرانگیوں کے پہاڑ لیے طلوع ہوا تھا۔ وہ اس بار ماں سے وردہ کے سارے کچے چٹھے سن کر آئی تھی۔ وردہ نے کیسے اس کے میسے والوں سے آتے ہی پیر باندھ لیا تھا جب کہ علی تو لون مانتا کر رہا تھا جیسے وہ مظلوم ہو

رہی تھی کہ شاید علی نے اسے آرام کی عرض سے نہیں جگایا تھا اسے تو جلدی آنا چاہیے۔ وہ آج ہی تو لوٹی تھی میسے سے ہفتہ بعد۔

علی نائٹ ڈریس میں ملبوس تھا۔ اس کے دلکش خدو خال والے چہرے پر سرد مہری طاری تھی۔ اسی سرد مہری نے نمرین کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔ وہ خاموشی سے علی کی نقل و حرکت نوٹ کرنے لگی۔ علی نے لیپ ٹاپ آن کیا اور کام میں بڑی ہو گیا۔ یہ بھی ایک طریقہ تھا نمرین کو بولنے پر اکسانے کا۔ وردہ اسے صبح آفس کے لیے جلدی اٹھنا تھا۔

”تم سو جاؤ۔“ وہ مسلسل علی پر نظریں جمائے خاموشی سے نیم دراز تھی۔ اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ علی میں اسے دیکھ کر کوئی جذبہ نہ ابھرا تھا۔ وہ شخص انداز میں اسے نظر انداز کیے بڑی تھا۔ وہ دراصل اس کے بولنے کا غلظت تھا تاکہ بات شروع کر سکے نمرین خاموش رہی۔ تاجا چارہ سے ہی بولنا بڑا تھا۔

”مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔“ نمرین کے اندر یکدم ڈھیروں پٹانے اتر آئے تھے۔ وہ تو علی کی چاہتوں کی عادی تھی اس سے علی کی بگاڑی برواشت نہ ہو رہی تھی۔ اسے یکدم شدت سے دوبارہ کسی گڑبگڑ کا احساس ہونے لگا۔ اس کا دل صاف تھا اس نے کسی کے ساتھ کچھ برائے کیا تھا۔ سو وہ سمجھ نہ پاتی تھی۔ وہ اب لاکھ چاہ کے بھی اپنے اندر اٹھتے وسوسوں کو نہ جھٹلا پارہی تھی۔ اس کا دل بری طرح دکھ کر رہ گیا۔

”تمہیں آتے ہی امی اور وردانہ کے پاس تھوڑی دیر بیٹھنا چاہیے تھا۔“ وہ مسلسل علی پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ وہ لیپ ٹاپ بند کر کے اس کے قریب آ گیا۔ آخر اس نے وہ بات بھی تو کرنا تھی جس کے لیے اسے ساڑھے بارہ بجے کمرے میں آنا پڑا تھا۔ امی نے اس کے خوب کان بھرے تھے۔ دراصل وہ جانتی تھیں کہ وردہ نے حقیقتاً بدتمیزی کی حد کر دی ہے مگر ”میں نہ مانوں“ کے مصداق انہیں سارا ملنے نمرین

اور اس کے منکے والے ظالم۔
 ”آخر بات کیا ہوئی ہے؟“ کمرے میں پن
 ڈراپ سائینس تھی۔ نمرین نے معاملہ بگڑنے سے
 پہلے سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ علی کا غصہ و ناراضی بردھتی
 جا رہی تھی۔ وہ اس سے بات کھل کر کرنا چاہتی تھی
 تاکہ کوئی ابہام نہ رہے اور دلوں میں میل نہ آئے۔

☆.....☆

”ہیلو..... ہیلو.....“
 ”نمرین۔“ وہ فون پر مسلسل روئے جا رہی تھی۔
 علی اس سے سخت خفا تھا۔ وہ علی کے لیے صبح ناشتا
 بنانے کچن میں آئی تو آنٹی پہلے سے اس کا ناشتا تیار
 کر رہی تھیں۔ ان کا موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ وہ خوفزدہ
 سی اپنے خول میں کھٹی خاموشی سے ان کا ہاتھ بٹانے
 لگی علی تیار ہو کر آیا تو وہ ناشتہ ٹیبل پر رکھ چکی تھی۔ وہ
 منہ پھلائے ناشتا کر کے آفس چلا گیا۔ ورنہ کان بجا
 چکی تھی وہ آنٹی کے ہمراہ گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ آنٹی
 کا موڈ سخت آف لگ رہا تھا۔ نمرین اپنے کمرے میں
 آگئی۔ اسے موجودہ صورت حال نے سخت پریشان
 کر دیا تھا، اس نے گھبراہٹ و پریشانی سے گھر فون
 ملایا۔ ابو نے کال ریسیو کی۔ وہ ان کی آواز سنتے ہی
 رونے لگی تھی اور سخت گھبرا گئے۔

”بیٹا بولو تو سہی، کیا ہوا ہے۔“ ابو نے گھبرا کر
 قریب سبزی کاٹی ای کو فون تھا، ویاہ بھی صبح اس
 کے فون پر رونے سے سخت متشکر و ہراساں ہو گئی
 تھیں۔ انہوں نے رات کو وروہ کو کچن کی طرف
 جاتے دیکھا تھا وہ ہال روم میں سب کی موجودگی
 نوٹ کر چکی تھی۔ یقیناً اس نے کوئی غلط سلطہ رپورٹ
 اپنے گھر والوں کو پہنچائی ہوگی۔ وہ بیٹی کے رونے
 سے صورت حال کافی حد تک بھانپ چکی تھیں۔

”ای.....“ اس نے می بھرے لہجے میں بہتے
 آنسوؤں کو کنٹرول کرتے ہوئے دھیرے دھیرے
 ساری بات بتا دی تھی۔ وقار پریشانی سے بیوی کو
 دیکھے جا رہے تھے جو وقتاً فوقتاً بیٹی کی بات میں ہوں
 ہاں ہی کیے جا رہی تھیں۔

”ذاکر، باجی کے کاموں میں دخل اندازی کرتا
 ہے کیا اس کا یہ حق بنتا ہے؟ کبھی وہ باجی کا موبائل بلا
 اجازت اٹھا لیتا ہے کبھی اسے باجی کے زیادہ سرف
 ڈالنے پر اعتراض ہوتا ہے اور کبھی وہ ضرار کو باجی کے
 خلاف اکسا کر باجی کا گھر خراب کرتا ہے۔ اگر تمہارا
 کوئی ویو تمہارے ساتھ ایسا کرے تو تمہیں کیسا لگے
 گا۔“ غصے کی زیادتی سے علی کی آواز کانپ کر رہ گئی۔
 نمرین کی حالت کا نو تو بدن میں لہو نہیں“ جیسی تھی اس
 کی ساری باتیں سچ تھیں مگر آدھے ادھورے سچ وہ
 اصل حقیقت سے لاعلم اس پر خفگی سے بول رہا تھا۔
 نمرین ان کے شاطر پن پر دنگ تھی۔

”علی! ایسا نہیں ہے بات.....“ نمرین کی مسلسل
 خاموشی اسے مجرم بنا رہی تھی اس نے حوصلہ جمع کر
 کے بات کرنا چاہی تو علی نے سچ سے اس کی بات
 کاٹ وی۔

”مجھے صرف یہ بتاؤ کیا میں نے کوئی بات غلط کہی
 ہے؟“ اس کی پہلی دونوں باتیں سچ تھیں ادھورے سچ
 تیسری بات تو ہوئی ہی آج تھی اور اسے پورا یقین تھا
 یہ بھی آدھا سچ ہوگی۔ بات اس انداز میں نہیں ہوئی ہو
 گی جس انداز میں علی کر رہا تھا۔

”آپ کی بات سچ ہے مگر.....“ نمرین نے
 دوبارہ اسے حقیقت آشنا کرنا چاہا تھا۔ وہ اسے ساری
 حقیقت کھل کر بتانا چاہتی تھی تاکہ اس کا نام نہ آئے۔
 جیسے آنٹی نے دھڑلے سے ذاکر پر ساری بات ڈال
 دی تھی وہ اس کے ساتھ بھی ایسا کر سکتی تھیں وہ خوفزدہ
 ہو گئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ انجسٹ [151] اکتوبر 2016ء

آئی تھی لہجہ بھر کے توقف کے بعد دوبارہ اپنی زبان کے جوہر دکھانے شرع کر دیئے تھے۔ نمرین بے یقینی و صدے سے نڈھال گنگ تھی۔ آئی کو بیٹی کی سب حرکتوں کا علم تھا اور وہ بیٹی کو سمجھانے کی بجائے داماد کو تصور وار گردانتے ہوئے اس کی کلاس لے رہی تھیں۔ حد تھی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کی۔ وہ اپنی صفائی میں بہت کچھ بولنا چاہتی تھی مگر آئی کے غصیلے و پتھریلے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے الفاظ حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔

”ہم تو اس گھڑی کو روتے ہیں جب میں نے اپنے ہیرے جیسے دونوں بچوں کا تیارے ہاں رشتہ کیا۔ مجھے تو لوگ بہت کہتے تھے کہ تم نے کیسے لوگوں میں سر جوڑ لیا ہے مگر میں کہتی تھی کہ نہیں، نمرین اور ضرار بہت اچھے ہیں۔ مجھے اب پتا چلا ہے کہ میں غلط اور وہ لوگ سچ تھے۔“ وہ دگرگوں کیفیت میں آنسوؤں سے پھیپائی اپنے نڈھال وجود اور شل اعصاب لیے بمشکل بستی تھی۔ آئی اس کی کیفیت قطعی نظر انداز کیے اپنی کہہ سن کر یہ جا اور وہ جا۔ وہ آئی کو پھپھو کے گھر کا سارا واقعہ سنا کر پوچھنا چاہتی تھی کہ وردہ نے جو کچھ میری ماں کے ساتھ کیا اگر میں وہ سب کچھ آپ کے ساتھ کرتی تو پھر آپ کیا کرتیں۔

☆.....☆

”ضرار! تم جتنی جلد ہو سکے الگ گھر لے لو۔“ ضرار آفس جا چکا تھا۔ وقار صاحب نے اسے ارجنٹ بنیادوں پر فوراً کال کر کے گھر بلوایا تھا۔ وہ اسی وقت تو نہ آسکا مگر شارٹ لیو لے کر آ گیا تھا۔ فردوس نے کال ڈیس کنیکٹ ہونے کے بعد وقار کو ساری بات بتا دی تھی وہ تو اسی وقت فون پر سمہن سے بات کرنا چاہتے تھے مگر فردوس نے سمجھا بچھا کر روک دیا۔ صد شکر کہ اس بل ان کے دماغ میں بیوی کا مشورہ بیٹھ گیا۔ وہ بیٹے کے گھر آنے تک جلے پیر کی بلی کی طرح چکراتے پھرتے رہے۔ وہ اس دوران گاسے بگا ہے بہو کے

دھم کیا بتا رہی ہو اپنی ماں کو، ذرا میرے سامنے بتاؤ، ہم لوگ جھوٹے نہیں ہیں اور نہ ہی ہم نے اپنے بچوں کو جھوٹ سکھایا ہے۔“ وردہ کو اس کے فون کی خبر ہو چکی تھی اور یہ بھی کہ وہ رو رہی ہے اس نے اسی وقت ماں کو فون کر کے بتا دیا تھا۔ آئی فون رکھتے ہی اس کے کمرے میں غصے سے آتے ہی اونچی آواز میں بولیں۔ ان کی آواز اتنی اونچی تھی کہ دوسری سمت بات کرتی فردوس تک بخوبی پہنچ گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔

”آئی آپ!“ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کارپٹ پر جا گرا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”تمہیں ہمارے ہاں کوئی تنگی ہے کیا؟“ وہ پوری فارم میں آچکی تھیں۔ نمرین کی گھبراہٹ تو کم ہو گئی تھی مگر وہن اور زبان ابھی تک ساتھ نہ دے پارہے تھے۔

”نہیں۔“ اس نے سن ہوتے دماغ کے ساتھ بمشکل نفی میں گردن ہلائی۔

”پھر تم لوگوں نے میری بیٹی کا جینا کیوں حرام کر رکھا ہے۔“ انہوں نے کڑے تیوروں سے بہو کو سرتاپا گھورا۔

”یہاں کبھی تمہارے کسی ریلوے نے تمہارے موبائل کو ہاتھ لگایا، کبھی تمہارے کسی کام میں مداخلت کی یا کبھی علی کو تمہارے خلاف اکسایا۔“ آئی کا لہجہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے چپ سا دھم بیٹھی تھی۔ اسے ان کی ساری باتیں سمجھ میں آرہی تھیں۔ عافیت خاموشی میں تھی۔

”تم لوگوں نے میری بیٹی کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ تمہارا بھائی میری بیٹی کو کون سی سونے کی روٹیاں کھلا رہا ہے جو تم سب اس پر ظلم کر رہے ہو۔ ضرار بات بات پر اس سے لڑتا ہے، خفا رہتا ہے۔ علی تم سے پہلی بار خفا ہوا تو تم نے فوراً میکے میں فون کھڑا کر دیا۔“

ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، وہاں صرف محسوسات کام کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ کو صرف سمجھا جاسکتا ہے۔ محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ضرار نے چہرہ اوپر کیا۔ اس کی آنکھوں میں ضبط کی لالی پھیلی تھی۔ اس کے لب دھیرے دھیرے کپکپا رہے تھے۔

”ضرار میرے نعل!“ فردوس نے تڑپ کر اسے اپنی متا بھری آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔

”ای! مجھے معاف کرویں۔“ وہ اونچا مرو چھوٹے معصوم بچے کی مانند بلک اٹھا تھا۔ فردوس اسے خاموش کروانے کی سعی میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ کمرے کی فضا مغموم ہو گئی۔ وقار کی آنکھوں میں تاسف کی نمی پھیلنے لگی تھی۔

☆.....☆

”مما! آج ہماری ٹیچر نے ”حقوق العباد اور رشتہ داروں سے تعلقات“ پڑھائے ہیں۔“ نو سالہ طلحہ نے وردہ کو لہجے باکس تھمایا۔ وہ اب بیگ کی زپ بند کر رہا تھا۔ وہ اسکول سے ابھی لوٹا تھا اور آتے ہی حسب معمول ماں کو اپنے اسکول کی ڈیلی روئیداد سنانے بیٹھ گیا تھا۔ اسے اب اس وقت تک چپ نہ ہونا تھا جب تک وہ پوری روئیداد سنانہ لیتا۔ وردہ نہایت تحمل سے جواب دینے کی کوشش کرتی تھی لیکن وہ کبھی کبھار اس کے بے تکے سوالات سے عاجز آ کر اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیتی تھی۔

”بھیا! حقوق العباد کیا ہوتے ہیں۔“ سات سالہ طلحہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

طلحہ کلاس فقہ کا اسٹوڈنٹ تھا جب کہ طلحہ کلاس تھری کا۔

”میری ٹیچر کہتی ہیں حقوق العباد بندے کے بندوں پر حقوق و فرائض ہوتے ہیں اور وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت اپنا حق تو معاف کر دے

کمرے کے بند دروازے پر شعلہ باز نگاہ بھی ڈال لیتے۔ انہوں نے بہو کے چاؤ میں اس سے ابھی گھر کے کام بھی شروع نہ کروائے تھے جب کہ نمرین گھر کے سارے کام تبا کرتی تھی۔ فردوس شوہر کی مزاج آشنا تھیں۔ صد شکر کہ ضرار کے آنے تک وہ خود کو کنٹرول کیے رہے۔ وردہ لا تعلقی سے کمرے میں بند ماں سے باتوں میں مگن ان سے تازہ رپورٹ تفصیلاً سن رہی تھی۔ ضرار چیخ کیے بغیر گھبرایا سا باپ کے پاس سپدھا آیا۔

”خیریت ابو جان؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ صبح آفس گیا تو سب کچھ نارمل تھا پھر ان چند گھنٹوں میں ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ یہ انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ یکدم بے حد بوڑھے لگنے لگے تھے۔ انہیں اکلوتی بیٹی کے دکھ نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

”کیا وردہ نے کچھ کہا ہے؟“ ضرار کو خود ہی خیال آیا تو پوچھ بیٹھا۔

”نہیں بیٹا! اس نے کچھ نہیں کہا ہے۔“ ضرار کے وجود میں اشتعال کی لہر اٹھنے لگی تھی۔ فردوس نے فوراً مداخلت کر کے اس کا اشتعال کم کرنا چاہا تھا۔

”بیٹا بات یہ ہے کہ.....“ وقار سے صد مے دے سے کچھ بولا نہ جا رہا تھا۔ فردوس نے ہی اسے ساری بات بتائی وہ جوں جوں بات مکمل کر رہی تھی ضرار کی رنگت متغیر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے وردہ نے کہیں کانہ چھوڑا تھا۔ وہ والدین کے سامنے مارے خفت کے گردن اٹھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ شرمندگی و بے بسی سے اس کی آنکھوں میں نمی اٹکھی ہونے لگی۔

کمرے میں جامد سناٹا تھا۔ تینوں نفوس کی موجودگی کے باوجود موت کا سناٹا تھا۔

”ضرار!“ وقار نے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا جیسے وہ اس کا غم سمجھ کر اسے حوصلہ دلا سہ دے رہے ہوں۔ بعض اوقات انسان بے بسی و دکھ کی اس انتہائی منزل پر ہوتا ہے جہاں الفاظ انسان کا

”انشال نے ماما کو پریشان کر دیا ہے۔“ بڑے غلجھ نے فوراً اماں کی پریشانی کی وجہ کھوج کر بہن کو ڈانٹا تھا۔ اس سے ماں کی پریشانی دیکھی نہ جا رہی تھی۔

”ارے نہیں بیٹا۔ آپ کھانا کھاؤ میں ٹھیک ہوں۔“ وردہ نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے چہرے پر بشاشت طاری کی تھی۔ وہ خود کو بچوں کے سامنے عیاں نہ کرنا چاہتی تھی۔

☆.....☆

رات کی سیاہی دھیرے دھیرے ہولناکی میں ڈھل رہی تھی۔ سیاہ شب کی سیاہی بہت گہری تھی۔ بالکل انسان کے کیے گناہوں کی طرح اتنی سیاہ کہ انسان چاہ کر بھی اس میں اپنے قبیح گناہ نہ ڈھونڈ پائے اور انسان بھلا اپنے گناہ دیکھنا پسند ہی کہاں کرتا ہے۔ اسے کبھی بھی اپنے گناہوں کا سامنا کرنا یا انہیں دیکھنا پسند نہیں رہا ہے خواہ اسے اپنے کیے گناہوں کا بوجھ تنہا اپنے کندھوں پر جھیلنا پڑے۔

اسے جتنی بھی بھاری قیمت چکانا پڑے سب سہہ لیتا ہے۔ اسے جتنا بڑا نقصان ہو وہ پروا نہیں کرتا۔ اسے بڑے سے بڑا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے وہ برداشت کر جاتا ہے۔ صرف اور صرف اپنی انا کے زخم ہیں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ انیک ایسی ذات بھی موجود ہے جو غیب کے سب رازوں اور پردوں سے آشنا ہے اور اسے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ہمیشہ کے لیے۔ اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، وہ زمین پر رہ کر خدا کو بھول جاتا ہے اس خدا کو جس نے اس کی ڈوریں ڈھیلیں چھوڑی ہوئی ہیں اور وہ سرکش گھوڑے کی مانند اپنی چالوں کے جال میں سرپٹ بھاگتا رہتا ہے۔

بلاشبہ انسان خسارے میں ہے وہ گھائے میں بعض اوقات ایسا سودا کر لیتا ہے کہ اسے اپنی باقی ماندہ زندگی کی تمام خوشیاں رہن دکھنا پڑ جاتی ہیں۔ سیاہ رات لگتی ہوئی لگتی اور سیاہی دھیرے دھیرے سرکش

گا مگر بندے کا نہیں کرے گا جب تک کہ وہ بندہ خود اپنا حق نہ معاف کرے۔“ غلجھ نے نہایت ذہانت سے ٹیچر کی یادداشت میں محفوظ باتیں چھوٹے بھائی کو بتائیں۔

”اب خاموشی سے کھانا کھاؤ بیٹا۔“ وردہ نے دونوں کو ڈانٹ کر سالن کا ڈونگا خاموشی سے کھانا کھاتے ضرار کی طرف بڑھایا۔

”ماما! آپ تو حقوق العباد ادا کرتی ہیں نا، آپ تو بہت اچھی ہیں۔“ ننھی انشال نے بھائیوں کی گفتگو میں حصہ لیا۔ انشال تین سال کی ہو چکی تھی وہ ابھی اسکول نہیں جاتی تھی۔ وردہ کا ہاتھ بری طرح کپکپایا، سالن چمک کر ٹیبل پر آن گرا۔ اس کی رنگت فق ہو چکی تھی جیسے وہ کوئی چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ اس نے ایک چورنگاہ ضرار پر ڈالی۔ وہ تیز چپتی گاٹ دارنگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت مزید غیر ہو گئی۔ ضرار نے والدین کے بے حد اصرار اور نمرین کی خوشیوں کی خاطر نہ چاہتے ہوئے بھی الگ گھر لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا وردہ کا مزاج اس کے گھر والوں سے بالکل مختلف تھا اس نے شادی کے بعد خود کو سسرال والوں کے رنگ میں نہ ڈھالا تھا۔

”ماما کیا ہوا؟“ وقت گزرتا گیا اسے اللہ تعالیٰ نے تین بچے عطا کیے اس نے رفتہ رفتہ سسرال جانا برائے نام کر دیا تھا۔ وہ لوگ بھی نمرین کا آئکن آباد دیکھنا چاہتے تھے سو وہ دل پر جبر کر کے بیٹھ گئے۔

”ہوں..... ہاں..... کچھ نہیں۔“ وہ خیالوں سے گھبرا کر بری طرح چونکی اس نے بچوں اور ضرار پر اچھٹی نگاہ ڈالی۔ بچے اس کی عدم دلچسپی بھانپ کر پریشان و فکر مند تھے۔ ضرار لا پرواہی سے کھانا کھا رہا تھا۔ وہ لٹچ بریک میں بچوں کو اسکول سے لے کر آتا اور انہی کے ساتھ لٹچ کر کے آفس واپس جلا جاتا پھر اس کی واپسی رات و آٹھ بجے ہوتی تھی۔

افسانہ
سورجی

سے پوری طرح بے پرواہ ہو کر لیکن آخر کس لئے؟
وہی کم بخت ماری ”محبت“۔
”ڈرتو نہیں لگ رہا؟“ زبیر اسے نہ جانے کس کی

رات کی تاریکی میں کھرکی وہلیز پار کر جانے والی
لڑکی کے لیے واپسی کا ہر رستہ بند ہو جاتا ہے۔ وہ اچھی
طرح جانتی تھی پھر بھی کرگئی چپ چاپ بعد کے نتائج



تھک گئے جو تکہیں اور پتہ نہیں اور وہ خود کہیں۔
بکھرے بال خون آلود چہرہ اور میل و میل ہو بدن۔
وہ پوری رات وہیں بڑی رہی سخت سردی میں
کھلے آسمان تلے صبح ہوئی تو اکڑی بڑی تھی پھر ماں کو
ہی ترس آیا شوہر کی ہزار مٹیں لاکھ التجائیں کروڑوں
واسطے تب کہیں جا کے ذرا موم ہوئے کئی گھنٹوں تک
ہمت مجتمع کرتے رہے اور پھر چھوٹے بھائی کے
قدموں میں جا گرے۔

”عزت بچالو“۔ روہی پڑے۔ اور پھر وہی ہوا
جو ہوتا آیا ہے۔ گرے کوئی بھرے کوئی۔
بھیجے کوثر بانی دینی پڑ گئی جس کا ایک ہفتے بعد اس
کی چھوٹی بہن سے نکاح تھا جیسے قیامت ہی ٹوٹ
پڑی۔ فریال نے رو رو کر آسمان ہلا ڈالا جہانزیب
نے اپنی محبت کے ہزاروں واسطے دیئے لیکن عزت
محبت سے بڑھ کر ہوتی ہے فریال خالی ہاتھ رہ گئی۔
”چڑیل ہو تم جویریہ“ وہ بے دریغ گالیاں
دیتے ہوئے اس پر پھینک رہا تھا ہی نکاح کی بادی
آئی تو اس نے پھر زبان کھولی۔

”مجھے نہیں کرنا جہانزیب سے نکاح میرا زبیر سے
نکاح ہوا ہے“۔ ایک بار پھر ابو کے ہاتھ میں جوتا آ گیا۔
”کہاں ہے نکاح نہ مٹا بھاری“۔ انہیں تو چڑھ گیا اس کی
پھر نہ سنی ایک بار پھر مان کر ہی ترس آیا زبیر کفون ملا لیا۔
”تمہارا اور جویریہ کا نکاح ہوا تھا؟“ انہوں نے
روتے ہوئے پوچھا۔

”حالتہ میں تو دو ہفتوں سے لاہور نہیں آیا
پرسوں میری فلائٹ ہے امریکا کی کس نکاح کی بات
کر رہی ہیں آپ؟“ جویریہ کے ہوش اڑ گئے۔
”ہوا ہے نکاح میرا؟“ اس کا احتجاج کون خاطر
میں لایا؟ زبردستی مار مار کر جہانزیب سے نکاح کروا
دیا فریال بلکتی رہ گئیں کتے بھی اس سے بہتر زندگی
گزارتے ہوں گے جیسی نکاح کے بعد اس نے
گزار دی۔ ہر آنکھ میں نفرت ہر زبان پر گالی

گاڑی لے کر لینے آیا تھا۔
”بہت لگ رہا ہے“۔ اس کی آنکھیں پٹی پڑ رہی تھیں۔
”گھبراؤ نہیں میں ہر دم تمہارے ساتھ ہوں“۔
وہ دھیرے سے مسکرایا تھا پھر نہ جانے کہاں لے گیا
پہلی رات دوسری رات اور تیسری رات بس جوان تھا
عشق زوروں پر تھا پہلو میں لیٹی لڑکی اس کی جائز اور
شرعی بیوی تھی کیسے روکتا خود کو تین راتوں میں ہی
پاگل ہو گیا ساتھ ہی اسے بھی کر لیا۔

”محبت“ اس کا تو نشہ ہی اندھا ہے ہمیشہ سے
اور بولتا بھی سر چڑھ کے ہے سو بولنے لگا ایک
دوسرے میں کھو کر کہاں یاد رہا کچھ سب بھول گیا گزرا
ہوا وقت آنے والا وقت۔ گزرے ہوئے رشتے
آنے والے رشتے بھول گیا سب دن شبنمی راتیں
رہیں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا اور پھر وہی ہوا جو
ہوتا آیا ہے محبت کا نشہ تر گیا زبیر کا دل بھر گیا۔
”کل نہیں واپس جاتا ہے“ اس میں کم ہوتے
ہوئے بولا تھا۔

”کیوں؟“ وہ پریشان ہوئی۔
”انکل مان گئے ہیں“۔ اس رات وہ خوشیوں کی
ہواؤں کے ساتھ زبیر پر بچھا اور ہو گئی۔
”چلو اندر میں آیا“۔ اسے دروازے پر اتار کے خود
گاڑی نکال لے گیا اندر آئی تو ایک قیامت برپا ہو گئی۔

”کہاں گئی تھیں؟“
”کیوں گئی تھیں؟“
”کس کے ساتھ گئی تھیں اور“

”ہمت کیسے ہوئی واپس آنے کی؟“ ابو کا جوتا تھا
اور اس کا وجود تار تار کر دیا اسے تکلیف اور درد کی
شدت سے اس کے منہ سے نکلتیں سسکیوں کے بیچ
کوئی اس کی بات سن ہی نہ سکا۔

”مجھے امی نے بھیجا تھا زبیر کے ساتھ امی نے ہی
بلایا ہے“۔ اور امی دم بخود کھڑی تھیں آنکھیں پھاڑے
منہ پر ہاتھ رکھے ابو نے تب تک مارا جب تک خود نہیں

جہانزیب لہر اوقت اسے جوڑنے کی نوک پر رکھتا ہر رات وہ اس کی وحشتوں کے آگے روئی رہ جاتی۔

”پلیز مت کریں یہ گناہ ہے میں آپ کی بیوی نہیں ہوں میرا اور زبیر کا نکاح ہوا تھا۔“ لیکن اس کی بکواس سے کسی کو سروکار نہیں تھا۔

☆☆☆☆

کچھ عرصے بعد فریال کی شادی ایک بہت بڑے بزنس مین سے ہوگئی اسے خوش و خرم دیکھ کر جہانزیب کو اس پر اور غصہ آتا جانوروں جیسی زندگی گزارتے گزارتے آخر ایک دن اس کا بیٹا اس دنیا میں آ گیا جہانزیب کے گھر والوں نے اسے قبول کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ نفرت اور ظلم کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے زبردستی اس کا بچہ چھین کے یتیم خانے میں داخل کروا دیا گیا وہ بس روئی رہ گئی سات سال اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتے اسے سات سال ہو گئے لیکن زبیر واپس نہ آیا جہانزیب کے مظالم سہ سہ کر وہ ناں بننے سے بھی محروم ہوگئی وقت نے اس کے خلاف ایک اور کروٹ لی فریال بیوہ ہو کر ماں کے گھر آ بیٹھی۔

جہانزیب کے گھر والے ویسے بھی اس پر دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے ان سات سالوں میں وہ ایک ملٹی سیشنل فرم کا ڈائریکٹر بن گیا تھا گھر والوں کو راضی کر کے اس نے اپنا اور فریال کا بار دوبارہ زندہ کرنا چاہا لیکن جویریہ اس کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن تھا اس نے چپ چاپ بے رحمی سے جویریہ کو طلاق دے دی۔ فریال سے شادی کر لی ویسے بھی اب جویریہ بھی کس کام کی؟ عجیب بد حال ہوگئی تھی وہ بد شکل نیم یاگل اور آخر کار قدرت کو رحم آ گیا اس پر سڑھیوں میں لڑکھرائی تھی گری اٹھی سنبھل نہ سکی گول گول گھومتی نیچے کو آئی اور سیدھی وہاں آ کر گری جہاں بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے زبیر نے قدم رکھے تھے۔

”سروکار ہے انکل! میرا نکاح ہوا تھا اس سے اور ابھی تک طلاق نہیں ہوئی۔“ اس کی بات پر سب دم بخود رہ گئے۔

”تو جب فون کر کے پوچھا تھا تب جھوٹ کیوں بولا۔“ ابو ٹیٹس میں آ گئے۔

”کونسا فون مجھے کسی نے کوئی فون نہیں کیا؟“ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

”آپ بتائیں مجھے خالہ! آپ نے ہی کروایا تھا ناں ہم دونوں کا نکاح۔“ وہ خاموش کھڑی زابدہ بیگم کی طرف مڑا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔“ ابو زور سے بولے۔

”یہ سچ ہے ابو! مجھے سات سال ہو گئے یہ بات کہتے مگر آپ ہمیں سے کسی نے یقین نہیں کیا میرا اور زبیر کا نکاح امی نے کروایا تھا۔“ جویریہ نے زبان کھولی۔

”میں کیسے آپ کی عزت اچھا ل سکتی تھی ابو! کیسے؟“ امی نے مجھے کہا کہ آپ میری شادی ایک انتہائی عمر رسیدہ معذور شخص سے کروانا چاہتے ہیں اور مجھے بچانے کے لیے انہوں نے آپ سے چھپا کر میرا اور زبیر کا نکاح کر دیا انہوں نے ہی مجھ سے کہا کہ میں کچھ دنوں کے لیے زبیر کے ساتھ گھر سے چلی جاؤں پھر جب یہ آپ کو سنالیں گی تو ہمیں واپس بلا لیں گی آپ ہمیں معاف کر دیں گے اور اس کے بعد زبیر مجھے امریکا لے جائے گا۔“ جویریہ زار و قطار رو رہی تھی۔

”یہ کیا بکواس ہے۔“ ابو زور سے بولے۔

”یہ سچ ہے ابو! مجھے سات سال ہو گئے یہ بات کہتے مگر آپ ہمیں سے کسی نے یقین نہیں کیا میرا اور زبیر کا نکاح امی نے کروایا تھا۔“ جویریہ نے زبان کھولی۔

”میں کیسے آپ کی عزت اچھا ل سکتی تھی ابو! کیسے؟“ امی نے مجھے کہا کہ آپ میری شادی ایک انتہائی عمر رسیدہ معذور شخص سے کروانا چاہتے ہیں اور مجھے بچانے کے لیے انہوں نے آپ سے چھپا کر میرا اور زبیر کا نکاح کر دیا انہوں نے ہی مجھ سے کہا کہ میں کچھ دنوں کے لیے زبیر کے ساتھ گھر سے چلی جاؤں پھر جب یہ آپ کو سنالیں گی تو ہمیں واپس بلا لیں گی آپ ہمیں معاف کر دیں گے اور اس کے بعد زبیر مجھے امریکا لے جائے گا۔“ جویریہ زار و قطار رو رہی تھی۔

لیکن بعد میں انہوں نے پتہ نہیں کیوں
میرے ساتھ ایسا کیا اور تم....." وہ یونہی روتے
ہوئے زیر کی طرف مڑی۔
"تم مجھے اکیلا چھوڑ کر امریکا چلے گئے۔" زیر
ایک دم اس کی طرف گیا۔

"نہیں جویر یہ ایسا نہیں ہے مجھے امریکا جانے
کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی انہوں نے مجھ سے کہا
کہ یہ مجھے پیسے دے دیں گی لیکن اس کے بدلے
مجھے تم سے شادی کرنا ہوگی صرف چند دنوں کے لیے
کیونکہ تمہارے ابو تمہاری شادی ایک عمر رسیدہ معذور
انسان سے کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد وہ تمہارے
ابو کو سنالیں گی اور تمہیں واپس گھر لے آئیں گی میں
امریکا چلا جاؤں گا اور اس کے بعد جب یہ کہیں گی
تمہاری طلاق بخوادوں گا لیکن..... میرے جانے کے
بعد انہوں نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا میں نے کئی بار فون
کئے مگر انہوں نے بات نہیں کی مجھے بھی کیریر بنانے
میں وقت لگ گیا اور یہ ہی میری غلطی تھی میں مانتا ہوں
میں نے غلط کیا تم میری بیوی تھیں اور مجھے تمہاری خبر لینے
چاہئے تھی۔" ابو کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"بتا میں خالہ! آپ نے اس کے بعد رابطہ کیوں نہیں
کیا؟" وہ زاہدہ کی طرف مڑا جو ساکت کھڑی تھیں۔
"آپ نے مجھے آخری بار فون کر کے کہا تھا کہ
جویر یہ کو گھر چھوڑ کے خود چل چلا امریکا چلے جاؤ
جویر یہ کو آپ خود سنہالیں گی اور کچھ عرصے تک طلاق
کا مطالبہ کریں گی پھر کیوں نہیں کیا رابطہ؟" زیر کے
سوال بڑھتے جا رہے تھے۔

"بولو زاہدہ! کیوں کیا یہ سب؟" ابوان کی طرف بڑھے۔
"کیونکہ میں اپنی فریال کو بہت خوش اور آسودہ
دیکھنا چاہتی تھی یہ جہانزیب سے شادی کرنے پر پسند
تھی جبکہ میں اس کی شادی نعمان سے کرنا چاہتی تھی
روپے پیسے کی ریل چل تھی اس کے پاس جب کے
جہانزیب اس کے پاس تب کچھ بھی نہیں تھا میری

فریال کو کیا پتا تھی میں نے یہ سب کیا؟ زیر کو رقم
چاہئے تھی میں نے رقم کے بدلے اسے جویر سے
نکاح کرنے کو کہا لیکن....." وہ کچھ دیر رکھیں۔
"وہ نکاح اصلی نہیں تھا صرف ڈھونگ تھا۔"
جویر یہ اور زیر دونوں دم بخود رہ گئے۔

"تمہیں امریکا جانے کا کہہ کر میں جویر یہ کو صحیح معنوں
میں گناہ گار بنا کر واپس لے آئی اس کا پہلا بچہ بھی
نا جائز تھا۔" زیر انہیں دکھا اور تاسف سے دیکھ کر رہ گیا۔
"میں صرف فریال اور جہانزیب کو الگ کرنا
چاہتی تھی اور میں نے کر دیا جہانزیب کو زبردستی
جویر یہ سے نکاح کرنا پڑا اور میں نے فریال کی شادی
نعمان سے کر دی۔" ابو کا سر جھک گیا۔

"کہاں ہے میرا بچہ؟" زیر کو قہر چڑھ گیا۔
"زیر میرا بیٹا تیم خانے میں ڈال دیا ان لوگوں
نے۔" جویر یہ کی بات اس کا دل چیر گئی۔

"خالہ! خدا نے آپ کے سینے میں دل رکھا بھی
ہے یا نہیں ڈر نہیں لگا آپ کو اس معصوم کی زندگی
اجاڑتے ہوئے اس سے اس کا بچہ چھینتے ہوئے میں
اگر آج واپس نہ آتا تو شاید ساری عمر گناہ گار رہتا
میں آج ہی اپنے سچے اور جویر یہ کو یہاں سے لے
جاؤں گا۔" زیر نے انتہائی تاسف سے اسے دیکھتے
ہوئے کہا جو صرف اس کی خاطر تباہ ہو گئی تھی۔

"کیوں کیا یہ سب زاہدہ؟" ابو نے انہیں چھوڑا۔
"صرف اپنی فریال کے لیے اپنی بیٹی کی خوشی کے
لیے اسے ہمیشہ آسودہ دیکھنے کے لیے۔" وہ بولیں۔

"تو یہ کیا تھی تمہاری جسے برباد کر دیا جسے میری
نظروں میں گناہ گار بنا دیا جس کے لیے ہر ایک کی
نظروں میں صرف نفرت پیدا کر دی یہ بھی تو بیٹی تھی
تمہاری۔" وہ رو پڑے۔

"نہیں ابو! میں ان کی بیٹی کب تھی؟ ان کی بیٹی تو
فریال ہے میں نہیں ہوں میں تو "سو تلی ہوں" سو تلی۔"

☆☆.....☆☆.....☆☆

قسط

”نو کری ڈھونڈنے“۔ وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔
”لیکن اس کی ضرورت کیا ہے، میں ہوں ناں“۔
”آپ کو نہیں لیکن مجھے ضرورت ہے اور میرے لئے
اب کسی کا ہونا نہ ہونا برابر ہے“۔ اس کے کہنے میں ہی آگئی۔
”لیکن.....“

فیروزی نظر کے شلوار میض میں ملبوس کندھوں پر
دو پٹا پھیلائے سر پر اسکارف لئے اس نے بیگ کندھے
سے لٹکایا اور فائل ہاتھ میں لے کر وہلیز پار کرنے کو تھی کہ
پچھے سے آنے والی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔
”کہاں جا رہی ہو.....؟“



”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ مزید کچھ سے بغیر نکل گئی۔

تھیں۔ کتنی بزمِ مہمانِ محبت کرنے والی تھیں تم۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں تو وہ بھڑک اٹھی۔

☆☆☆☆

”پلیز اماں! یہ بار بار ماضی یاد دلا کر مجھے ایموشنل

بلیک میل نہ کریں، جب میں اچھی تھی تو کیا دیا مجھے میری

اچھائی نے آپ نے میرے لئے اچھا سوچا، سسرال

میں میرے ساتھ اچھا ہوا، یا دنیا میرے ساتھ اچھا

کر رہی ہے؟ ایسی اچھائی کا کیا فائدہ جو آپ کو ذلت

کے بغیر کچھ نہ دے سکے، اس سے میں بری اچھی

ہوں۔“ اس نے غصے میں پوری تقریر جھاڑ دی جو باہر

بیٹھا اس کا باپ اور اس کے بچے بھی سن رہے تھے۔

”ہم نے تو بڑے ارمانوں سے تمہاری شادی

کی تھی نبیلہ! اماں باپ کب یہ چاہتے ہیں کہ ان کی

اولاد واپس آ کر گھر بیٹھ جائے۔“ اس کا باپ اندر

پنکھا چلا کر وہ ٹڈھال کرسی پر ڈھے گئی، دوپٹے

سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے سر سے اسکارف

اتار کر بیڈ کی طرف پھینکا اور فائل کو ٹیبل پر پھینک کر وہ پیر

اٹھا کر اسے دبائے لگی، چلتے چلتے اس کے پاؤں سوچ گئے

تھے، مسلسل ایک ہفتے سے وہ اسی طرح صبح سے شام تک اسی

طرح لا حاصل کوشش کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

”کچھ کھانے کو لاؤں۔“ اس کی ماں کمرے

میں داخل ہوئی۔

”ہاں! زہر لادیں تھوڑا سا، تاکہ اس بے حس دنیا

سے جان چھوٹ جائے،۔۔ وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

”کیوں اتنا تلخ ہو گئی ہو، پہلے تو تم ایسی نہ

پاک سوسائٹی

Downloaded From

Paksociety.com



اپنے غصے کو کم کرنا چاہا جو کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔

”ہم نے سوچا تھا کہ جب وہ شادی شدہ اور بال بچوں والا ہو جائے گا، تو اللہ اسے ہدایت دے دے گا۔“ وہ جیسے ہار مانتے ہوئے اعتراف کر رہے تھے نبیلہ کے چہرے پر اب کی بار غصہ نہیں طغریہ مسکراہٹ آئی۔

”کیوں ابا! جو اللہ کبیر کو ہدایت دے سکتا تھا وہ معیذ کو رزق نہیں دے سکتا تھا، مان لیں کہ آپ کے ایک غلط فیصلے نے چار زندگیاں برباد کیں میری معیذ کی اور میرے دو بچوں کی، مجھے میری سب زندگی نے وہ کچھ سکھایا ہے، جو آپ کی پرسکون زندگی نے آپ کو نہیں سکھایا اور یہیں پر سارے والدین غلطی کر جاتے ہیں، وہ سب کو اپنا جیسا خیال کر کے فیصلے کرنے لگتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔“ اپنے باپ کو لاجواب ہوتے دیکھ کر وہ دھیسے سے بولی۔

☆☆☆☆

”نون سنتے ہی وہ دوڑ کر ہاتھ روم میں گھس گئی اور تیار ہو کر نکلی تو قابل اور پرس ہاتھ میں تھا، وہ جلدی میں تھی کہ دوبارہ اسی سوال نے اس کے بڑھتے قدم روک لئے۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”ایک جگہ ایلانی کیا تمہاں سے انٹرویو کی کال آئی ہے۔“

”تم حجاب نہیں کر دو گی،“ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

”کیوں.....؟، وہ حیرانی سے مڑی۔

”میں کماؤں کا تمہارے بچوں کے لئے ساری عمر،“

”چاہتی تو میں بھی یہی ہوں کہ آپ کما کر ان کو

بالیں تاکہ لمحہ لمحہ اپنی غلطی کا احساس ہوتا رہے آپ کو،

لیکن کچھ غلطی میری بھی تھی، میں بھی قسمت کا لکھا سمجھ

کر آپ کے ناجائز فیصلے کو ٹھکرانہ سکی، نہ اپنے حق کے

لئے لڑتگی ویسے بھی میں اب کسی پر انحصار نہیں کر سکتی،

خود مختار ہونا چاہتی ہوں تاکہ میری قسمت کے فیصلے

میرے ہاتھ میں ہوں کسی اور کے ہاتھ میں نہیں۔“

اس نے سیک اٹھایا اور دہلیز پار کر گئی۔

☆☆☆☆

آ کر کمزور لہجے میں بولا۔

”یا لکل ٹھیک ابا! اب آپ نے صحیح بات کی، ماں باپ یہ کبھی نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹی دوبارہ آ کر ان کی دہلیز پر بیٹھے، اسی لالچ میں رشتہ کرتے وقت صرف چند پیسوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر دیتے ہیں۔“

اس کی آواز رندھ گئی۔

”کاش..... والدین اولاد کی خوشی کو دیکھتے،

حقیقت پسندی سے سوچتے تو یہ نوبت نہیں آتی۔“

اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”یہ سب قسمت کے کھیل ہیں بیٹا!“

”نہیں ہیں قسمت کے کھیل نہیں ہیں۔“ وہ چیختے

ہوئے بولی۔

”جانتے تھے آپ کہ میں اور معیذ ایک دوسرے

کو پسند کرتے ہیں، آپ کا بھتیجا تھا وہ ساری عمر آپ

کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی، صرف اس لئے کہ

وہ حجاب لیس تھا غریب تھا، آپ کو ڈرتھا کہ میں شادی

کے بعد آپ سے کچھ لینے نہ آؤں، صرف اس لئے

آپ نے میری شادی کبیر سے کر دی جس کی بری

خصالتوں سے آپ واقف تھے، ابا کیوں؟ اولاد

اگر فرمانبردار ہو تو ماں باپ کو اس کی فرمانبرداری کے

صلے میں ان کی خوشی کا احترام کرنا چاہئے نہ کہ روندنا،۔“

وہ آج سارے حساب برابر کرنے پر تھی۔

”ایسا نہیں ہے بیٹا۔“ اس کی ماں روتے ہوئے بولی۔

”ایسا ہی تھا اماں! معیذ کے پاس بے شک دولت

نہ تھی، لیکن وہ مجھ سے محبت کرتا تھا، میں اس کے گھر

میں عزت سے رہتی چاہے ایک وقت کھاتی، لیکن یوں

ذلیل نہ ہوتی، اور کیا ملا آپ کو آپ کی لاپچی سوچ اور

فیصلے سے اکیلی گئی تھی اور سود سمیت واپس آ گئی،

طلاق کا لیبل لگا کر اس ذلیل انسان نے تو بچوں کو بھی

نکال دیا، جو اپنے بچوں کی پرواہ نہیں کرتا، کسی دوسرے کی

اولاد کی کیا کرے گا، اتنی زندگی گزار کر یہ فلسفہ آپ کی

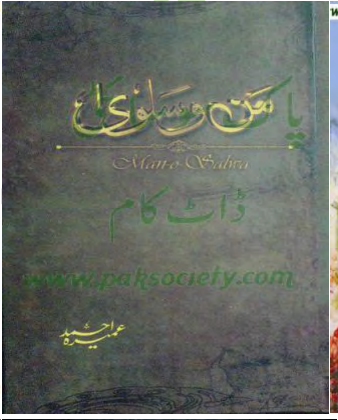
سمجھ میں نہیں آیا،۔“ اس نے بھرا گلاس منہ سے لگا کر

ببین ہمارے گھر کی رجماء رجماء

”مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں جس سے تمہارا چپ کا روزہ ٹوٹ جائے۔“ زیدین اس موم کی گڑیا سے استدعا کر رہا تھا، زیدین کی لمبی انگلیاں نوالہ ڈالتے وقت اس کے منہ کے اندر تک چلی جاتیں وہ کپکپاتے لبوں سے



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



انتہائی نرمی سے ہونے لگی تھی اسے نازل کرنے کے بجائے زیدین اور نجی حراساں کو روتا تھا۔
”ہوں..... میرا خیال ہے اب تو ضرور بولو گی“۔ اس کی حالت پر زریب مسکراتے زیدین نے اس کے
گال پر زور سے چنگی کائی عناس نے گال یہ ہاتھ رکھ کر منہ بسورا، گویا اسے اب تک کی حرکات میں سے یہ حرکت
پسند نہ آئی ہو، زیدین کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”اف..... لڑکی کی اتنی سی ہوا اور لوہے کے چکنے چبوار ہی ہو“۔ زیدین نے دونوں ہاتھوں کو تھوڑا سا فاصلہ دے کر کہا۔
”اچھا تمہاری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟“ زیدین نے اس کی دلچسپی کے تحت پوچھا مگر جواب نثار دوہ جھل سا ہو گیا۔
”اچھا یہ بتاؤ جو پبلی میں وقت کیسا گزرا اور مجھے بتائے بغیر لوٹ کیوں آئیں؟“ زیدین نے اس کے پہلو
میں کہنی ماری مگر ضد تھی کہ ٹوٹنے میں نہ آئی۔

”اگر اب نہ بولیں تو اچھا نہیں ہوگا“۔ زیدین نے آخری حربہ کے طور پر عناس کو بولنے پر مجبور کرنے کے لئے



اس کی گردن ایک ہاتھ کے شکنجے میں لی، مگر یہ کیا عناس اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ اس کے ہاتھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر چلانے لگی۔
 ”پلیز مجھے مت ماریئے آئندہ میں آپ کی ہر بات مانوں گی، پلیز مجھے چھوڑ دیں۔“ اس کے غیر متوقع
 ہجانی رد عمل پر زیدین بوکھلا گیا اس کی آواز یا ہر جانے کے خوف سے اس کے منہ پر ہاتھ جمادیا۔

”کم آن عناس! یہ صرف ایک مذاق تھا میں تمہیں کیوں ماروں گا اپنے ہاتھوں اپنی جان کیوں لوں گا۔“
 زیدین اسے خود میں بھیجے گیا اور یالوں میں ہاتھ پھیرے گیا، عناس کو اپنی بے اختیاری پر شرم آگئی وہ زیدین کے
 اس تصور کو دل سے نکال نہ پائی تھی جو بچپن سے اس کے ساتھ چل کر بڑا ہوا تھا۔ زیدین کا سینہ کسی مہربان گود کی
 مانند اس کے بے قرار دل کو فرار بخش رہا تھا، تمام اندیشے اور وسوسے مٹنے جا رہے تھے محبت اعتماد کا درس سینے سے
 سینے میں منتقل ہو رہا تھا، عناس کے اندر کی سلکتی آگ سرد ہوتی جا رہی تھی، وہ پرسکون لہروں کی مانند بہتی جا رہی
 تھی۔ دوسری طرف زیدین کے لئے لمحہ لکریہ شروع ہو چکا تھا اب تک کی اس کی حالت کو جیا سمجھ رہا تھا مگر ذرا سی
 شوخی پر اتنا خوفزدہ ہو جانا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

”عناس.....“ عناس کے بے حرکت اور بے آواز بدن سے اندازہ ہوا کہ وہ سنبھل چکی ہے ایسی لئے زیدین
 نے دھیرے سے پکارا۔

”جی.....“ عناس کی جی سے زیدین کی آنکھیں چمک اٹھیں، گویا اب وہ بہتر تھی۔
 ”سوری میں نے آپ کو بلا وجہ پریشان کیا میں بس ایسی ہی ہوں۔“ عناس انگلیاں جھٹاتے ہوئے بولی۔
 ”مثلاً کیسی ہوتی؟“ زیدین نے اس کے پھرے بال سیٹ کرہ میر بینڈ میں اتکا دیئے۔
 ”یونہی بنا بات کے رو پڑتی ہوں، ذرا ذرا سی بات پر ڈر جاتی ہوں، اتنی بڑی ہو گئی ہوں، ابھی تک ماما
 میرے سو جانے تک میرے سر ہانے بیٹھی رہتی ہیں۔“ عناس اپنے مخصوص لاابالی انداز میں کہے گئی۔

”اچھا تو اتنی بڑی ہو گئی ہوتی؟“ زیدین نے ایسی معنی خیزیت سے کیا جو عناس کے سر کے اوپر سے پرواز کر گئی۔
 ”کیوں آپ کو نظر نہیں آ رہا بقول ماما کوٹھے جتنا قد ہے میرا۔“ عناس اس کی لائٹھی پر ناک چڑھا کر اور ماں
 کے انداز کو نقل کرتے ہوئے اسے ہنستے زہنے پر مجبور کر گئی۔

”اس کوٹھے جتنے قد کے اندر وہ کہاں ہے یہاں کہ یہاں۔“ زیدین نے نقل کے پابت دریافت
 کرتے ہوئے پہلے عناس کے سر پر ٹھونک بجائی پھر گھٹنے پر، یہ پہلی بات تھی، جو عناس آسانی سے نہ صرف
 سمجھ گئی بلکہ روٹھ بھی گئی۔

”اب اگر چپ ہوئی تو پھر بالکل نہیں بولوں گی۔“ کیا دھمکی تھی زیدین کے روم روم میں سرشاری دوڑ گئی وہ
 عناس کے ایسے ہی انداز کا متنی تھا جو بالآخر کافی محنت کے بعد اسے حاصل ہو گیا تھا۔

”او کے ملکہ نخرہ! آپ کے خلاف مزاج کوئی بات نہیں کریں گے۔“ تا بعد اری کے عظیم الشان مظاہرے کے
 باوجود وہ کچھ خوش نظر نہ آئی، اب کی بار اسے خود کو دیئے ٹائٹل پر تحفظات تھے، زیدین اس کی معصومانہ اداؤں پر
 تار ہوا جا رہا تھا۔

”لالہ! مجھے غصہ بھی بہت آتا ہے۔“ اپنی طرف سے اس نے بڑی اہم اطلاع دی تھی مگر زیدین تو صرف
 ایک ہی لفظ سن پایا۔

”یہ اللہ کسے کہا ہے؟“ زیدین نے زبیرب مسکراتے ہوئے عناس کا کان کھینچا جس طرح غلطی پر استاد
 شاگرد کے کان کھینچتے ہیں۔

سواری بے دھیالی میں منہ سے نکل گیا، میں جلدی میں الٹا سیدھا بھی بول دیتی ہوں، "عناں مستقل اپنا تعارف کرانے میں مصروف تھی، زیدین بمشکل خود کو کوئی بھی لطیف شرارت کرنے سے روکے ہوئے تھا، وہ عناس کی بولتی بند کرنا نہیں چاہتا تھا، مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا جہاگیر اور رانیہ چائے کے کپ لئے اسے کمپنی دینے کے خیال سے چلے آئے عناس بیڈ سے اٹھ کر دور جا بیٹھی تھی، باقی تمام وقت اس نے گفتگو کو شرف نہیں بخشا تھا۔



حنا: آج کافی دنوں بعد کچھ نارمل حالت میں تھی منہ ہاتھ دھو کر بال سمیٹ کر اپنے کمرے سے نکلی کوریڈور سے گزرتے ہوئے اسے جس نے بھی دیکھا اس کی تبدیلی کو واضح نوٹ کیا، حنا زوبیہ کے کمرے میں داخل ہوئیں وہ کسی فنکشن میں جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں، حنا کو دیکھ کر کھل اٹھیں فوراً آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

"شکر ہے حنا! تم اپنے خول سے باہر نکلیں میں تمہارے لئے از حد فکر مند تھی، حنا نے ماں کے بلیک سائڈ بھی اور ڈھیروں زیورات میں گھر کر پریشان ہونے پر مسخرانہ انداز میں دیکھا۔
زوبیہ دس می! کوئی کسی کے لئے فکر مند نہیں ہوتا، بس نفسا نفسی کا عالم ہے اور یہی دیکھ کر میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ حنا ماں کے حلے پٹن کر تے ہوئے بولی زوبیہ کو بھی غصے نے آن گھیرا۔
"اچھا تو میم صاحبہ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" اب کے زوبیہ کا لہجہ بھی حنا کی طرح سرد تھا، دونوں ماں بیٹی یک فطرت تھیں۔

"ممی! میں ذون سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

"کیا اومانی سوپٹ ہارٹ! یہ اچھا فیصلہ کیا تم نے گولی مارو زیدین کو اور....."
"گولی مارنے لگے لئے ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔" زوبیہ کے خوشی کے اظہار پر حنا نے ان کی بات کاٹ کر ہر لفظ چبا کے ادا کیا۔

"ممی! ذون اس شادی پر آسانی سے تیار نہیں ہوگا، مگر آپ کو ہر صورت یہ کام کرنا ہے، دعا کو پانے اور زیدین کو تڑپانے کے لئے یہ شادی بہت ضروری ہے،،، وہ دعا کی جدائی میں بالکل گھل گئی تھی، اس کی تمام سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں نہ کہیں جانی نہ کسی سے بات کرتی، صرف دعا کی تصویر لئے اس سے رورو کر باتیں کرتی تھی، دعا کی جدائی میں اسے سب کچھ بھول گیا تھا، سوائے ایک نام کے "زیدین" وہ اس سے انتقام لینے کے لئے جھلس رہی تھی، اس کا دماغ زیر میں بھی تراکیب سوچتا رہتا تھا، یہ شادی بھی اسی انتقام کی ایک لڑائی تھی۔



آج دن چڑھیا تیری رنگ درگا
زیدین کو میوزک سے خاص شغف کبھی بھی نہ رہا تھا، لیکن آج بیدار ہونے ہی عناس کے روشن صبح کی مانند چہرے کو دیکھ کر نجانے کیسے اس کے لبوں پر کبھی کا سنا گیت چل اٹھا۔ رات کا کھانا زیدین، عناس کے لئے لایا تھا تو صبح کا ناشتا لئے عناس حق میزبانی ادا کرنے آئی تھی، زیدین گرم چائے انتہائی گرجوٹی سے اس کے ہاتھوں سے لینے لگا۔ زیدین کو یہ صبح اپنی زندگی کی سب سے خوبصورت اور سہانی گھڑی لگ رہی تھی رات کو اسے عناس کا ہی بیڈ روم دیا گیا تھا وہ خود اپنے والدین کے ساتھ بولی تھی تمام رات عناس کے نکلنے کو خود سے لگائے وہ اس کی

مہک میں ڈونٹا رہا تھا اور آنکھ کھلے ہی عناس کی طرف سے کل کے سلام کا جواب عطا ہوا تھا۔
 دیر آید درست آید کے مصداق اس نے اسکارف سے بے نیاز بالوں کو کچھڑ میں باندھے سفید کرنا شلوار و
 ملٹی کلر و پٹھو اوڑھے عناس کی شبیہ نہ صرف آنکھوں میں قید کی بلکہ موبائل میں کچھڑ بھی کرتی تھی۔
 ”زیدین! ابھی واپسی کے بارے میں مت سوچنا“۔ رانیہ ناشتے کا باقی سامان لاتی ہوئی مان سے بولیں،
 زیدین ان کی آمد پر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”نہیں پھینچو! حویلی میں حالات کچھ نا سازگار ہیں، جانا ضروری ہے آپ لوگ حویلی کیوں نہیں چلتے ویسے
 بھی عناس کا کالج آف ہے۔“ زیدین ان کی محبت پر خوش ولی سے بولا، سہولت سے انہیں مطمئن کرتے ہوئے
 دل کو مطمئن کرنے کی سعی بھی کر لی۔ عناس اس کی روانگی کا سن کر نخوت سے منہ چڑھا کر باہر نکل گئی، جو اس بات کا
 اعلان تھا جاتے ہیں تو جائیں ہمیں کیا۔ زیدین اس کی حلقی بھری اور جی جان سے خوش ہوا، عناس نے پہلی بار
 اس مخصوص بے تکلفی کا اظہار کیا تھا جو محض پیار کرنے والوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے، یہ اس بات کی علامت تھی
 کہ زیدین کے اندر دکھتا الاؤ عناس کے اندر بھی چنگاری بھڑکا چکا تھا، وہ بیک لئے رانیہ اور جہانگیر کی سنگت میں
 ڈانٹنگ روم میں داخل ہوا، تو وہ دروازے کے پاس منہ بسورتی نظر آئی۔

”تو پھر آپ سب کی آمد کب تک متوقع ہے؟“ زیدین نے کن اکیوں سے عناس کو دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔
 ”ہم کیسے آسکتے ہیں؟ ہمارے بھی تو بیٹا کام ہیں یہاں پر۔“ رانیہ کے بجائے عناس نے تنگ کر جواب دیا
 زیدین کاموں کی تفصیل پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ رانیہ بول آئیں۔

”جی بہت کام ہیں دزیر اعظم تو یہی ہیں یہاں کی۔“ رانیہ کے لتاڑنے پر وہ الٹا زیدین سے مزید ناراض
 ہو چکی تھی، ایک بار پھر واک آؤٹ کر گئی زیدین اس لمحے لمحے کی آنکھ پھولنے سے خوب محفوظ ہو رہا تھا۔
 ”پھینچو! میری نازک سی امانت کا خوب خیال رکھئے گا۔“ اس کے لہجے کی چاشنی اور پیار برساتا انداز رانیہ
 اور جہانگیر کے لئے بھی دل کھینچنے والا تھا۔

”فکر نہیں کرو تمہاری امانت ہماری بھی جان ہے۔“ رانیہ نے بھی شوخی کا مظاہرہ کیا۔ مزید قدم بڑھاتے وہ
 کارپورج تک آئے تو محترمہ گاڑی سے ذرا فاصلے پر ستون سے ٹیک لگائے نظر آئیں، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ
 اسے بھرپور طریقے سے رخصت کر رہی تھی۔ زیدین نے خود کی طرف اٹھتی نگاہ کو سر جھکا کر سلام کہا اور رانیہ اور
 جہانگیر سے نظر بچا کر دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں لبوں سے چھو کر اس کی طرف اچھال گیا، وہ متحیر و حراساں سی ہو گئی،
 سب سے علیک سلیک کر کے اس نے کمال جرأت سے اپنا ہاتھ عناس کی طرف بڑھایا تھا، جو والدین کی موجودگی
 کے باعث قدرے دقت کے ساتھ عناس نے ذرا سا اپنے ہاتھ سے بچ گیا، مگر اسی اثناء میں زیدین ایک کاغذ اس کے
 قدموں کے پاس گرا چکا تھا، اس کے مسکرا کے گاڑی میں سوار ہوتے ہی وہ جھٹ سے کاغذ اٹھائے اندر دوڑ لگا چکی تھی۔

☆☆☆☆

”آؤ زیدین! ہم تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔“

”کیوں شاہجہانی خیریت؟“ زیدین کو حویلی میں داخل ہوتے ہی شاہجہانی کا پیغام ملا تھا وہ سیدھا ان کے پاس
 چلا آیا جہاں کمرے میں شاہجہانی، تانی ماں کے علاوہ چچا، چچی، تانیہ اپنے شوہر سمیت تھی کہ زوبیہ بھی اپنے شوہر کے
 ساتھ موجود تھیں اور یہی بات چونکا دینے والی تھی، زوبیہ اور حنا کی موجودگی ہمیشہ کوئی نئی تیج لئے ہوتی تھی۔

”زیدین تمہارا رخصتی کا کب تک ارادہ ہے؟“ یہ یقیناً تمہیں بھی زیدین ڈیڑھ گھنٹے پہلے رنجوں کو بمشکل

”جب ماں چاہیں۔“ زیدین تائی ماں کے گھٹنوں سے لگا بیٹھا تھا کہتے ساتھ ہی گھٹنے و بانے بھی لگا تھا۔
 ”میں تو آج ہی وہ پھول لے آؤں، پر تو نے بھی تو کھلی چتی ہے اتنی جلدی بیاہ لانا مناسب نہیں لگتا۔“ تائی
 ماں اس کے بال کھینچ کر ڈپٹے کے سے انداز میں بولیں۔

”تائی ماں! کلی چتی ہے کونسا انار کلی چنوا دی۔“ زیدین نے بر ملا مزاح کیا محفل میں قہقہے بکھرے تھے۔
 ”شا جہانی! مطلب کی بات کریں۔“ زوبیہ کو زیدین کے مسکراتے چہرے اور زعفران زار ماحول سے سخت
 چہ محسوس ہوئی بل کھا کر کہہ اٹھیں، زیدین کی مسکراہٹ کشی زوبیہ کی موجودگی ہمیشہ اسے بدمزہ کر دیتی تھی۔
 ”زیدین دراصل ہم تم سے ذون کے متعلق بات کرنا چاہتے ہیں میرا خیال ہے اب ذون کی شادی ہو جانی
 چاہئے۔“ زیدین کے موڈ کو آف ہونے سے پہلے شا جہانی اصل بات کی طرف آگئے کیونکہ پھر زیدین اور
 پھری لہریں کب قابو میں آتے ہیں۔

”بالکل میرا بھی یہی خیال ہے ذون کی شادی کر دی جائے۔“ زیدین تائی ماں سے بولا۔
 ”زیدین! تم جانتے ہو ذون پہلے سے شادی شدہ ہے اور پھر وہ اب حویلی ہی میں شادی کرنا چاہتا ہے، خاندان
 کی پچھان منسوب بھی ہیں اور کنواری بھی، اس لئے ہم نے سوچا کہ ذون کی شادی حنا سے کر دی جائے۔“
 شا جہانی نے رک کر زیدین کی طرف دیکھا، کہ شاید وہ کچھ کہے مگر زیدین نے کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں کیا۔
 ”حنا خاندان کی بیٹی ہے بیوہ اور تباہی اسے بے سہارا نہیں چھوڑا جاسکتا، پھر دعا کو تم دونوں بھائیوں سے
 زیادہ کون پیاروے سکتا ہے، تم چونکہ اپنے انکار پر اٹل ہو تو ہم ذون کے متعلق سوچنے لگے ہیں کیا کہتے ہو تم اس
 معاملے میں؟“ چچا جانی نے شا جہانی کی بات آگے بڑھائی۔
 ”آپ لوگ مجھے اطلاع دے رہے ہیں یا مشورہ لے رہے ہیں؟“ زیدین چند لمحوں کے توقف کے بعد

سنجیدگی سے بولا۔

”مشورہ ہے زیدین! آخر کو حتمی فیصلہ تم ہی نے کرنا ہے۔“ تائی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
 ”نہیں پھپھو! فیصلہ میں نے نہیں ذون نے کرنا ہے جو وہ چاہے گا وہی میرا بھی فیصلہ ہوگا لیکن آپ سب کو
 بھی اس کے فیصلے کو تسلیم کرنا ہوگا۔“ زیدین نے سب کی طرف فردا فردا دیکھا۔
 ”ذون اس رشتے پر راضی ہے تم اپنی بات کرو۔“ زوبیہ جانتی تھیں کہ زیدین جو کہے گا ذون انکار نہیں کرے
 گا، اور زیدین ذون کی پسند کو نالے گا نہیں، اس لئے فوراً ذون کی رضامندی کا شوشا چھوڑا تا کہ زیدین کے لئے
 انکار کی گنجائش نہ رہے۔

”اچھا تو ذون راضی ہے یہ خبر سب سے پہلے آپ کے چینل نے نشر کی ہے۔“ زیدین کا انداز طنز و تمسخر سے
 بھر پور تھا، وہ زوبیہ کو پھپھو یا آنٹی کچھ کہہ کر بھی مخاطب نہیں کرتا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے وہ اسے مخاطب کرتا ہی نہیں
 تھا، نہ ہی ان کی بات کا جواب دینا ضروری سمجھتا اور اگر کبھی غلطی سے مابین کوئی بات ہو بھی جاتی تو وہ ضرور کئی ماہ
 تک سلگانے کے لئے کافی ہوتی۔

”ذون نے خود مجھ سے اس رشتے کے لئے خواہش ظاہر کی ہے، اسی لئے تو میں راضی ہوئی ہوں ورنہ میری
 حنا کو رشتہ کی کیا کمی ہے؟“ زوبیہ اپنی بیٹی اور اپنا سراونجار کھنے کے لئے جھوٹ پر جھوٹ گڑھے جا رہی تھیں۔

”اوہ... ذون نے خواہش کی ہے تو ٹھیک ہے اگر ذون اپنی خواہش میرے سامنے بھی کر دے تو مجھے بھلا

www.paksociety.com
کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ زیدین نے ہاتھ گنگن کو آڑی کیا کے مصداق دو ٹوک انداز میں کہا اور ذون کو بلانے کے لئے انٹرکام پش کر دیا۔

”زیدین! میرا خیال ہے اس بات کو جلدی سے نمٹا دیا جائے“۔ چچی جان عجلت سے بولیں۔
”جی چچی! میں خود یہی چاہتا ہوں اس لئے تو ذون کو بلوایا ہے جو بھی فیصلہ ہونا ہوگا ابھی اور اسی وقت ہوگا۔“
سب کو زیدین کے انداز عجیب سے لگ رہے تھے، لیکن وہ خاموشی سے اس کے ہر اگلے اقدام کے منتظر تھے چند لمحوں بعد ذون ان میں شامل تھا۔
”ذون! تمہیں موقع دیا جاتا ہے کہ تمہاری جو بھی خواہش ہو وہ عدالت میں بیان کرو۔“ زیدین کا انداز تلخی سے بھری شوخی میں ڈوبا ہوا تھا ذون نے حیرت سے بھائی کو دیکھا، زیدین نے اسے آنکھ کے اشارے سے اصل بات بتا دینے کا عندیہ دیا۔

”ذون! بات یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں تمہاری شادی حنا سے کر دی جائے۔“
”جی.....“ شاہجہانی کے کہنے پر ذون بوکھلا گیا یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، اگھر زوبیہ اپنے جھوٹ کا پول کھل جانے کے خیال سے بوکھلا گئی تھیں۔
”جلدی بولو ذون! عدالت کا وقت بہت قیمتی ہے۔“ زیدین سابقہ انداز میں کہتا ذون کو دو ٹوک بات کہنے کا حوصلہ بھی دے رہا تھا۔
”لالہ! میں.....“

”مجھ سے نہیں شاہجہانی سے بات کرو۔“ زیدین نے ذون کو ٹوک دیا، ذون چند لمحے خاموش رہنے کے بعد گویا ہوا۔
”شاہجہانی! میں بھابی سے شادی نہیں کر سکتا۔“
”کیوں کیا برائی ہے حنا میں؟“ چچی جان نے اگین وہی سوال کیا جو زیدین سے بھی کیا جا چکا تھا۔
”کوئی خرابی نہیں لیکن میں شادی کر چکا ہوں۔“ ذون نے زیدین کی موجودگی میں حوصلہ پاتے ہوئے آرام سے جواب دیا۔

”ہمیں معلوم ہے کہ تم نے شادی کی تھی لیکن وہ اب ختم ہو چکی ہے تمہیں حنا سے دوسری شادی کرنا ہوگی۔“
”تانیہ ذون کی کم عقلی پر گھر گئے ہوئے بولیں۔“
”جی میں نے عرض کیا ناں میں دوسری شادی بھی کر چکا ہوں۔“

”کیا.....؟“ ذون کی بات پر سب کو ہی جھٹکا لگا، لیکن زوبیہ تو اپنی جگہ سے ہی اچھل پڑیں واحد زیدین تھا جس کے اطمینان میں چنداں برابر فرق نہیں آیا تھا۔

”یہ کیا مذاق ہے ذون تم نے کب شادی کی ہے؟“ شاہجہانی غصے سے بولے۔

”شاہجہانی دو دن پہلے ایک سا وہی تقریب میں۔“

”کس کے ساتھ کی ہے اور کس کی مرضی سے کی ہے۔“ شاہجہانی اس کی بات کاٹ کر بولے۔

”شاہجہانی لالہ کی مرضی سے کی ہے۔“ ذون کے انکشاف پر شاہجہانی کا غصہ حیرت میں بدل گیا۔

”زیدین! یہ سب کیا ہے؟“

”شاہجہانی! ذون، عدویہ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور عدویہ سادگی سے شادی کے حق میں تھی اس لئے میں نے چند دوستوں اور حویلی گئے بچوں کی موجودگی میں ان کی شادی کرادی۔“ زیدین اطمینان سے بولا وہ دہی

جانے سے قبل یہ فریضہ انجام دے چکا تھا۔

”تو کیا ہم اس قابل نہیں رہے تھے کہ ہمیں بتانا بھی گوارا کیا جاتا؟“ شاہجہانی دکھ سے بولے جبکہ باقی سب گم صم سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

”شاہجہانی کیا آپ نہیں جانتے کہ میرے ہر فیصلے کے پیچھے محرک کیا ہوتا ہے، کیا اب مجھے آپ کو بھی اپنے ہر عمل کی تاویل دینا ہوگی۔“ زیدین نے الٹا الٹی سے شکوہ کر ڈالا شاہجہانی نرم پڑتے ہوئے بولے۔

”زیدین! ہمیں ذون کی شادی پر اعتراض نہیں لیکن یہ طریقہ درست نہیں۔“

”شاہجہانی! اس حویلی میں اب تک کیا درست ہوتا آیا ہے جواب ہم نے کچھ غلط کر دیا جہاں سازشوں پر سازشیں ہو رہی ہوں، وہاں خوشیاں عام حالات سے ہٹ کر خوش کر سکتی ہیں، آخر کب تک ابوزر فیملی غلط فیصلوں کے بوجھ اٹھاتی رہے گی، زیدین کو غافل سمجھنے والے جان لیں کہ نہ صرف زیدین نے آنکھیں کھول لی ہیں بلکہ اپنی فیملی کے تحفظ و بقاء کے لئے کمر بھی باندھ لی ہے اب ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا، کیونکہ زیدین اب کوئی مقدمہ مارے گا نہیں۔“ زیدین، زوبیہ اور اس کے شوہر کو زہریلی نگاہوں سے دیکھتا باہر نکل گیا، زوبیہ اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں، آج پہلی بار انہوں نے اپنی مرضی کے خلاف ہونے پر شور نہیں مچایا تھا، شاید اب وہ ہمت ہار بیٹھی تھیں۔

☆☆☆☆

کوئی موسم ہو

تیری یاد سے اس یاد کو آباد رکھتے ہیں
عناس ایک جذب کے عالم میں آنکھیں بند کئے اس نظم سے سرور حاصل کر رہی تھی زیدین نے جاتے جاتے اپنے دل کی پکار کو ایک کاغذ میں منتقل کر کے اس کے حوالے کر دیا تھا، عناس اس نظم کو ہزار بار پڑھ چکی تھی اس نے وہ کاغذ اپنے لاکٹ کی ڈبیا میں رکھ لیا تھا، گویا وہ زیدین کی نشانی کو اپنے سینے پر سجائے ہوئے تھی۔

زیدین کے متعلق اس کے دل میں جو بدگمانی بھی اب اس کا عشرِ عشیر بھی اس کی سوچ میں نہ تھا، نجانے زیدین کونسا منتر پڑھ گیا تھا کہ وہ ایک ہفتے میں زیدین کے دس سال سے زیادہ کا سفر طے کر گئی تھی اب زیدین اس ڈگر پر تنہا نہیں تھا، بلکہ وہ اپنا مقدمہ پاچکا تھا، وہ اپنی رباعی نکل کر چکے تھے۔

”ذون! میں بہت خوش ہوں۔“ ضمیر کے اچانک اچھل کر کہنے پر سبھی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کیوں کیا ہوا ہے تمہیں؟“ حمزہ نے استفسار کیا۔

”وہ اس لئے حمزہ کہ دیکھو حویلی کے اتنے بزرگوں کے بغیر ہماری پارٹی کوالالہ نے اسپیشلی الوائٹ کیا تھا، اور نکاح میں شریک کیا تھا ہاؤ اینجن جہاں ہم سے ہر بات چھپائی جاتی ہے وہاں چھپ کر کرنے والے کام میں ہمیں شریک کر لیا گیا۔“ وہ سب اس وقت ذون اور عدویہ کے بیڈروم میں قبضہ کئے ہوئے تھے آج شاہجہانی کی اجازت سے باقاعدہ طور پر عدویہ ذون کے کمرے میں منتقل ہو گئی تھی کل ان کا ولیمہ انتہائی شاندار طریقے سے منانے کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں بچہ پارٹی ان دونوں کو گھیرے بیٹھی تھی جن کی موجودگی سے ذون دل ہی دل میں خائف تھا، مگر چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ لئے بیٹھا تھا۔

”ہاؤ سیڈ صفو! تم نے آج تک کسی نکاح میں شرکت نہیں کی۔“ حارث کا تمسخرانہ انداز میں بولا۔

”یہ بات نہیں سے میرا مطلب تھا کہ.....“

”اس کا مطلب تھا کہ آج تک بیچاری نے نکاح کے چھوہارے تک نہیں کھائے، کہاں اتنی عزت مل گئی کہ

نکاح کی دعوت دے دی گئی، حالانکہ نکاح میں حویلی کے بورڈھے خادم بھی شریک تھے۔ تیمور صغیرا کی بات کاٹ کر حارث کے تمسخر پر مہر ثبت کرتے ہوئے بولا۔

”ایک تو ان جنگلیوں کی موجودگی میں بات کرنا ہی محال ہے۔“ صغیرا ہتھیار پھینکتے پھینکتے بھی چوٹ کر گئی نتیجتاً سب ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔

”اوہو..... ہم جنگلی ہیں تو ہماری کزن کیا ہوئی؟“ حارث نے عورتوں کی طرح سے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

”اوہو..... حارث یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے اس نے ہم سب کو جنگلی کہا ہے اور ہم سب میں زوار بھی شامل ہے اور زوار جنگلی کسی جنگل ہی متکلیں کرے گا۔“ حمزہ نے جنگل پر خاص زور دیا جو خالص اس کی ایجاد کردہ اصطلاح تھی جو یہ اور عدویہ نس نس کر رہی ہو گئیں۔

”جی بالکل بجا فرمایا حمزہ! تم جنگلی ہو تو پھر تمہاری منگیت لیلیٰ بھی جنگل ہوئی۔“ صفو نے حمزہ کی دکھتی رنگ پر ہاتھ رکھا۔

”جی نہیں لیلیٰ! ایسی نہیں ہے، میں نے برادری سے مخالفت کر کے جنگلیوں کے بجائے یریوں کے خاندان سے شتہ کیا ہے۔“ حمزہ لیلیٰ کی حمایت میں فوراً بولا جو بالیلی نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

”زوار! اس نے اپنی منگیت کا فوراً دناع کیا اور تم نے کچھ بھی نہیں کہا۔“ صغیرا نے اپنا رخ زوار کی طرف کر کے شکوہ کیا۔

”چھوڑو صنو! ان کو اپنی شناخت زبان سے بول کر کرانی پڑتی ہے، جبکہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے، چاند کو کوئی گرہن لگا جتنا ہے، کوئی داغ نما لیکن چاند تو چاند ہی رہتا ہے۔“ زوار کی بات نے سب کو حیران کر دیا، حمزہ اور لیلیٰ کا تو سب کو پتہ تھا کہ آپس میں لڑتے نہیں ہیں لیکن زوار اور صغیرا تو نہر کے دو کنارے تھے مگر آج ان کا یہ اتحاد اچھا بھی لگا اور نیا بھی یہی وجہ تھی کہ کسی نے مزید کوئی گولہ نہیں پھینکا۔

”اچھا لڑا کا طیاروں اٹھو ذون کا نی مشکل سے ضبط کئے ہوئے ہے۔“ جو یہ نے ذون کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا، سب ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ سب کے جاتے ہی ذون نے اٹھ کر دروازہ بند کرنا چاہا تو عدویہ بول پڑی۔

”رہنے دو ذون! ابھی بہت وقت ہے ہو سکتا ہے بزرگوں میں سے کوئی آجائے تو اچھا نہیں لگے گا۔“ عدویہ نظریں نیچی کئے آہستگی سے بولی۔

”جو آئے گا خاموشی سے لوٹ جائے گا، ہم کیوں اپنا نقصان کریں۔“ ذون اس کی بات رد کر کے دروازہ لاک کر کے اس کے پاس بیڈ پر آن بیٹھا۔

”وہ ہمیں خیال تو گرنا چاہئے۔“ عدویہ کو شرم سی محسوس ہو رہی تھی کہ اتنی جلدی کمرے میں گھس کر لاک کر دیا جائے۔

”مائی ڈیئر! جب وہ اپنی بیویوں سے مصروف ہوتے تھے تو کیا ہمارا خیال کرتے تھے، مجھے تو تائی ماں کسی کی بھی شادی ہوئی سورج ڈھلتے ہی سلا دیتیں، تا کہ بچوں کا کانا تو نکل جائے۔“ ذون کی بات پر عدویہ کی ہنسی چھوٹ گئی مگر زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی رات اور حق کا جادو ذون کے سر پر چڑھ چکا تھا، جس جادو کے آگے کوئی بندش ٹھہرتی نہیں۔

☆☆☆☆

زیدین کا جذبہ عشق زیادہ قوی تھا، یا قوت فیصلہ کہنا دشوار تھا، ذون کے ولیہ میں عناس کی شرکت کے لئے راتوں رات دیئے گئے اس کے آرڈر اور فوری انتظامات کے نتیجے میں آج وہ حویلی کی رونق کا ایک حصہ تھی۔ ایئر پورٹ پر اترتے ہی زیدین سے محض نگاہیں علیک سلیک کے بعد تمام راستے وہ اس کی نگاہوں کے حصار میں رہی

تھی سنگل پر زیدین نے تازہ پھولوں کا بکے خرید تھا جس کے بارے میں عناس کو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اس کے لئے تھا، مگر زیدین کے پھول دینے کی ادا اس کے وہم و گمان میں نہ تھی گاڑی سے اترتے ہی زرد پھول عناس کی گردن سے آن کر آیا جسے زیدین نے اس کی غرور و تفاخر سے آزاد، عاجزی و انکساری سے بھرپور گردن کے نام کیا تھا، رانیہ اور جہانگیر کے پیچھے ست قدموں سے چلتی گلابی پھول کے اپنے گال سے نکراتے ہی اس نے تمام لیا، اس پھول نے بھی زیدین کی طرح اس کے عارض گلابی کر دیئے تھے، زیدین اس سے چند قدم کے فاصلے پر بظاہر صہیب اور شہوار سے بات کرتے ہاتھوں میں کھلا ہوا بکے پکڑے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اب کے نیلا پھول اس نے عناس کی آنکھوں کے سپرد کیا تھا، کیونکہ بارہا اس نے عناس کی آنکھوں کے نیل سمندر میں اپنی شبیہ تیرتی دیکھی تھی۔

”النور حویلی“ کے افراد خانہ جو اس کے استقبال کے لئے قریب آتے جا رہے تھے، ان سے بچ بچا کر زیدین نے سرخ پھول عناس کے ہونٹوں کو چھونے کے لئے اچھال دیا، جن کی چاشنی زیدین نے صرف تصور میں تسمیٹی تھی۔ عناس ہر پھول کو زمین پر گرنے سے قبل تمام لیتی تھی، سب سے گلے ملتے حال احوال بتاتے بھی وہ ان پھولوں کو تھامے رہی، زیدین جو ذرا ہی فاصلے پر شاہجہانی کے ساتھ تخت پر جا بیٹھا تھا، ان کی نگاہیں عناس کا طواف کئے جاتی تھیں، بیک پارٹی کے اسے ساتھ لے جانے کے مرحلے میں اس نے زیدین کے پاس سے گزرتے یہ تمام پھول اس کے سمیٹی جذبات کی نذر کر دیئے تھے زیدین پر آگرنے والے پھولوں نے ایک معنی خیز مسکراہٹ سب کے لبوں پر سجادی، اب کی بار عناس بازی لے گئی تھی۔

☆☆☆☆

”النور حویلی“ آج پھر ہنگاموں اور رونقوں سے جگمگا رہی تھی، ابو زراہ کے دونوں صاحبزادے بمعہ اپنی بیگمات کے پہلی بار تمام اہل حویلی کے ساتھ شوخیوں میں شریک تھے، آج تو زیدین کے انداز بھی محفل کا مزہ دو بالا کئے ہوئے تھے، ذون تو دولہا کی حیثیت سے بلیک تھری پیس میں ملبوس تھا، زیدین نے بھی بلیک شیروانی زیب تن کی تھی، وہ لباس کے معاملے میں ہمیشہ مخصوص اشاکل ہی رکھتا تھا، بلیک ڈریس، پینٹ وائٹ شرٹ و ہاف سیلیویس اوپر شارٹ سی بلیک وائٹ یہ اس کا مخصوص لباس ہوتا تھا، آج پہلی بار اسے شیروانی میں دیکھ کر بچہ پارٹی نے برملا کہا تھا، کہ بازی لالہ نے ناریلی تھی مگر ذون نے برا قطعاً نہیں منایا کیونکہ وہ خود بھی اس بات کا قائل تھا۔ عدویہ آف وائٹ شہزادہ پہنے سج رہی تھی، تو عناس نے بھی پہلی بار دل و جان سے خود کو سنوارا تھا، ہر بک اشاکل میکسی جو بظاہر وائٹ تھی مگر لمبی شیڈ زدی تھی باریک جالی دار اسکارف لئے ہیوی ڈائمنڈ جیولری میں کلوپترا نظر آ رہی تھی زیدین ارد گرد کی پرواہ کئے بغیر آج اسے بھرپور استحقاق سے نکلے جا رہا تھا، کئی بار گزرتے گزرتے ہاتھ چھو لیتا اور لبوں کی شیب تو نجانے کیا کیا پیغام دے رہی تھی جو عناس کو شرم سے سرخ کئے اس کے حسن کی شاعموں کو اور بھی تابندہ کر رہے تھے۔ اس کپل کے جادوئی اثر سے حاضرین محفل بھی خالی نہ تھے، چک پارٹی نے زیدین اور عناس کو برابر کھڑا کر کے ان کے ارد گرد بھنگڑے ڈالنا شروع کر دیئے تھے، ذون بھی اس سٹیج سے اتر کر ان کے ساتھ شریک ہو گیا تھا، شاہجہانی نے اس منظر کو دیکھ کر جہانگیر اور رانیہ سے رخصتی کی فرمائش تک کر دی تھی مگر زیدین نے عناس کو مزید وقت دینے کے خیال سے حویلی میں رکنے کا تو عندیہ دیا، مگر رخصتی کروا کر اپنے ساتھ لے جانے سے فی الوقت گریز کیا۔ آج تو اہل حویلی نے زیدین کے نکاح کی سادگی کا تمام بدلہ چکا دیا تھا، وہ ہنگامہ ہوا کہ حد نہیں آخر میں شاہجہانی، صہیب جاہ، چچا، چچی تانہیہ ان کے شوہر بھی بھنگڑا ڈالنے میں شریک ہو گئے، تانی باں بھی بیماری کے سبب کرسی پر بیٹھے تانیاں کھتی رہیں۔ عناس کی حالت غیر تھی، جذبات کی

شوریدہ سری نے پہلے ہی بڑھال بڑھال کھا کھا کر زیدین کے برابر کھڑے ہو کر باپ اور سب کا سامنا کرنا اسے اور بھی دشوار ترین لگ رہا تھا، وہ تو ذون اور عدی کے ولیمہ کے لئے آئی تھی مگر زیدین نے خود اسی کو دلہن بنا ڈالا تھا، رانیہ اور جہانگیر کے مطمئن چہرے دیکھنے کے باوجود اس کی حالت غیر تھی۔ اس ہنگامہ خیز محرک کے پیچھے زیدین کے دماغ میں کچھ اور بھی تھا، وہ حنا کو شاک پر شاک دینا چاہتا تھا، اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا، وہ حناس کی آمد کا سنتے ہی اپنے باپ کے فلیٹ پر چلی گئی تھی اور اس چراغاں سے جھلس کر زوبیہ بھی فنکشن چھوڑ کر جا چکی تھی، اگر چہ تائی ماں کو اس بات کا بہت قلق تھا کہ حنا رجبہ کو بھی کچھ بھی ہو وہ اپنے خاندان کی لڑکی تھی اس کا یوں بے آماں رہ جانا انہیں دکھ میں مبتلا کر رہا تھا، لیکن زیدین نے انہیں مختلف تاویلات سے مطمئن کر دیا تھا۔

☆☆☆☆

رات بھر کے فنکشن کے بعد علی الصبح رانیہ اور جہانگیر کا روبرو باری معاملات کی بناء پر حناس کو حویلی ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ وہ سب سے پہلے تھے، تھیں، تھیں، وہ مسلسل رونے میں مصروف تھی، اسے لگ رہا تھا کہ پری پلین نکاح کی طرح پری پلین رخصتی بھی ہو گئی تھی وہ بھاری سر کے ساتھ تائی ماں کے ساتھ بیٹھی کچھ انہونی ہو جانے کے خیال سے خوفزدہ تھی، مگر جب زیدین کی ایما پر لپٹی نے اسے اپنے کمرے میں جانے کی آفر کی تو اس کی جان میں جان آئی۔ رفتہ رفتہ تقریب اختتام پذیر ہوئی سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے، زیدین ہنوز تنہا ہال میں موجود تھا، آنکھوں میں بینڈ کا شائبہ تک نہ تھا، زندگی کے سب سے اہم موقع پر اپنے پیاروں کی یادیں تڑپا دیتی ہیں اور پھر ناگہانیوں اور غیر طبعی جدا ہونے کے ناگ تو ساری عمر ڈستے رہتے ہیں، کہاں سے چلا تھا اس کا کارواں اور کہاں آ کے رکھا تھا، دل میں برپا طوفان سے نبرد آزما وہ صوفے پر ہی دراز ہو گیا تھا، جانے سویا تھا یا جاگا تھا اس کے بوجھل دماغ کو یاد نہیں آ رہا تھا، ایک گہری پرسکون نیند کی حسرت شدت سے پیدا ہوئی تھی کوئی راہ بھائی نہ دی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا، نجانے کون سے دھیان میں چلتا رہا، قدم رکے تو اپنی بے اختیار پری لارج آئی، وہ لپٹی کے کمرے سے واپس لوٹنا چاہتا تھا مگر ہاتھ نے کب دروازے پر دستک دے دی اسے علم نہ ہو سکا۔

”کون“ لپٹی کی بینڈ سے بوجھل آواز کے ساتھ ہی دروازہ وا ہوا وہ اسے بسانے دیکھ کر نہ تو چونکی اور نہ آدکا مقصد معلوم کیا، خاموشی سے ایک سائینڈ سے نکل گئی، زیدین اس کی تابعداری برزنی سے مسکرایا، کمرے میں داخل ہوتے ہی زیدین کے بوجھل دماغ کی ایک کڑکی وا ہوئی وہ ملکہ جان وول بے خبر سوئی ہوئی تھی اس کی نیند اتنی گہری ہوئی تھی کہ جب تک وہ خود نہ جاگتی اسے کوئی اٹھا نہیں سکتا تھا۔ زیدین کو نخرہ رانی کی معصوم نیند پر پیار آ گیا، پہلے اس نے سوچا کہ لوٹ جائے اگر اس کے نصیب میں نیند نہیں تھی تو دوسروں کی نیند خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی، مگر دل بے ایمان تھا کہ آج اپنی ہی منوائے جا رہا تھا۔ زیدین نے دھیرے سے حناس کا ہاتھ چھوا حناس کو کیا اثر ہوتا اس کے پاس بیٹھ کر زیدین نے اس کے چہرے پر شہادت کی انگلی پھیری، اس کا ہرٹس بے قرار کئے دے رہا تھا، کبھی وہ بند آنکھوں کو انگلی سے چھوتا تو کبھی ناک کو دایمیں بائیں حرکت دیتا، سرخ رس چھلکتے لبوں سے خود کو باز رکھنے کے باوجود وہ ہاتھ سے ذرا سا بچ کر اٹھا مگر شاید کوئی الارم تھا جو اس کے لبوں کو چھوتے ہی اس کے اندر بج اٹھا وہ کسمسانے لگی، آنکھیں بند کئے خود کو بیدار کرنے کے لئے اس نے انگڑائی لینے کے لئے ہاتھ اٹھائے، مگر زیدین کے بھاری وجود سے نکراتے ہی ہاتھ نے اس کی نیند کو سوں دور بھگا دی، وہ پٹ سے آنکھیں کھولتی جھٹ سے اٹھ بیٹھی۔

”آپ... آپ یہاں...“ اچھا خاصا بے فکر ہو کر زوبیہ بھی سوئے سوئے یہ کیا آفت آن پڑی، اسے لگا

کہ کہیں زہدین اسے اٹھا کر اپنے بیدروم میں تو نہیں لے آیا مگر غور سے دیکھنے پر یلی کا کمر اسی پا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

”سوری میں نے تمہاری نیند خراب کی مگر مجھے بھی نیند کے لئے ٹریکولائزر چاہئے تھی“۔ بغیر اسکارف کے کھلے بالوں اور مسٹے ہوئے کاٹن کے سادہ سوٹ میں اس کا حلیہ زیدین کی شوخی جگانے کے لئے کافی تھا، وہ اس کی نگاہوں کی بے باکی پر خود میں سمٹنے لگی اور نظر دائیں بائیں دوڑنے کی تلاش میں دوڑائی، زیدین نے اس کی جھجک سمجھتے ہوئے اپنے کاندھے سے اسٹول اتار کر اس کے ارد گرد اچھی طرح اوڑھادی، عناس کو تحفظ کا احساس شدت سے ہوا۔

”میرے پاس ٹریکولائزر نہیں ہے ان فیکٹ میرے پاس تو کوئی بھی ٹیبلٹ نہیں ہے“۔ وہ زیدین کی بات کی گہرائی کو سمجھے بغیر سادگی سے جواب دینے لگی، زیدین کی مسکراہٹ بو جھل دماغ کے لئے ایک اور خوشگوار جھٹکا ثابت ہوئی۔

”تمہارے پاس تو ہر مرض کی دوا ہے میرے“۔ میرے پر زور دیتے ہوئے زیدین نے اس کے ہاتھ سے ماتھا لٹکرایا تھا، عناس کو ویسے ہی بات مشکل سے سمجھ آتی تھی اور اب تو جی نیند سے اٹھی ہوئی تھی کیا خاک بے بڑتا۔

”عناس! میں سونا چاہتا ہوں گہری اور پرسکون نیند مجھے سلا دو“۔ زیدین کی آواز جذبات سے بو جھل تھی یا نیند کے اثر سے وہ سمجھنے سے قاصر تھی، لیکن اپنے گھٹنے پر دھیرے زیدین کے سر پر اس نے دھیرے سے ہاتھ رکھا تھا، اور نئے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی تھی۔

”آپ کو نیند کیوں نہیں آتی؟“ اس نے دھیرے سے سوال کیا کہ مبادا اگر وہ سونو گیا ہو تو جاگ نہ جائے۔

”کیونکہ تم میرے پاس نہیں ہو“۔ زیدین کا محبت کی چاشنی میں ڈوبا وارفتہ لہجہ اسے سحر میں گرفتار کر رہا تھا، وہ غیر محسوس انداز میں اس کے بستر پر نیم دراز اس کی گود میں سر رکھے ہوئے تھا اور وہ اپنی پوزیشن سے لاعلم محض اس کی پرسکون نیند کی خواہاں تھی۔

”میں دیر بھی تو نہیں ہوں“۔ عناس کی سرگوشی نے زیدین کے بو جھل دماغ کے سارے تانے بانے ڈھیلے کر دیئے، اسے لگا وہ ٹھنڈی بہتی آبخار میں بھیکتا جا رہا ہو۔

”عناس! میری جاہت بے تاب ہے تو تمہارے رنگ بے شمار ہیں، کیا ایک زندگی کافی ہوگی اس رشتے کا حق ادا کرنے کے لئے“۔ زیدین نے جذب سے کہتے ہوئے عناس کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے اس نے بلا توقف اپنے ہاتھ میں لے لیا، زیدین نے اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں انگلیاں الجھا کر کہنیاں کھڑی کر دیں، اب ان کے ہاتھوں کا سنگم ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

”عناس! ان بند ہاتھوں سے کیا نتیجہ اخذ کرتی ہو؟“ زیدین نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا، عناس نے نفی میں سر ہلا کر تم نہی کا اعتراف کر لیا۔

”ان ہاتھوں کے ملاپ میں تمہاری اور میری قسمت کی لکیریں ہیں، ان بندھے ہاتھوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تمہاری لکیریں علیحدہ اور میری علیحدہ ہیں، عناس جب تک یہ ہاتھ جڑے رہیں گے ہماری تقدیر خواہ اچھی ہو یا بری ایک ہوگی ان ہاتھوں کی یکجائی سے ہماری تقدیر وابستہ ہے عناس“۔ زیدین نے دھیرے دھیرے اس کے کان میں امرت گھولا اور اپنے ہاتھ میں مقید عناس کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے، عناس نے کیفیت اگلیں سرور کے تحت آنکھیں ہونڈ لیں، زیدین کی آنکھیں بھی بو جھل ہونے لگیں تا معلوم

نیند سے کہ سن پسند ٹریڈ لائزر سے۔

خود کو خود ہی تنبیہ کرتا زید بن عناس کے ماتھے پر گرم نرم ہونٹ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا وہ کب کا جاچکا تھا اور کب حویلی میں دن کی شروعات ہوگئی تھی مدہوش عناس کو کچھ خبر نہ ہو سکی۔

☆☆☆☆

”اوہ چھوٹی سی دلہن آئی ہے“ عناس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی عدویہ چپک کر بولی اور بڑھ کر اس کو گلے لگایا۔
”جی ہاں بڑی سی دلہن کے پاؤں کی تو مہندی ہی نہیں سوکھ رہی، اس لئے ہم خود چلے آئے“ عناس کی بات پر عدویہ ہنس پڑی۔

”اللہ کرے جلد ہی تمہارے پاؤں پر مہندی سج جائے“ عدویہ نے معنی خیزی سے کہا عناس ایسی باتوں پر لا جواب ہو جاتی تھی۔

”اچھا بیٹھو بتاؤ بیوگی کیا؟“

”اوہ عدوی آپا! اتنا تکلف میں عناس ہوں وہی پرانی عناس“

”نہیں عناس! اب تم پرانی نہیں رہی ہو تم تو بہت نئی ہوگئی ہو ابو زور کی بڑی بہو، زید بن کی محبوب بیوی ابھی تو تمہاری شادی پر چراغاں ہوگا، دیکھنے لائق ہوگا لاہوری بسنت بھول جائیں گے“

”عدوی آپا! ابو زور ماموں بھی کیا ان کی طرح ہی تھے“ عناس کے سوال پر عدوی پھر سے کھلکھلا اٹھیں۔
”نہیں تایا ابو ان کی طرح نہیں بلکہ یہ ان کی طرح ہیں“ عناس اپنی محس فطرت کے باعث سوال کرنے سے رکتی نہ تھی مگر مزاج کی خصوصیت سوال میں جھٹک اٹھتی تھی۔

”عدوی آپا! وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”عناس! زید بن کی خوش قسمتی دیر سے سہی لیکن آئی بہت زبردست طریقے سے ہے“ عدویہ کی شرارت برقرار تھی، اب کی بار عناس خاموش رہی کوئی استفسار نہیں کیا۔

”عناس! زید بن تمہیں بہت جاہتا ہے اس کی قدر کرنا“

”مجھے پتہ ہے“ عدویہ کے کہنے پر وہ جھٹ سے ادا کے ساتھ بولی۔

”اچھا تمہیں کیسے پتہ؟ الہام ہوا ہے“ عدوی کا موڈ کافی خوشگوار تھا وہ بات سے بات نکال رہی تھی۔
”نہیں انہوں نے دل میں الہام کیا ہے“ اب کے عناس بھی دو بدو بولی دونوں کی کھلکھلا ہنسی ماحول میں شگوفے کھلا رہی تھیں۔

”عدوی آپا! ماموں کی بات ہو رہی تھی، کیا آپ بھی دوسروں کی طرح اس چپک پر بات نہیں کریں گی“
عناس کی سوئی جہاں انک گئی سوانک گئی۔

”ارے نہیں میں کیوں چھپاؤں گی تایا ابو کے بارے میں، میں خود زیادہ نہیں جانتی“

”عدوی آپا! ای انہیں شہید کیوں کہتی ہیں کیا وہ آری میں تھے“ عناس جھٹ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ نکا کر ہمتن گوش ہوتے ہوئے بولی۔

”عناس! ابو زور تایا کا مرڈر ہوا تھا۔

”کیا.....“ عدویہ کے انکشاف پر عناس سن ہوگئی۔

”ہاں عناس ادا ابو نے تمام تر کاروباری اور زرعی معاملات تایا ابو کے سپرد کئے ہوئے تھے وہ بہت معاملہ

فہم اور زید کی طرف سے زید بن کی طرح۔ عدی نے ذرا سا توقف کر کے اس کے تاثرات نوٹ کرنے چاہے مگر اسے منہمک پا کر مزید کہنے لگی۔

”تایا ابو ابروڈ سے بزنس ٹریننگ لے کر آئے تھے، اس لئے سب معاملات وہ ہی سنبھالتے تھے، مگر نہایت دیانتداری سے پرائٹ سب میں یکساں تقسیم کرتے، لیکن زویہ پھپھو کے شوہر احمد کو شادی کے بعد بزنس میں شریک کیا گیا، وہ اپنی فطرت کے مطابق لین دین میں گڑبڑ کرتے جس کی بناء پر آئے دن تایا ابو اور ان میں ٹکرا رہتی حویلی کا ماحول ان دنوں بہت کشیدہ رہتا تھا، یہ تائی ماں نے مجھے بتائی ہیں، جن سے حویلی میں کم ہی لوگ واقف ہیں زید بن اور زویہ پھپھو میں ان بن وہیں سے شروع ہوئی تھی، اس سے آگے مجھے علم نہیں بس اتنا پتہ ہے کہ ایک دن تایا ابو اور تائی ماں شاپنگ کے لئے گئے تھے کہ شاپنگ سینٹر سے باہر نکلتے ان پر کسی نے چاقو سے وار کر کے قتل کر دیا، تائی ماں نے چونکہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے وہ ذہنی توازن کھو بیٹھیں۔“

عدویہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوئی تو عناس نے پریشان نظروں سے دیکھا۔

”ماموں کو قتل کس نے کیا تھا؟“

”معلوم نہیں اگر یہ معلوم ہوتا تو زید بن اسے کب کا پھانسی چڑھا چکا ہوتا۔“ عدی کا لہجہ سادا تھا۔

”لیکن عدی آیا! انہوں نے کچھ تو کیا ہوگا۔“

”کہنوں نے۔“ عدی اس کا اشارہ سمجھ کر شرارت سے بولی۔

”عدی آیا۔“ عناس جھینپ گئی تھی۔

”ویسے زید بن عجیب انسان ہے ضد اور محبت کا سنگم جو اس نے کیا ہے کوئی نہیں کر سکتا۔“ عدویہ یونہی اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی عناس جو اس کی ہر بات بغور سن رہی تھی چونک اٹھی۔

”کیا مطلب عدی آیا! یہ ان اور محبت کا سنگم کیا بات ہوئی؟“

”کچھ نہیں عناس میں جھپٹی بات کر رہی تھی۔“ عدویہ کا انداز ٹالنے والا تھا، عناس فوراً اس کا انداز بھانپ گئی اور عدویہ کا ہاتھ پکڑ کر مسکینی صورت بنا کر بولی۔

”عدی آیا! آپ کو پتہ ہے جب کوئی بات مجھ سے چھپائی جاتی ہے تو میرا کیا حال ہوتا ہے؟ تمام رات میری کروٹ بدلتے گزر جاتی ہے آپا پلیز بتائیں ناں۔“ عدویہ کو منہ کھولتے دیکھ کر عناس نے پلیز پلیز کی رٹ لگا دی عدویہ زچ ہو کر بولی۔

”عناس! نہ تو میں کچھ چھپا رہی ہوں اور نہ ہی کوئی خاص بات ہے، سہیل سی بات ہے زید بن اور حنا۔ میں کبھی بنی نہیں ہے، وہ ہر بات میں متضاد ہوتے ہیں زید بن تمہاری طرف مائل تھا تو حنا تم سے ٹالاں بس زید بن اسے نارچ کرنے کا کوئی موقع مس نہیں کرتا۔“ عدویہ نے گرچہ مختصر اور ہی پرانی بات کہی تھی جو ساری حویلی جانتی تھی نئی تھی تو صرف عناس کے اندر کی تڑپتے دل کی صدا تھیں۔

”انہوں نے مجھ سے حنا آپنی کی ضد میں شادی کی ہے انہیں نیچا دکھانے کے لئے انہیں مجھ سے چاہت نہیں ہے میں ان کے انتقام کا حصہ ہوں، ان کے اندر کی نفرت کی آگ کو سرد کرنے کے لئے ایک مہرہ ہوں۔“ عناس کا دل کسی نے دہکتے کوبلوں پر رکھ دیا تھا جو جلتا ہی جا رہا تھا، رات گذشتہ نے جو پھول من آنکھن میں کھلائے تھے وہ اب کانٹے بن کر کانٹے حار سے تھے عدویہ کے ہلانے ہلانے کا اس پر چنداں اثر نہ ہوا وہ بھگی آنکھوں کے ساتھ اپنی دھن میں چلتی باہر نکل گئی۔

تمام رات عناس نے روتے ہوئے گزار لی تھی لیکن صبح اس کے بھاری پونے اور سرخ آنکھیں لیلیٰ کو فوراً متوجہ کر گئے۔

”کیا ہوا عناس! تم روتی رہی ہو کوئی بات ہوئی ہے عناس بتاؤ ناں۔“ لیلیٰ اس کے سر پر چڑھی اصرار کر رہی تھی عناس نے اسے بہت ٹالا مگر اس کے بار بار اصرار نے خود اس کے ضبط کا بندھن توڑ دیا، اور وہ لیلیٰ کے کندھے پر سر رکھ کر وہ روتی کہ لیلیٰ سے سنبھالنا مشکل ہو گیا، گھبرا کر لیلیٰ اسے روتا چھوڑ کر باہر نکل گئی اور کچھ ہی دیر میں وہ زیدین کو ہمراہ لئے لوٹ آئی، زیدین اسے یوں روتے دیکھ کر فوراً اس کے پاس آن بیٹھا اور اس کا جھکا سر اٹھا کر فکر مندی سے بولا۔

”عناس! کیا ہوا ہے؟ سب خیریت تو ہے؟“ وہ اس کا چہرہ تھامے گالوں کو دھیرے سے تھپک کر بول رہا تھا، جبکہ عناس زار و قطار رونے میں مصروف تھی۔

”عناس! کچھ بتاؤ تو سہی۔“ اس کے مسلسل رونے سے عاجز آ کر زیدین نے سخت رویہ اپنایا، اور اس کے گال چڑھا کر پھر پھر رونا دھونا بھول کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی کل تک جو چہرہ مہربان سا اپنا اپنا سا لگ رہا تھا آج اتنا پرایا اور اچھی لگ رہا تھا وہ ایک ننگ زیدین کے چہرے کو دیکھ رہی تھی لیکن زیدین کو اس کا اس طرح دیکھنا عجیب لگ رہا تھا، کیونکہ اس کی آنکھوں میں اور چہرے کے تاثرات میں کوئی نئی بات تھی۔

”عناس! رونا کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے اور نہ دوسروں کو الہام ہوتا ہے کہ تمہارے دل میں کیا ہے، اگر کسی نے کچھ کہا ہے یا تم نے خود الٹا سیدھا سوچا ہے تو بتاؤ تو سہی اپنے زیدین کو۔“ زیدین نے ترش و سنجیدہ لہجے میں کہتے اپنے زیدین میں خوب چاشنی گھولی تھی مگر عناس پر آج کسی بات نے کوئی اثر نہ کیا تھا، وہ بمشکل خود کو اسے گامی نظروں سے دیکھنے سے باز رکھ سکی۔

”مجھے ماما پاپا یاد آ رہے ہیں۔“
”اوہ.....“ زیدین نے گہرا سانس لیا لیلیٰ بھی ہلکی پھلکی ہو گئی وہ تو اس تمام وقت یوں سانس روکے ہوئے تھی گویا عناس اسی کی شکایت لگا دے گی۔

”تو یہ بات پہلے نہیں بتا سکتی تھیں؟ تو تمہاری ان سے بات کراؤں۔“ زیدین، عناس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے میں مدد دینے زنگنوں پر تھی وہ مسلسل روتی رہی سب یہی بھڑے تھے کہ ماں باپ کی جذباتی کوحسوس کر رہی تھی جبکہ زیدین کو اس کی نگاہیں نہیں بھولتی تھیں اس کا زیرک دماغ مسلسل پپ کر رہا تھا۔

☆☆☆☆

”حزہ بھائی!“

”جی بہن، بھابی۔“ حزہ نے مڑ کر اسی کے انداز میں کہا مگر رشتہ میں کنفیوژ ہو گیا۔

”بھائی! وہ ہنا آپ کی کہاں رہتی ہیں۔“

”بھائی پلیز! مجھے تنگ نہ کریں۔“ آج کل وہ ویسے بھی رونے کا بہانہ ڈھونڈتی تھی، جھٹ شروع ہو گئی حزہ گڑ بڑا گیا اس نے جان لیا کہ یہ صغیر یا لیلیٰ نہیں عناس ہے مذاق جس کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔

”عناس! میں مذاق کر رہا تھا ریلیکس پلیز آئندہ نہیں کروں گا اب چپ ہو جاؤ ناں۔“ حزہ منت سماجت کر رہا تھا، ظاہر ہے لالہ سے اچھی خاصی ڈانٹ پڑی تھی سے تصور میں دیکھ رہا تھا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،

جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

”کوئی بات نہیں بھائی! میں تو بس ایسے ہی آپ نے بتایا نہیں حنا۔ آپنی کا گھر کہاں ہے؟“ عناس اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر اپنا روٹا دھونا بھول گئی، سنبھل کر بولی۔

”تم جانا چاہتی ہو؟“

”ہوں.....“ عناس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آؤ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں تمہیں یہاں کے رستوں کا کہاں علم ہوگا۔“ حنزہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ حنا کا گھر تھا کہ جھونپڑی، ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا، جس میں سامان شاذ و نادر ہی تھا حسب معمول زوبیہ گھر پر نہیں تھیں، البتہ حنا موجود تھی ویسے بھی دعا کے قہے کے بعد وہ زیادہ وقت گھر ہی میں گزارتی تھی اب کالی حد تک اس کی تہی ہوئی گردن جھک گئی تھی مگر عناس کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک ٹمٹمنا دیا روشن ہو گیا وہ عناس کو لئے بیڈروم میں آگئی۔

”عناس! تم کب آئیں دہئی سے.....؟“ حنا جان بوجھ کر انجان بن کر بولی۔

”وہ آپنی! ذون بھیا کے دلیمہ پر آئی تھی آپ کیوں نہیں آئیں؟“ عناس ایسے بولی گویا کوئی جرم کر کے حنا کے سامنے شرمندہ ہو۔

”واٹ ذون نے شادی بھی کر لی؟“ یہ کہہ کر حنا نے اس پر اچھی طرح باور کر دیا کہ وہ حویلی سے نہ صرف بے دخل کر دی گئی ہے بلکہ وہاں ہونے والے ہر معاملے سے لاعلم بھی ہے۔

”کہیں تمہاری طبیعتی تو رخصتی نہیں ہو گئی؟“

”نہیں آپنی! میں تو بس کچھ دنوں کے لئے۔“ عناس مٹھنا کے بولی۔

”تو کیا تم سمجھ رہی ہو کہ تم واپس جاسکو گی؟“ حنا کا استفسار کرنا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

”عناس! یہ جو زیدین نام کا عفریت ہے اس سے بچ کے جانا اب ممکن نہیں انور حویلی کے قید خانے سے نکلتا اب ایک خواب سمجھو۔“ حنا کی مسٹری عروج پر تھی وہ عناس کے نازک دل پر ضرب پر ضرب لگا رہی تھی اس کے پتھر دل پر عناس کے چھا جوں برستے آنسوؤں کا ذرا بھر بھی احساس نہ تھا۔

”آپی! مجھ سے کئی ہو گئی میں ان کے برکاوے میں آگئی۔“ عناس اپنے کئے پر جو زیدین پر اکتاد کرنے کا جرم تھا اتنی شرمندہ تھی کہ اس کے آنسو تھمنے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ حنا کے اندر بھڑکی آگ پر جیسے کسی نے پانی ڈال دیا تھا وہ عناس کے ذریعے پھر سے گیم میں آگئی تھی فوراً عناس کے پاس جا بیٹھی اور چاہت کے خزانے لٹاتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔

”عناس! رو تو مت تم تنہا نہیں ہو میں نے تمہیں زیدین کے اصل چہرے سے پہلے ہی روشناس کرادیا تھا مگر تم اس کی سحر گری میں گرفتار ہو گئیں یہاں سب اس کے خریدے ہوئے غلام ہیں جو صرف اس کی مدح سرائی میں مصروف رہتے ہیں اس کے باوجود میں نے تمہیں اس سے جان چھڑانے کی ترکیب بھی بتائی تھی تم نے ہر وہ کام کیا جو وہ چاہتا تھا۔“ عناس کی ہمدردی سے اور بکھر گئی اس کا نازک دل بہت بری طرح سے ٹوٹا تھا وہ اپنے خالص جذبوں کی توہین پر جتنا ماتم کرتی کم تھا اور حنا اس کے غم میں اضافہ کئے جا رہی تھی۔

”لیکن عناس! اہمیت مت ہارو اطمینان سے قدم اٹھاؤ سنبھل کے چلو تمہاری بد قسمتی یہ ہے کہ تمہارا زیدین جیسے شاطر اور عیار کھلاڑی سے واسطہ پڑا ہے لیکن وہ جانتا نہیں ہے کہ عورت کی چالوں سے زیادہ خطرناک کوئی چال نہیں، عورت ایسا تیر سے جو کسی نشانے سے خطا نہیں ہوتا بس میرے کپن پر چلو۔“ حنا کی آنکھوں سے

www.paksociety.com
 چنگاریاں نکل رہی تھیں عنایت سے اس کی باتیں سن رہی تھی وہ زیدین سے بڑگان ضرورتی مگر اتنی شغف نہیں تھی
 کہ جیسے انتقامی جذبات کا شکار ہو۔
 ”عنا! ہم دونوں زیدین کی ستائی ہوئی ہیں وہ بد کردار شخص۔“

”نہیں آپ! وہ بد کردار نہیں ہیں۔“ حنا کے اچانک بولنے پر عناس نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”آپ! ٹھیک ہے وہ اچھے آدمی نہیں ہیں لیکن وہ بد کردار نہیں ہو سکتے اس کا مجھے یقین ہے۔“ عنازیدین ہی
 کے دیئے اعتماد کے زیر اثر بولی۔
 ”عنا! تم کب سمجھو گی اسے؟“ حنا ایک ایک لفظ چبا کے بولی اسے عننا کے زیدین پر ایسے اعتماد سے فکر لگ گئی
 تھی کہ کہیں مہرہ ہاتھ سے پھسل نہ جائے۔

”آپ! میں نہیں جانتی وہ کیا تھے؟ کیا ہیں اور کیا نہیں بس مجھے اتنا علم ہے کہ وہ مجھ سے پیار نہیں کرتے۔“ عننا
 کے دل میں زیدین کی محبت ابھی زندہ تھی وہ حنا کی باتوں سے کوفت محسوس کر رہی تھی۔

”اور مجھے زخم زخم کر دیا۔ اس نے عننا تم تو ابھی یہ سوچنے میں حق بجانب ہو اس لئے کہ تمہارا کچھ نہیں بگڑا
 سے نہ تم سے تمہاری عزیز ہستی چھینی گئی ہے نہ تمہیں محل سے جھوپڑے میں بھجوا یا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر ابھی
 تمہاری نسوانیت قائم ہے تم ایسا ہی کہو گی لیکن میں اب وہ ناگن بن گئی ہوں جسے بار بار زخمی کیا گیا ہے اور یہ زخمی
 ناگن کوئی بڑی تباہی چاہتی ہے۔“ حنا کی حالت غیر ہو گئی تھی غصے کی شدت سے اس کی آنکھوں سے شعاعیں اور
 زبان سے جھیاگ نکل رہا تھا وہ عننا کے سامنے اوڑھا لباؤہ زیادہ دیر قائم نہ رکھ سکی عننا اس کی حالت دیکھ کر انتہائی
 خوفزدہ ہو گئی تھی اسے وہ بیک وقت دکھی بھی لگی اور جالاک بھی مگر وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ حنا کو کنٹرول کیسے کرے
 ناچار وہ اسے ایسے ہی پھوڑا واپس لوٹ گئی۔ حنا نے بیگی آنکھوں مسکراتے لبوں اور انتقامی جذبات کے ساتھ عننا
 کو جاتے دیکھا تھا۔

☆☆☆☆

عنا حویلی میں داخل ہوئی تو سب لڑکیاں ہال کمرے میں مووی دیکھنے میں مصروف تھیں اور یوزرگ پارٹی اپنی
 حسب حال سرگرمیوں میں مگن تھے البتہ لڑکے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ عننا تمام دنیا سے بیزار تھی وہ سب سے
 کتراتے ہوئی نکل رہی تھی کہ لیلیٰ نے دیکھ لیا۔
 ”عنا ہمارے ساتھ آ کر بیٹھو کیا ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔“

”لیلیٰ! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ عننا بیزار تھی سے بولتی آگے بڑھنے لگی کہ
 صغیرا نے پکار لیا۔

”عنا! آؤ تو سہی فلم کے رنگین مناظر دیکھو گی تو خود ہی طبیعت بہل جائے گی۔“ سب کے باری باری اصرار کرنے پر وہ
 چارونا چاران کے درمیان آ بیٹھی فلم سے اسے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی اب تو اس کی اپنی زندگی کہانی بن کر رہ گئی تھی۔
 ”آج اتنے دنوں بعد تو موقع ملا ہے مووی دیکھنے کا ورنہ یہ جنات دیکھنے کہاں دیتے ہیں؟ آ کر بیچ میں بیٹھ
 جاتے ہیں اور ہر فضول سین پر ایسے ایسے ریمارکس دیتے ہیں کہ ہم نے تو فلم دیکھنا ہی چھوڑ دی ہے اکیلے دیکھنے
 نہیں دیتے اور ان بد معاشوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھی نہیں جاسکتی۔“ صغیرا تھیں یوں بیان کر رہی تھی جیسے عننا کی
 تمام تردیجی کامرکز ہی قصہ ہو۔

”عنا! فلم اچھی ہے نا؟“ اس کی بیزارگی کو نوٹ کرتے ہوئے حنا بولی۔

رواڈا مجسٹ [180] اکتوبر 2016ء

”آں..... پتہ نہیں مجھے تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ عنائی دنگرنگی اب چھپائے نہیں چھپی تھی۔

”کم آن عنائ! کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں لاسٹ ٹائم بھی تم آئی تھیں تو دو دن خوش رہیں پھر وہی قنوطیت کا دورہ اب پھر تمہارا وہی حال ہے لالہ ٹھیک ہی کہتے ہیں جوہلی میں کوئی بھوت ہے جو تم سے چمٹ جاتا ہے۔“ جویریہ نے عناس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت سے بات شروع کی درمیان میں بیلا کے زیدین کے حوالے سے لقمہ دینے پر وہ سخت بد مزہ ہو گئی اب تو زیدین کا تذکرہ بھی اسے طعنہ لگتا تھا۔

”پتہ ہے عنائ! آج شیطانوں کے ساتھ کیا ہوا؟“ بیلا کا اشارہ لڑکوں کی طرف تھا عنانے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”آج لالہ! سب نکموں کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں کہہ رہے تھے ہر وقت فارغ بیٹھ کر تم لوگوں کے ویٹ بڑھ گئے ہیں چلو کسی کام دھندے سے لگو۔“

”شکر ہے اب ان ہر وقت کی سرپرست مصلحتوں سے تو جان چھوٹے گی۔“ یہ جذبات صرف بیلا اور جویریہ کے تھے جبکہ صغیرا سلی اور حفصہ کے دل کسی اور پر دھڑک رہے تھے۔

”بااوب! بلا لحظہ ہوشیار شاہ میر جاہ کے روشن چشم و چراغ تشریف لا رہے ہیں۔“ ابھی لڑکیاں اس اعلان سے سنبھلیں بھی نہ تھیں کہ وہ سب دھڑ سے اندر داخل ہو گئے۔

”اوہو..... مووی دیکھی جا رہی ہے مزہ آئے گا۔“ تیمور نے حارث کو آنکھ ماری اور آگے بڑھ کر ٹی وی آن کر دیا جسے صغیرا نہیں دیکھتے ہی بند کر چکی تھی۔ زوار نور اصفو کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا حمزہ لیلیٰ کے سامنے ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا جبکہ حارث بیلا کے آگے بیٹھ گیا اس کے لیے چوڑے جسم کے پیچھے بیلا بالکل چھپ گئی اور ادھر ادھر کندھوں سے جھانک کر دیکھنے لگی، لیکن حارث بھی اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ کر دیتا اور کسی خود اونچا ہو جاتا تک آ کر وہ اس کی کمر بناخن سے کاٹنے لگی۔

”کیا فلم ہے یار! ایشوریہ کی مووی دیکھ کر کچھ حاصل نہیں ہونا، فلم تو بندہ ملائکہ کی دیکھے کم از کم کچھ معلومات میں اضافہ تو ہو۔“ حارث بازاری انداز میں بولا وہ سب یوٹیوٹیو کیوں کو زچ کرنے کے لئے اوٹ پٹانگ بولتے تھے۔

”تم لوگ خاموشی سے فلم نہیں دیکھ سکتے۔“ حفصہ نے حارث آ کر کہا ان کی باتیں ناقابل برداشت جو ہوتی جا رہی تھیں۔

”لو اگر خاموشی سے فلم دیکھنا ہو تو ایسی فلم لگاؤ کہ جسے دیکھ کر بولنے، کھانے، آنکھ جھپکنے تک کا ہوش نہ ہو۔“ تیمور کی بات پر صغیرا نے اسے ایک پھٹر رسید کیا۔

”شرم نہیں آتی تم لوگوں کو بہنوں کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔“

”وہ تو آنا چاہتی تھی ہم نے ہی باہر نوٹس لگا دیا۔“

”ابھی موڈ نہیں ہے کل آنا ابھی موڈ نہیں ہے۔“ سب لہک لہک کر گانے لگے جویریہ، عنان اور عدویہ تو ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تم لوگ جو رات رات بھر دروازہ بند کر کے مووی دیکھتے ہو، ہم نے تمہیں کچھ کہا ہم جیسے ہی فلم لگائیں پتہ نہیں کہاں سے آن سکتے ہو سر پر سوار ہو جاتے ہو۔“ بیلا حارث کی مینس کو بری طرح سے کھینچتے ہوئے بولی۔

”تمہارے سر پر جگ ہی کہاں سے جو ہم آ کر سوار ہوں وہاں تو پہلے ہی جوؤں نے ڈیرا ہمارا کھا ہے۔“ حمزہ نے بیلا کی طرف اشارے کرتے ہوئے کہا بیلا اسے منہ چرانے لگی۔

”آؤ صفوا چلتے ہیں یہ لوگ تو بونہی کریں گے۔“ لیلیٰ بد مزہ ہوتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں ہاں لیلیٰ ہم پھر کبھی مووی دیکھ لیں گے ابھی چلتے ہیں۔“ حمزہ نورا اٹھ کر لیلیٰ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

”پلیز! آپ خود بھی چلے جائیں اور اپنے ان چھوٹوں کو بھی لے جائیں مہربانی ہوگی۔“ لیلیٰ تپ کر بولی اور ایسا بولی کہ لڑکیوں نے تالیاں پیٹ ڈالیں۔

”اوہ حمزہ! چیونٹی کے بھی ارنکل آئے ہیں۔“ حارث نے لیلیٰ پر چوٹ کی۔
 ”نہیں یار! یہ مقولہ پرانی ہو گیا ہے دراصل مینڈک کو زکام ہو گیا ہے۔“ زوار نے چھوٹوں کو قرار دینے پر بہن کے خلاف کارروائی کی۔

”نہیں یار! پالی ماں کے دانت نکل آئے ہیں۔“ تیمور نے صحیح معنوں میں نیا مقولہ ایجاد کیا۔
 ”بس چپ کچھ بھی نہیں ہوا، بس لیلیٰ میں بیوی بننے کے گنڈ پیدا ہو گئے ہیں۔“ حمزہ نے لیلیٰ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا وہ عاجز آ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آؤ صفوا! یہاں بیٹھنا فضول ہے۔“ وہ فلم کو ادھورا چھوڑ کے جانے سے اداس تھی۔
 ”اوہیوں..... میں تو پوری فلم دیکھ کے ہی جاؤں گی بولتے رہیں جو بولتے ہیں۔“ صغیرا ڈھیٹ بن کر بیٹھ رہی جبکہ باقی سب اٹھ کر چل دی تھیں۔



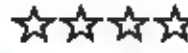
لیلیٰ کے کمرے میں سب موجود تھیں اور بری طرح کھول رہی تھیں۔
 ”یار لیلیٰ! ہم خواہ مخواہ اٹھ آئے صفویٰ طرح ڈھیٹ بن کر بیٹھے رہتے کم سے کم مووی پوری تو دیکھ لیتے۔“ بیلا کے افسوس کی کوئی حد نہیں تھی۔

”ایسے ہی بیٹھے رہتے وہ حمزہ کا بچہ اتنی معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا اتنی شرم آ رہی تھی مجھے۔“ لیلیٰ غصے سے بولی۔ دھڑام سے دروازہ کھلا اور صغیرا گرنے والے انداز میں ان کے درمیان آ پڑی۔
 ”کیا ہوا مووی ختم ہو گئی.....؟“ بیلا نے استنیاق سے پوچھا۔

”کیا خاک دیکھی ہے اف اتنے بے شرم ہیں یہ لوگ ایسی ایسی فضولیات کہیں کہ میرے کانوں سے تو ابھی تک دھواں نکل رہا ہے۔“ صغیرا کانوں کو ہاتھ لگانی بند کر بیٹھ گئی۔
 ”جی تو ہم نے کہا تھا آؤ چلتے ہیں تم خود ہی جم کر بیٹھی رہی تھیں۔“ حصصہ نے ناک چڑھا کر تنقید کی۔

”مجھے کیا پتہ تھا یہ لوگ اتنے منہ پھٹ ہیں میں تو سچی ذرا دیر بول بال کے چپ ہو جائیں گے مگر وہ تو وہ زوار اس قدر ایڈیٹ ہے جب بھی کوئی رومانٹک سین آتا کبھی ہاتھ پکڑ لیتا کبھی پہلو میں ہنسی مارے جا رہا تھا میں تو پھر بھی نہ ہلتی مگر وہ کج بخت بارش کا سوگ آ گیا زوار بار بار ریوائنڈ کئے جا رہا تھا اور پتہ نہیں کیا اول فول بک رہے تھے تنگ آ کر میں آ گئی۔“ صغیرا کا تفصیل بتاتے ہوئے سانس چڑھ گیا۔

”پتہ نہیں لالہ! نے انہیں اتنی جلدی کھول کیوں دیا۔“ حصصہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا سب انہیں دل کھول کر کو سے جا رہی تھیں۔



رات لیلیٰ اور عثمان باتوں میں مصروف تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی لیلیٰ نے دروازہ کھولا تو زید بن کو دیکھ

کر اٹھ کر بیٹھی۔
 ”آئے لالہ!“ لالہ کے نام کی پکار پر عنا کی خوش دلی ہوا ہو گئی وہ زیدین کا سامنا کرنے سے گھبرار ہی تھی
 کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

”عنا سو گئی سے کیا؟“ زیدین نے اسے بغور دیکھا۔
 ”نہیں لالہ! ابھی تو جاگ رہی تھی وہ۔“ لیلیٰ اس کی حرکت سے حیران تھی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ عنا نے
 ایسی حرکت کیوں کی؟ لیکن وہ اس کی اس فضول حرکت میں اس کا ساتھ بھی نہیں دے سکتی تھی اس لئے جھجکتے ہوئے سچ بتایا۔
 ”اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے جو یہ بھابی بتا رہی تھیں کہ وہ کافی اپ سیٹ ہے۔“ زیدین کی فکر مندی عنا کا دل جلا گئی۔
 ”اوں..... جیسے بڑی فکر ہے ناں میری۔“

”نہیں لالہ! ابھی تک تو ٹھیک تھی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔“ لیلیٰ عجیب منہ سے کاشکار تھی اس نے آنکھوں
 کے اشارے سے زیدین کو سمجھایا کہ وہ سوئی ہوئی نہیں ہے زیدین چند لمحے سوئی بنی عنا کو دیکھتا رہا پھر دھیرے
 سے بیڈ کے پاس آ کر اس کے کان میں کہا۔

”عنا! اگر تم جاگ رہی ہو تو میرے ساتھ آؤ مجھے کچھ بات کرنی ہے۔“ عنا خاموشی سے لیٹی رہی۔
 ”عنا! جواب دو۔“ زیدین نے پھر بات چھیڑی عنا چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔
 ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے صبح بات کر لیں گے۔“ لیلیٰ حیرت سے ان دونوں کی کاروائی دیکھ رہی تھی
 زیدین خود تذبذب کا شکار تھا کہ وہ عنا کے رونے سے کیا نتیجہ اخذ کرے۔
 ”عنا! بات انہی کرنے کی ہے میری طرف دیکھو۔“ زیدین نے سخت رویہ اختیار کیا عنا اس انداز سے خوف
 لھاتی تھی فوراً کروٹ لے کر اس کی طرف دیکھا۔

”اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں میں آپ کے ساتھ کیسے جا سکتی ہوں؟“ زیدین کے لبوں پر اس
 کی بات سے مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”عنا! ہمارا رشتہ ہمیں ساڑھے گیارہ بجے بات کر لینے کی اجازت دیتا ہے۔“ لیلیٰ زیدین کے انداز دلچسپی
 سے دیکھ رہی تھی اب تک وہ زیدین کو سنجیدہ اور بارعب لالہ کے روپ میں دیکھتے آئے تھے ایسا نرم بھوار سا
 برستازیدین اس کے لئے نیا تھا۔

”آؤ عنا! وقت گزر رہا ہے۔“ زیدین گھڑی دیکھتا ہوا غلٹ سے بولا عنا نا چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ
 چل پڑی اس کا رُف اٹھانے پر زیدین نے اسے اپنے ساتھ کھینچ کے لے جاتے ہوئے اس کا رُف اٹھانے نہ دیا
 دوپٹہ تو پہلے ہی نثار د تھا وہ سمجھ رہی تھی کہ زیدین چھت پر یا لان میں جائے گا مگر اس کا رخ اپنے کمرے کی
 طرف دیکھ کر وہ شپٹا گئی وہ رستے سے مڑ جانا چاہتی تھی لیکن زیدین ہاتھ چھوڑتا تو تب نا وہ اس انہونی کے لئے
 بالکل تیار نہ تھی اس کے بدن پر کچی طاری تھی تو پسینے سے مسام شرابور تھے زیدین کو اپنے ہاتھ میں پکڑا اس کا ہاتھ
 بھیگا محسوس ہوا لیکن وہ پرواہ کئے بنا کمرے میں داخل ہو گیا۔ عنا زیدین کے بیڈ روم میں پہلی بار آئی تھی کمرہ تھا
 کہ عالیشان محل انتہائی وسیع، خوبصورت فرنیچر اے سی روم دیکھ کر عنا کو جینا کا بوسیدہ فلیٹ یاد آ گیا اس کے دل
 میں نفرت کی ایک لہر سی اٹھی وہ تنفر سے زیدین کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کھٹکے کی آواز پر چونک گئی زیدین
 نے دروازہ ہلاک کیا تھا وہ ہراساں ہرنی کی مانند ہو گئی۔

”آپ دروازہ بند مت کریں۔“

”آپ نے جو بات کرنا ہے کریں پھر میں واپس جاؤں گی۔“ عنا خود کو سلی دیتے ہوئے روانی سے بولی۔
 ”تم تب ہی واپس جاؤ گی جب میں چاہوں گا۔“ زیدین کے استحقاق سے کہنے پر اس کے دماغ میں حنا

کی بات چھپاک سے درآئی کہ

”کیا تم سمجھتی ہو کہ تم واپس جاسکو گی؟“ یہ سوچ اسے شدید گھبراہٹ میں مبتلا کر گئی، زیدین اس کی سراپیسگی کو کھل طور پر نظر انداز کئے ہوئے تھے۔ گھڑی پر ایک نگاہ ڈال کر وہ اس کے چہرے کو بھرپور انداز میں تکتا دھیرے دھیرے اس کی جانب قدم بڑھا رہا تھا، جوں جوں اس کے قدم قریب آتے جا رہے تھے عناس کے دل کی دھڑکن مدہم ہوتی جا رہی تھی اگلا پل اسے کیا قیامت دکھانے جا رہا تھا کہ اس کا وجود ابھی سے پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا، زیدین کے قدم اس کے پاس آ کے رکے تو اس نے نگاہیں اٹھا پیں زیدین کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر وہ بوکھلا گئی اور سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹی، زیدین اس کی حرکت پر نہیں پڑا۔

”کیا ہوا عنا تم ڈر گئیں؟“ زیدین کی ہنسی تھمنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

”لیکن آپ نے یہ کیوں پکڑ رکھی ہے؟“ عنا مسکین صورت بنا کر بولی۔

”ہاں لئے کہ ایک چھری سے ہی کاٹا جاتا ہے۔“ کیک کے ذکر پر عنا نے حیرت سے زیدین کو دیکھا، زیدین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پیچھے دیکھنے کو کہا عنا آہستگی سے مڑی تو نیبل پر کئی لوازمات کے ساتھ کیک رکھا ہوا تھا، عنا نے استفہامیہ نگاہوں سے زیدین کو دیکھا، زیدین ہنوز مسکراتا ہوا اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر آہستہ آہستہ دھکیلتا ہوا نیبل تک لے آیا اور عنا کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکا کر اسے اس کے گرد بازو حائل کر دیئے، چھری بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔

”عنا! آج میری برتھ ڈے ہے میں نے اپنی خوشیاں سیلبرٹ کرنا عرصہ ہوا چھوڑ دیا ہے مگر جب سے تم میری زندگی میں شامل ہوئی ہو مجھے ہنسنا، خوشیاں منانا اچھا لگتا ہے۔“

”عنا! میں نے کسی کو اپنی سالگرہ میں مدعو نہیں کیا میری مہمان صرف تم ہو، مجھے ایسے دس کرو کہ میری مدتوں کی تمہکان اتر جائے۔“ زیدین خود فراموشی میں کہہ رہا تھا اور عناس حیرت سے کیک پر لکھے اپنے اور زیدین کے نام کو دیکھ رہی تھی اسے یکدم اپنی کوتاہی کا احساس شدت سے ہوا وہ زیدین کے بارے میں وہ جانتا چاہتی تھی جو بے معنی تھا اور جو اسے معلوم ہونا چاہئے تھا اس سے بے خبر تھی۔

”آئی ایم سوری مجھے معلوم نہیں تھا۔“ عناس سخت شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

”کم آن عنا! ان فضول وضاحتوں میں وقت ضائع مت کرو۔“ زیدین نے حسب عادت عنا کے گال پر ہلکے سے ہاتھ مارا۔ گھڑی نے بارہ بجنے کا الارم دیا تو زیدین نے عنا کے ہاتھ میں چھری تھما دی۔
 ”کاٹو عنا۔“

”لیکن برتھ ڈے تو آپ کی ہے۔“ عنا نے گردن ترچھی کر کے اس کے اپنے چہرے سے انتہائی قریب چہرے کو دیکھا۔

”بالکل میری ہے ایسے ہی جیسے تم میری ہو۔“ زیدین نے عنا کے چھری والے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ کر کیک پر جلا دیا، عنا نے انتہائی کم آواز میں پی پی برتھ ڈے کہا جو زیدین کے لئے سننا دشوار ہوتا، اگر وہ اتنا پاس نہ ہوتا، زیدین نے کیک کا نہیں لے کر عنا کے منہ میں ڈالنا چاہا مگر یہ کیا عنا منہ پھیر چکی تھی۔

”کیا ہوا عنا؟“ زیدین نے اس کا چہرہ اپنی طرف پھیرنا چاہا لیکن عنا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اس کے بازوؤں سے نکل کر سامنے دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ زیدین حیرت سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا ایک کانگڑا بدستور اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کبھی عنا کو دیکھتا تو کبھی اپنے ہاتھ کو۔

”عنا! تمہارا پل بدلنا روپ میرے لئے حیران کن ہے تم.....“

”میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“ عنا زیدین کی بات نہایت بدتمیزی سے کاٹی دروازے کی طرف بڑھی لیکن رستے میں ہی زیدین اس کا بازو سختی سے تھام چکا تھا۔

”میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی عنا!“

”مجھے جانے دیں میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔“ عنا چلاتی ہوئی زیدین کی گرفت سے خود کو آزاد کرنے لگی۔

زیدین نے جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا تو سنبھل نہ سکی اور دیوار سے جا لگی۔

”ضرور جاؤ لیکن پہلے یہ بتانا پڑے گا کہ یہ سب کیا ہے؟ یہ چیخنا، چلانا، کترانا کیا ہے عنا؟“ زیدین کی آواز اونچی نہ تھی لیکن اندر کا غصہ اس کے سرخ چہرے سے عیاں تھا اس کے چہرے کی رگیں پھول گئی تھیں، عنا سب اکڑفون پھول گئی اور سہم کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”عنا! اپنے گریز کی وجہ بتاؤ نہیں تو یونہی رات بھر کھڑی رہو گی۔“ زیدین شہادت کی انگلی کھڑکی کر کے وارن کرتا ہوا بمشکل خود کو کنٹرول کر رہا تھا۔

”میں دی دایس جانا چاہتی ہوں۔“ وہ جانتی تھی کہ زیدین نے جو کہا ہے وہ کرنے کا بھی تمام رات اس کے کمرے میں گزارنے کے بجائے اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”کیوں.....؟“ زیدین کے غصیلے انداز میں ذرا فرق نہیں آیا۔

”میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“ آخر عنا نے کمال جرأت کے ساتھ حکایت دل بیان کر ہی دی۔

زیدین چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا کیونکہ اس کے رویے نے تو یہ بات سمجھا ہی دی تھی اب زبان نے تو بس تصدیق کی تھی۔

”اس اجتناب کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟“ زیدین کا لہجہ کاٹ دار تھا تو دل اس قدر ناقدری برا لگ کٹ رہا تھا۔

”کوئی وجہ نہیں ہے۔“ عنا نظریں نیچی کئے بولی کہنے کو تو کہہ دیا مگر یہ اندر ٹوٹ پھوٹ کیسی تھی وہ خود حیران تھی۔

”اور تم مجھتی ہو کہ بناء کوئی وجہ بتائے تم جو چاہو گی وہ ہو جائے گا۔“ زیدین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، وہ غصے کی شدت سے چلا اٹھا، زیدین کے خود کے ساتھ پہلی بار اس رویے نے اسے دکھ و خوف سے بے حال کر دیا، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ زار و قطار روئے گئی۔ زیدین کی بے چینی ہر عمل سے عیاں تھی کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے دانتوں پر دانت جمائے وہ جانے کیا سوچے بیٹھا تھا، گا بے بگا ہے روتی عنا پر نظر ڈال لیتا جواب دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی تھی اور گھٹنوں میں سر دیئے روئے جا رہی تھی۔ اس کی بلند ہوتی سسکیوں نے زیدین کو زیادہ دیر غافل نہیں رہنے دیا وہ اس کے پاس آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا سراونچا کیا۔

”عنا! میں سمجھ رہا تھا کہ تمہارا گریز تمہاری حیا سے تمہاری نفرت کو حجاب کا نام دیتا رہا، مگر تمہارے اندر کون سے راز چھپے ہیں میں ان کا اصل معلوم کرنے بغیر کسے نہیں جانے دوں میں تمہیں راز بردار اپنے ساتھ جوڑے

نہیں رکھ سکتا، مگر میں تمہیں غلط بیوں کی دلدل میں گھرا بھی نہیں چھوڑ سکتا اپنا سمجھ کر شیر نہیں کر سکتی تو رہائی پانے کی شرط سمجھ کر بتا دو۔“

”آپ مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ عنا نے خود کو دور کرنے کی سعی کی ایک بار پھر زیدین کی رگ و پے میں غصے کی شدید لہر دوڑ گئی۔

”کیوں چھوڑ دوں تمہیں تم بنا جرم کے مجھے سزا کیسے دے سکتی ہو؟“ زیدین نے عنا کے سر کو جھکے سے آزاد کیا۔
 ”اس لئے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی“ آپ نے مجھے دھوکہ دیا ہے میرے جذبات کا مذاق اڑایا ہے آپ نے مجھے اپنی ضد کی بھیمنٹ چڑھایا ہے یہ جرم ہے آپ کا کہ آپ نے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈا کرنے کے لئے میرے دل کو جلا ڈالا ہے آئی ہیٹ یو۔“

”عنا نے انتہائی بے بسی و دکھ سے روتے ہوئے زیدین کے گھٹنے پر سر ٹیک دیا تھا جو کہ ساکت ساکت سا اسے دیکھ رہا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عنا اس سے اس قدر بدگمان ہوگی کانی دیر تک تو وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔
 ”عنا! تم یہ سب کہہ رہی ہو تم جسے میں نے اپنی ہر سانس میں محسوس کیا ہے جس کے لئے میں نے اپنی تمام سوچیں خوشیاں غم وقف کر دیئے ہیں میں تمہیں دھوکہ دوں گا تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا؟ تم اگر میری ضد ہوئیں تو اب تک تمہارے وجود کا ذرہ ذرہ خود میں سمیٹ چکا ہوتا، تم مجھ سے نفرت کرتی ہو مت کرو زیدین کو نفرت سے نفرت ہے“ زیدین کی زبان نہیں دل بول رہا تھا عنا سن نہیں رہی تھی تو ل رہی تھی۔

”عنا! مجھے جانے والوں کی کمی نہیں لیکن تمہاری محبت میرے لئے سب سے قیمتی ہے میں سب کچھ کھو چکا ہوں اور کھو سکتا ہوں لیکن تمہیں نہیں۔“ شدت جذبات سے مغلوب کہتے کہتے زیدین نے انتہائی پر عزم انداز میں اسے باور کرایا۔ عنا بالکل خاموش تھی اس کے آنسو گئے تھے وہ الفاظ جو اس کے منہ سے نکلے تھے وہ صرف زیدین کو نہیں اسے بھی رنجی کر گئے تھے۔

”عنا!.....!“ زیدین کی پکار میں اتنی گہرائی تھی کہ وہ خود پر باندھے بند برقرار نہ رکھ سکی اور پھر سے روتی چلی گئی۔
 ”عنا! رونا مت میں تمہیں اپنی اور تمہاری زندگی میں رنگ بھرنے کے لئے لایا تھا تمہاری ہنسی سے صبح کا آغاز کرنا چاہتا تھا اور تمہاری زلفوں تلے رات بتانا چاہتا تھا مگر ان آنسوؤں کو ہمارے بیچ کون لے آیا ہے؟“ نری سے بولتے زیدین کا لہجہ ایک بار پھر جانے کس کے بابت سوچ کر سخت ہو گیا تھا۔

”عنا! بولو تمہاری صاف شفاف سوچ کا منقسم کون ہے؟“ جب زیدین اس انداز میں بات کرتا تھا تو اس کے پاس جواب دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہتا تھا۔
 ”حنا آپی اور عدی آپا۔“ زیدین کا چہرہ جہاں حنا کے نام سے نفرت سے پر ہو گیا تھا وہیں عدی کے نام پر اسے حیرت کا شدید جھکا لگا۔

”میں بہت ڈپریشن ہوں پلیز مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دیں۔“ عنا کی التجا سیہ آواز نے اسے متوجہ کیا وہ اس سے دور ہٹ گیا اور دروازہ کھول کر بولا۔

”جاؤ عنا! اب تمہارے پاس وقت ہی وقت ہے۔“ اس کے سپاٹ چہرے اور دلخراش پیغام نے اس کے قدموں سے رہی سہی طاقت بھی نکال دی جانے وہ کیسے اس کے کمرے کی دہلیز پار کر کے باہر آئی تھی زیدین اس کے نکلنے ہی کھولتے دماغ کے ساتھ جتنا ہوا ٹیبل تک آیا اور میز پر دھراؤ لگا کر جو عنا کے منہ میں ڈالنا چاہتا تھا اٹھا کر اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا۔

”النور حویلی“ میں آج نکلنے والا سورج سب کے لئے روشن صبح کا پیغام لایا تھا تو وہیں دو نفوس رات کی تاریکی سے ابھی تک نبرد آزما تھے تمام رات عنائیک بل کے لئے سونہ سکی تھی وہ اس رات کو اپنی پوری زندگی پر محیط ہو جانے کے خیال سے خوفزدہ تھی کل تک وہ زیدین سے دور جانے کی تراکیب سوچ رہی تھی تو آج وہ اسے کھو دینے کے کرب سی گزر رہی تھی زیدین کے صاف دکھڑے انداز ہمیشہ ہی اسے خود میں سمو لیتے تھے مگر دماغ میں کلبلا تے شک کے ناگ بھی ڈسنے سے باز نہیں آتے تھے لیکن گذشتہ رات زیدین کے اسی کی خواہش پر اسے وقت دینے کے فیصلے نے اسے نیم جاں کر دیا تھا کاش کہ وہ دوری چاہتی مگر زیدین اس کی بات رد کر دیتا وہ جدائی کا مطالبہ کرتی رہتی اور وہ سنگدل ان ہی کئے جاتا۔

☆☆☆☆

عدی! میں سوچ رہا ہوں کہیں ہی مون کے لئے چلتے ہیں۔ ذون عدویہ کی چوٹی ہاتھ پر لپیٹتے ہوئے بولا۔
”حد ہوگئی یہاں لوڈ شیڈنگ سے جان نکلی جا رہی ہے اور اندھے کو قلم دیکھنے کی پڑی ہے۔“ عدویہ ذون کے ہاتھ سے اپنی چٹیا آزاد کراتے ہوئے تنگ کر بولی۔

”ایک تو ہماری مشرقی بیویوں کا یہ بڑا المیہ ہے شوہر کے رومانک موڈ کو ہاتھ سے نہیں جھاڑو سے جھاڑنی ہیں۔“ ذون بے دلی سے کروٹ لیتے ہوئے بولا عدویہ نے چند لمحے اسے مسکرا کر دیکھا اور اس کی پیٹھ پر انگلی سے ٹھونک بجا کر بولی۔

”ہمارے مردوں کو بے وقت رومانس کیوں سو جھتا ہے ذون! کچھ معلوم ہے آپ کو۔“ وہ انگلی کی نوک سے ذون کی کمر کو دروازے کی مانند دستک دے رہی تھی۔
”جی مجھے معلوم ہے۔“ ذون جوش میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا معلوم ہے آپ کو؟“
”یہی کہ اگر انسان بند کرنے میں اپنی بیوی کے ساتھ بھی رومانس نہ کرے تو وہ ’الو کا پٹھا کب کرے؟‘ ذون نے اپنے بال بھینچے عدویہ ہنس ہنس کے دہری ہوگئی لیکن ذون کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس کی ہنسی ہوا ہوگئی وہ اٹھ کر بھاگنے کے چکر میں تھی کہ دروازے پر اٹنے زور سے دستک ہوئی کہ دونوں ہڑبڑا کر الگ ہو گئے۔

”کون.....؟“ ذون نے اچھنبے سے پوچھا۔
”میں زیدین۔“ زیدین کا سنتے ہی دونوں بیک وقت دروازے کی طرف بڑے ذون نے دروازہ کھولا تو زیدین جھٹکے سے اندر داخل ہوا اور ذون کو نظر انداز کئے عدویہ سے مخاطب ہوا۔

”عدی تم نے عنا سے کیا کہا ہے؟“
”میں نے.....“ عدویہ نے حیرت سے خود کی طرف اشارہ کیا اور ذون کو دیکھتے ہوئے کندھے اچکا گئی۔
”ہاں تم نے کیا تم بھی حنا کی جانشین ہوگئی ہو؟“ زیدین دانت چبا کر بولا۔
”اللہ نہ کرے میں دو فرشتوں کے سائے میں رہتی ہوں کسی شیطان کی جانشین کیوں بننے لگی۔“ عدویہ نے شوخی سے ماحول کی نجی دور کرنی چاہی۔

”عدی! وہ آپ سب سے ہے اور اس کا ذمہ دار حنا کے ساتھ تمہیں بھی ٹھہراتی ہے۔“ زیدین اس کی شوخی نظر

”یقین کرو زیدین! میں نے عناسے کچھ نہیں کہا وہ حویلی کے ماضی میں جھانکنے کی خواہشمند تھی، میں نے اسے چند ایک باتیں اشاروں کنایوں میں بتائی تھیں اور بس میں نے اسے قطعاً ڈس ہارٹ نہیں کیا، پلیز زیدین میرا اعتبار کرو میں نے کچھ نہیں کیا۔“ عدویہ کا لہجہ بناوٹ سے پاک تھا زیدین کے غصے کا گراف ذرا نیچے آیا۔

”ٹھیک ہے میں مان لیتا ہوں کہ تم نے انجانے میں کچھ غلط کہہ دیا ہے یا شاید اس نے غلط سمجھ لیا ہے مگر تم احتیاط کرو آئندہ کسی معاملے میں اس ڈان کے ساتھ تمہارا نام نہ آئے۔“ زیدین اسے بڑے پن سے تنبیہ کرتا باہر نکل گیا ذون اور عدویہ اس کے آنے کے محرک کے متعلق سوچتے ہی رہ گئے۔

☆☆☆☆

عنا دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوئی آج ابے شاہجہانی نے بلوایا تھا وہ ہر طرح سے خود کو تیار کر کے آئی تھی آج کا پورا دن اس نے گذشتہ رات کا ماتم کرتے گزارا تھا ایک ہی دن میں وہ سوچ سوچ کر کھل چکی تھی اور اپنی عمر سے بڑھ کر مسافت طے کر آئی تھی۔ شاہجہانی نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کے لئے جگہ دی تائی ماں اس وقت بستر پر دراز تھیں ان کی حالت ابھی تک سنبھلی نہ تھی۔

”عنا بیٹا! میں بلا تمہید بات کروں گا زیدین اور تمہارے بیچ جو فیصلہ آ کھڑی ہوئی ہے وہ ہمارے لئے انتہائی تکلیف دہ ہے ہم نے تمہارے ماں باپ کو تمہاری خوشیوں کی ضمانت دی تھی ہمیں اپنا صامن سمجھ کر ہر بات کھل کر کہو۔“ شاہجہانی کا اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا تھا کہ اس کے رے ہونے آنسوؤں کو رستہ مل گیا۔

”نہیں میرا بچو رو میں تیرے ڈان ارے ہم مر گئے ہیں کیا جو تم تہا دکھا اٹھائے جا رہی ہو۔“ صدا کی نرم دل تائی ماں اٹھ کر بیٹھ گئیں اور اسے سینے سے لگائے دلا سہ دیئے گئیں۔

”عنا! میں پھر وہی بات کہتا ہوں ہم نے تمہارے بلند بخت کا سودا کیا ہے جو کہ بخدا اگھائے کا سودا ہرگز نہیں ہے زیدین بھی انسان ہے غلطی اس سے بھی ہو سکتی ہے اگر تمہیں کوئی شکایت ہے تو ہمیں بتاؤ ہم ابھی زندہ ہیں تمہارے سر پر سائبان ابھی موجود ہے۔“ شاہجہانی نے سنجیدگی سے اپنی بات دہرائی تھی۔

”شاہجہانی! میں بیچ دورا ہے پر آ کھڑی ہوئی ہوں میں فیصلہ کرنا چاہتی ہوں لیکن کوئی سزا ہا تمہیں آ رہا دل کبھی ایک طرف کھینچتا ہے تو کبھی دوسری طرف۔“ شاہجہانی میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔“ عناسر جھکائے ہونٹ کاٹتی بے بسی ولا رچاری کی تصویر دکھائی دیتی تھی دل و دماغ کی جنگ نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔

”میرا بیٹا! ہم سے بیان کرو ہم تمہیں وہ قوت دیں گے کہ تم آنکھیں بند کر کے فیصلہ کر لو گی بولو عنا بولو۔“ شاہجہانی اسے ہر ممکن طریقے سے اعتماد میں لے رہے تھے تو تائی ماں ہاتھ سہلا سہلا کر شفقت نکل کر رہی تھیں، عنا کو ان سے چھانکیر اور رانیہ کی محبت کی مہک محسوس ہو رہی تھی۔

”شاہجہانی! انہوں نے مجھ سے ضد میں شادی کی ہے حنا آپی کو نیچا دکھانے کے لئے شاہجہانی میرا کیا تصور تھا کہ میں ان کی آپس کی لڑائیوں کا شکار بن گئی کیا انہیں چارہ کار بنانے کے لئے میں ہی ملی تھی۔“ عنادکھ سے بولے جا رہی تھی شاہجہانی اور تائی ماں حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔

”شاہجہانی! وہ بہت سنگدل ہیں اپنے بھائیوں کے گھر اجاڑنے حنا آپی کو بے گھر کیا ان کی بیٹی چھین لی ذون بھائی کے ساتھ اتنی زیادتیاں کہیں تائی ماں میں ایسے شخص کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ عناجذول میں تھا بولے جا رہی تھی جب وہ خاموش ہوئی تو شاہجہانی گہرا سانس لے کر بولے۔

”عنا! میں نے تم سے کہا تھا ناں صرف وہ سننا جو زید بن بتائے، ورنہ یہاں ہر ایک تمہیں ہی کہانی سنانے کا تم نے میری بات بھی نہیں سنی وجہ ہے کہ بدگمانیوں کا شکار ہو گئی ہو۔“

”شاہجہانی! کیا یہ سب جھوٹ ہے میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے میں اسے کیسے جھٹلا دوں؟“ عنا اپنے موقف کی حمایت کرتے ہوئے بولی۔

”عنا! یہ سب ٹھیک ہے کہ زید بن نے بعض معاملات میں انتہا پسندی کا ثبوت دیا ہے لیکن یہ اس کی خود غرضی یا سنگدلی نہیں ہے اس کے پیچھے کئی محرکات ہیں۔“ شاہجہانی انتہائی فہم و فراست سے معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”شاہجہانی میں.....“

”بس بیٹا بس اب تم جاؤ تمہارے ہر سوال اور خدشے کا جواب تمہیں مل جائے گا جاؤ۔“ شاہجہانی نے اسے مزید گل افشانی سے روکتے ہوئے یونہی خلاء میں ڈانوا ڈول چھوڑ کر جانے کا عندیہ دے دیا وہ زبان پر کئی سوال روکے دماغ میں لگی گرہوں کے ساتھ چلی گئی شاہجہانی نے زید بن کو انٹرکام پر بلایا۔

☆☆☆☆

عنا حسب معمول لیلیٰ کے کمرے میں ہر ایک سے بیزار اور بے نیاز موجود تھی کہ زید بن بنا دستک کے کمرے میں داخل ہوئے عنا سے سامنے پا کر بوکھلا گئی وہ ان کی نگاہوں کا سامنا کرنے کی خود میں ہمت نہیں پاتی تھی مگر زید بن اسے مکمل نظر انداز کئے لیلیٰ سے مخاطب ہوا۔

”لیلیٰ! اسے ریڈی کر کے نیچے آؤ صرف دس منٹ میں۔“ زید بن اپنی بات کہہ کر جیسے دھڑ سے آیا تھا ویسے دھڑ سے واپس لوٹ گیا ریڈی ہونے اور صرف دس منٹ کے آرڈر نے اس کے اوسان خطا کر دیئے زید بن کے تیور سے وہ کوئی خوشگوار بات اخذ نہیں کر سکتی تھی اور کسی خوفناک عمل کی ہمت وہ کہاں سے لائے گی وہ اپنی کیفیت سے خود عاجز آ چکی تھی زید بن نے بارہا اس کے موڈ کے بدلنے رنگوں کا تذکرہ کیا تھا اور آج وہ خود ان سے نالاں تھی۔ وہ مخصوص کوٹ اور اسکارف زیب تن کئے لیلیٰ کے ہمراہ نیچے آئی تو زید بن کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا دھیرے سے قدم اٹھاتی عنا سے مکمل لاپرواہی ظاہر کرتے اس نے فرنٹ ڈور کھولا تھا۔

”لالہ! کہیں جانا ہے؟“ لیلیٰ بلیک پرائڈ کو شوق سے دیکھتی بولی۔

”لیلیٰ! ہم ایئر پورٹ جا رہے ہیں کوئی پوچھے تو بتا دینا۔“

”ایئر پورٹ.....“ لیلیٰ اور عنا دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اوں دہی کی فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ زید بن نے محل سے جواب دیا لیلیٰ تو زید بن بے تاثر چہرے کو دیکھ کر مزید پوچھنے سے باز رہی جبکہ عنا اپنے اندر کی رونی بلکتی عنا کو قابو کرنے میں مصروف تھی گویا وہ گھڑی آگئی تھی جو وہ چاہتی تھی کہ آئے اور اب چاہتی تھی کہ کبھی اس کی زندگی میں نہ آئے۔ زید بن فرنٹ ڈور کھلا چھوڑ کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا، عنا لیلیٰ کو بائے کہنا بھی بھول گئی تھی خاموشی سے مرے قدم اٹھاتی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی زید بن نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ رات بھر وہ جذبات سے گندھا شخص اس سے غافل رہا تھا کہاں اسے دیکھتے ہی پھول کی مانند کھل اٹھنے اور شہد کی مانند مٹھاس بانٹنے والا زید بن تھا اور کہاں یہ جو اس پر ایک نظر ڈالنے کا رادو مدار تک نہ تھا، عنا کی آنکھوں سے نجانے کیوں آنسو رواں ہو گئے بھی شاید زید بن نے ماحول کی اداسی دور کرنے کے لئے سی ڈی پلیئر آن کیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

رڈاڈ بجسٹ 190 اکتوبر 2016ء

ہم سے نظر ملائے۔
 عنانے گرون موڈ کر پہلی بار ڈراما سونگ کرتے زیدین کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔
 ”نظر س جو مل گئیں کلیاں سی کھل گئیں
 یہ خوشگوار کھڑیاں قسمت سے مل گئیں
 اے دشمن مسافر“

عنازیدین جیسے اکھڑ مزاج سے ایسا شوخ گیت کی توقع نہیں رکھتی تھی اس کے انداز سے عجیب غیر معمولی پن کا احساس شدت اختیار کرتا جا رہا تھا زیدین اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کی سوچ من و عن پڑھ رہا تھا کچھ تو زمانہ سازی اور کچھ عنانے کھلی کتاب کی مانند چہرے سے کچھ بھی نتیجہ اخذ کرنا زیدین کے لئے دشوار نہیں تھا دفعتاً اس نے عنانے کی بند مٹھی کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیا تھا۔ عنانے کی پہلی حرکت تھی جو وہون کی سوچ بچار اور آج کے طویل سفر کے بعد زیدین کی طرف سے نظر آئی تھی عنانے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ گاڑی کسی مقام پر آ کر رک گئی۔ زیدین دروازہ کھول کر باہر نکلا اور دوسری طرف سے آ کر اس کی طرف کا نہ صرف دروازہ کھولا بلکہ جارحانہ انداز میں اس کی نازک کلائی پر گرفت کئے اسے باہر کی طرف گھسیٹ لیا عنانے انتہائی قرب کا احساس دینے کے بعد زیدین سے ایسی وحشت کے ظہور کا تصور بھی نہیں رکھتی تھی باہر نکل کر اس کی حیرت دو چند ہو گئی تھی نہ تو ابیر پورٹ تھا نہ کوئی گنجان ایریا۔ انتہائی غیر آباد علاقہ تھا وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر زیدین کی رعایت کے موڈ میں نہیں تھا اسے بدستور کھینچتا ہوا آگے چل پڑا۔ ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے اس کے قدم چا کے رہے جب سے جانی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا عنانے اس کے قدموں کے نشان پر قدم رکھتی چل رہی تھی بلکہ گھسیٹ رہی تھی گھر کے بیچ رک کر زیدین نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور رخ موڑ کر اس کے سامنے آ گیا۔

”کیا تھا گا گھر اس گھر سے بھی پوسیدہ اور پرانا ہے؟“ عنانے کا نئے لفظوں کی صدا پر بمشکل سہاٹا اور تمام گھر پر نگاہ دوڑائی ایک کمرے کا برابی ویواروں والا گھر تھا کچن چھوٹا سا تھا جس کا دروازہ تک نہ تھا کمرے کا دروازہ باوا آدم کے زمانے کا تھا فرنیچر کے نام پر صرف ایک تخت پورے گھر میں شرمندہ کرنے کے لئے موجود تھا۔ عنانے حیرت سے سب کچھ دیکھ رہی تھی زیدین کے دھوان چھوڑتے چہرے کو تو دیکھنا ہی محال تھا۔
 ”یہ آپ مجھے کہاں سے آئے ہیں؟“

”تمہیں دکھانے کے لئے کہ تھانے جو میری ماں کے ساتھ کیا تھا وہ آج میں نے اسے لوٹا دیا میں نے ظلم کیا نہیں ظلم کا جواب دیا ہے میں سگدل ہوتا تو اس کو کب کا تیمم کر چکا ہوتا وہ فلیٹ تو کیا فلیٹ پاتھ پر لا پھینکتا ان ماں بیٹی کو لیکن میں نے کچھ نہیں کیا صرف شاہ میر جاہ کا لہو اور خاندان کی عزت سمجھ کر صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا میں نے صرف ان سے کنارہ کشی اختیار کی ہے انہیں دنیا سے کنارہ کش ہونے پر مجبور نہیں کیا۔“ زیدین کی زبان اور آنکھوں سے بیک وقت شعلے نکل رہے تھے عنانے کی جنونی کیفیت سے خوفزدہ ہو گئی تھی پہلے وہ تھکا کواں روپ میں دیکھ چکی تھی اور اب زیدین کا بھی وہی حال تھا عنانے کو ایسا لگا کہ دوشیروں کے درمیان نوالہ بن گئی ہو۔
 ”آؤ عنانے دیکھو یہ کمرہ یہ گھر۔“ زیدین عنانے کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا پورے گھر میں گھما رہا تھا۔

”یہ چار پائی دیکھ رہی ہو یہاں میری ماں نے آخری سانس لی تھیں ان کا جنازہ صرف میرے ان کندھوں نے تجنا اٹھایا انور جو علی تو کب کی انہیں مردہ سمجھ چکی تھی ابوزر جاہ کی محبوب بیوی زین العابدین ذوالنواس نے

ذوالنون تین بیٹوں کی ماں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں گھر میں گزارے ہیں تو کیا خٹانے کے لئے وہ بیٹ برا ہے جبکہ وہ وہاں اپنی مرضی سے لگی ہے میں نے اسے حویلی سے نکالا نہیں تھا وہ سب اس کے باپ کی سیاہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔

”عنا! تمہیں حنا کا درد بہت محسوس ہوتا ہے نا اب محسوس کرو میری ماں کا درد جو اس ویرانے میں تمہا تمہیں اپنے بیٹوں سے دوزخ تمام دنیا سے الگ تھلگ انہیں اس حال تک پہنچانے والوں کے لئے تمہاری لغت میں کونسا لفظ ہے سنگدل نہیں وہ تو زیدین ہے جس نے انہیں بے گھر کیا۔ خود غرض اوں ہوں یہ بھی زیدین کی میراث ہے کیونکہ اس نے اپنے بھائیوں کے گھر اجاڑے۔ ظالم ارے نہیں ظالم تو وہ زیدین ہے جو تم پر زبردستی خود کو مسلط کئے ہوئے ہے۔“ زیدین غم و غصے سے دیوانہ ہو گیا تھا عننا کو لفظوں سے بھنبھوڑ رہا تھا تو ہاتھوں سے بھنبھوڑ بھی ڈالا تھا عننا کے تو بدن کا خون تک سوکھ گیا تھا وہ زرد چہرے کے ساتھ زیدین کی وحشت کو دیکھ رہی تھی۔

”عنا! تم اس عورت کی طرف داری کرنی ہو جس نے میرا آشیانہ تنکے تنکے کر کے بکھیر دیا ہے میرا باپ میری ماں میرا بھائی اس نے اپنے مکروہ صفت باپ کے ساتھ مل کر میرے بدن سے بوٹیاں نوج نوج کے چھین لی ہیں۔“ زیدین نے عننا کو اتنے زور سے جھٹکے دئے کہ وہ چیختی ہوئی اس سے خود کو الگ کرنے لگی اور ناکام ہو کر اسی کے سینے سے لگ کر زار و قطار روئے گئی زیدین کی دیوانگی کا گراف کچھ نیچے آیا اس نے عننا کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کر دیا۔ عننا کو اس وحشی کے مہربان سینے نے جیسے ہر فکر و غم سے آزاد کر دیا آہستہ آہستہ اس کی ہچکیاں تھمتھمتھ لگیں زیدین نے اس کا سر سہلاتے ہوئے خود سے الگ کیا اس کے آنسوؤں سے تر چہرے کو اپنے ہاتھوں کی پھٹی سی صاف کیا اس کی محبت بھرے لمس نے کچھ دیر پہلے کے جنون کے اثرات کو یکدم ہی زائل کر دیا تھا عننا کی آنکھوں سے عداوت کا ایک آنسو گرا جسے زیدین نے گرنے سے پہلے ہی گال پر لب رکھ کر روک لیا۔

”عنا! مجھ سے کہا ہوتا مجھ سے سنا ہوتا ہر ایک سے سنا اور یقین کر لیا تم نے اپنے زیدین کو ترازو میں تولنے کے لئے رکھ دیا۔“ زیدین کا شکوہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ وہ ایک لفظ تک نہ کہہ پائی۔

”عنا! النور حویلی آج اگر قائم ہے تو ابو زرجاہ کے خون سے وہ حق پرست انسان تھے اصولوں پر چنے اصولوں ہی کی خاطر جان دے دی۔ ای ایک غیر براوری کی متوسط طبقے کی عورت تھیں ابو کی یونیورسٹی فیلو تھیں دادا کی رضامندی کے بغیر ابو نے ان سے شادی کرنی تھی جس کی بناء پر وہ حویلی بدر کر دیئے گئے تھے حنا کا شیطان صفت باپ احمد دادا کے مرحوم دوست کی نشانی تھا جسے دادا نے اس قدر شفقت سے پرورش دی کہ اولاد کے برابر جائیداد میں حصہ تک دیا، زوبیہ پھپھو سے ان کی شادی ہوتے ہی وہ دونوں دادا کی آنکھ کا تارا بن گئے تھے ابو کے حویلی سے بے دخل ہو جانے کے بعد اشعر چاچا کا رو باری معاملات پر نظر رکھتے تھے دادا کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد احمد کو بزنس میں چند ایک ذمہ داریاں دی گئی تھیں مگر وہ ہر معاملے میں گڑ بڑ کرتے تھے سیدھے سادھے اشعر چاچا انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے تو زوبیہ پھپھو دخل اندازی شروع کر دیتیں تنگ آ کر انہوں نے دادا ابو سے بات کرنے کا فیصلہ کیا احمد نے انہیں دھمکیوں کے ذریعے اس سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن مسلسل بددیانتیوں سے عاجز اشعر چاچا دھمکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دادا ابو سے ملاقات کرنا چاہتے تھے اس دن آفس میں اچھی خاصی تلخ کھای کے بعد وہ عدویہ کی پیدائش کی خبر پا کر حویلی واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک تیز رفتار ٹرک نے انہیں چل دیا۔

میں اگرچہ ان دنوں صرف پانچ سال کا تھا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن حویلی میں خوشیوں کی

بہارتھی جب ایوانی میرا ہاتھ تھامے حویلی میں داخل ہوئے پیچھے عدویہ کی عیدائش ہوتے ہی ابھی سنا کر سلامت کی صدا آئی نہ تھی کہ زوبیہ پھپھو منوں کا نعرہ لگانی داخل ہوئی تھیں اور اشعر جا چا کے انتقال کی خبر سنائی تھی ای ابو کو دیکھ کر مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجائے آگے بڑھیں اور ابو کی گود سے چند گھنٹوں کی عدویہ کو اٹھا کر زمین پر لٹا دیا اور چار سال کی حنا کو ابو کی گود میں ڈال کر بولیں۔

”اس منحوس کو اپنے دامن سے الگ رکھئے یہ باپ کو دنیا میں آتے ہی دنیا سے بھجوا چکی ہے آپ میری حنا کو سینے سے لگائے یہ بختوں والی ہر کانٹے کو راہ سے نکالے جا رہی ہے۔“ کانٹے سے مراد ان کی داوی ماں اور اشعر جا چا تھے حویلی کی محد دو سوچ خواتین نے بھی ان کا ساتھ دیا ابو کو سب خواتین نے اتنا ریشتر کیا کہ انہوں نے میرے ہاتھ سے چھوٹی سونے کی انگلی اتار کر حنا کے ہاتھ میں ڈال دی گویا یہ ہماری منگنی کا اعلان تھا زوبیہ پھپھو نے چا چا کے انتقال پر ماتم کے بجائے ان کے خاندان کو دلا سہ دینے کے بجائے اپنی بیٹی کی خوشیوں کا محل تعمیر کرنا شروع کیا۔

اشعر جا چا کے اپنے خون کی زکوٰۃ دینے کے باوجود شریعت پر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ ابو واپس آ کر کاروباری بھاگ دوڑ ہاتھ میں لے چکے تھے ان دنوں جہاں ابو کی احمد سے ناجانی چل رہی تھی دادا ابو کا بھی انتقال ہو گیا زوبیہ پھپھو اور اس کا حریص شوہر اور بھی کھل کر سامنے آگئے اب احمد کھلم کھلا کاروبار میں اپنی شراکت بڑھانے کے چکر میں تھا ابو نے پھپھو کی بار بار منت زاریوں کی بناء پر احمد کو 50 برسٹ کی شراکت دے دی بس بس سے ہر خرابی شروع ہوئی احمد اور پھپھو نے اپنی تمام حرص لالچ خود غرضی سامنے رکھ دی کاروبار میں گھپلا ہوتا تو حویلی میں حقوق غضب کئے جاتے اشعر جا چا کی بیوی اور عدویہ کو ایک کونے میں ڈال دیا گیا تانبہ پھپھو کو جی حضوری کرتے رہنے کے عوض حویلی میں ایک پورشن دیا گیا شاہجہانی اور تانی ماں کو بے اولادگی کے طعنوں سے چھلنی کیا جاتا جس سے وہ خود ترسی کا شکار ہو کر دیوار سے لگ گئے تھے۔

حنا کے اندر یاں باپ کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں وہ حویلی کے خاندانوں سے لے کر بزرگوں تک کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی میں ان دنوں میٹرک میں تھا ذوق چند ماہ کا تھا اور ذوالنواں آٹھویں میں جب دکان سے نکلتے ہوئے ابو کو کسی نے چاقو مار کر ہلاک کر دیا ای ان کے ساتھ تھیں یاں نا صرف قاتل کا چہرہ پہنچاتی تھیں جس نے ابو پر حملہ کیا بلکہ وہ اس دن کے ابو کے ارادے سے بھی واقف تھیں ابو احمد کی بد عنوانیوں سے عاجز آ کر باقاعدہ شہوت و شواہد کے ساتھ اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے جا رہے تھے یہی فیصلہ ان کے قتل کا سبب بنا ای اگرچہ محفوظ تھیں لیکن اپنی آنکھوں سے ابو کا بہتا خون دیکھنا ان پر نیم دیوانگی طاری کر گیا اور یہی بات شریعتوں کے لئے موافق تھی پھپھو نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا اور ماں کو حوصلہ دینے کے بجائے ان کے سر پر سوار ہو کر مسلسل ابو کے بیہمانہ قتل کے تذکرہ کئے جاتیں ماں ان مناظر کو یاد کر کے وحشت زدہ ہو جاتی تھیں لیکن پھپھو نے انہیں دیوانہ قرار دے کر ہی چھوڑا۔ میں جب بورڈنگ سے واپس آیا تو دو خبریں میری منتظر تھیں ایک باپ کا مرڈ اور دوسرے اماں کے پاگل پن کی پھپھو نے ماں کو اس مکان میں لا پھینکا تھا اور حویلی والوں کو یہ باور کرایا کہ وہ ہاسپٹل میں ہیں اور ان کا علاج ہو رہا ہے کئی سال تک مجھے بھی انہی دلاسوں سے بہلایا گیا۔

اب حویلی میں زوبیہ پھپھو کا سکھ چلتا تو کاروبار کے مختار کار احمد تھے ابو اور اشعر جا چا تمام بھائیوں کو برابر کا حصہ دیتے تھے لیکن احمد نے صرف اپنی جیبیں بھریں اور ہزار ہزار گز کے کسے بنگلے تعمیر کرائے بینک اکاؤنٹس بھرے زوبیہ پھپھو اس دولت کی خاطر اپنے دو بھائیوں کا مرتدہ دے چکی تھیں وہ کیوں نہ اس سے دامن بھرتیں۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

میری بیٹائی چونکہ جنا سے ہو چکی تھی لہذا میں اسے اپنے دلکش بیٹائی میں ساٹھی بنانا چاہتا تھا ذون بہت چھوٹا تھا اور ذوالنواس بھی اتنا مجھدار نہیں تھا مجھے ان کی دیکھ بھال بھی کرنا پڑتی اور ساتھ ساتھ اسٹڈی اور جاب بھی جاری تھیں کیونکہ مجھے حویلی میں زیادہ عمل دخل دینے کی تو کیا ہی اجازت ہوتی کھانا کھانے تک کی اجازت نہ تھی شاہجہانی اور تائی ماں کا احسان میں تا عمر آخر فراموش نہیں کر سکتا کہ ان کی چپکے چپکے دی مالی امداد سے میں نے اپنا کیریئر شروع کیا سی ایس ایس کے ایگزام کے بعد آپری جو اُن کر لی مجھے حویلی سے دور جانا پڑتا تو بھائیوں کی نگرستار ہی تھی تب مجھے ہر امید جنا سے بندھی نظر آتی تھی منگیتر ہونے کے ناطے میں اسے اپنے ہر دکھ سکھ کی شریک بنانا چاہتا تھا مگر وہ ان دنوں غرور و تفاخر سے تھی گردن کے ساتھ ہمیں منہ لگانا کوارہ نہیں کرتی تھی آج جسے وہ ظالم کہتی ہے کل تک یہ ظالم اس کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا اور صرف ایک بات کہنے کے لئے ایک منٹ مانگتا تھا جو دینے کا جنا کے پاس وقت نہیں تھا پھر ذوالنواس سے اس نے شادی کی اسے درخوردختا نہ جانتی تھی جس ذون سے وہ ہمدردی جتاتی ہے اسے ایک لمحہ دیکھنے کی اسے فرصت نہ تھی۔ عنائیں نے وہ وقت چلتے کولوں پر ننگے پاؤں چل کر طے کیا ہے ان دونوں بھائیوں کی ہر ہر ضرورت اور خواہش پوری کرنے کے لئے دن رات ایک گئے ہیں اس وقت اس جنا محترمہ کو میں ایک باورچی و حویلی مزدور اور نجانی کیا کیا لگتا تھا وہ مذاق اڑاتی تھی کہ مجھ میں ایک اچھی آیا بننے کی صلاحیت موجود ہے وہ مجھے اپنے بچوں کے لئے آیا کی نوکری دے سکتی ہے۔ ایک رات ذون تیز بخار میں جل رہا تھا گھبراہٹ کے مارے میں نے سب سے پہلے جنا کو پکارا تھا میرا خیال تھا وہ میرا ساتھ دے گی مگر جب میں نے اسے ذون کی طبیعت کا بتایا تو غصے سے بولی۔

”تم نے اتنی ہی بات کے لئے میری نیند خراب کی میری بلا سے ذون بیمار ہو ذوالنواس بیمار ہو یا تم بھلے سے مر جاؤ تم لوگوں کی ڈاکٹر لگی ہوئی ہوں جو میرے سر پر سوار ہو گئے ہو۔“ عنائے مجھے اس کی بات سن ڈگن یا دے جبکہ یہ میرے تپتے دل پر لکھی ہے میں زندگی بھر اسے بھلا نہیں سکتا اس دن میں پیچھے ہٹ گیا میرے دل سے اس کی چاہت اس بے دردی سے نکلی کہ تمام بدن کو پتھر بنا گئی۔ انہی حالات میں مجھے ابو کی کچھ پراپرٹی کا مالک ہونا تھا کہ ہماری مارکیٹ ویلیو بڑھ گئی ہم سب کی آنکھ کا تارا بن گئے زوبیہ اور جنا کے لئے ہم پھر سے منظور نظر ہو گئے یہاں تک کہ حویلی میں ہماری شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں تب میں نے تریپ کا پتہ پھینکا اور شور کر دیا کہ سب پراپرٹی میرے نہیں صرف میرے بھائیوں کے نام ہے تب جنا کی اہمیت سامنے آئی اس نے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا اور نخوت سے شاہجہانی سے کہا۔

”مجھے بوسیدہ کھنڈرات کی تعمیر سے دلچسپی نہیں ہے نہ بیبی گھوڑوں کی مرہم پٹی ہے۔“ اس کی ہر بات عنائے میرے دل پر لکھی ہے میں نے اس کے ساتھ کچھ برا نہیں کیا بلکہ اس کا کیا اس کو لوٹایا ہے میری محبت میرے بزرگوں کی دعاؤں نے مجھے وہ دن دکھایا جب میں نے باقاعدہ احمد سے اپنے ہی باپ دادا کے کاروبار کو منہ مانگی رقم دے کر خریدا اس کی تمام پراپرٹی جو میرے ہی باپ دادا کا حق تھا میں نے حاصل کر لی وہ اپنی عیاشیوں کے باعث کنکال ہو چکا تھا اور حویلی میں ناکارہ پڑا نظر آتا زوبیہ اور جنا کو دونوں ہاتھوں سے پیسہ لٹانے کی جوت لگ گئی تھی اس نے انہیں جنگلی کر دیا تھا وہ جہاں پیسہ نظر آتا منہ مارنے لگتیں۔ ذوالنواس کو ابو کی پراپرٹی کا وارث سمجھ کر جنا نے اس سے میل جول بڑھالیا وہ کچھ ذہن کا لڑکا تھا اس کی اداؤں کے حال میں پھنس گیا حتیٰ کہ انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا میں نے ذوالنواس کو تمام تر حالات سے آگاہ کیا لیکن اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اس نے صاف کہا کہ چونکہ جنا نے مجھے ٹھکر ادا کیا ہے اس لئے میں اسے مدفن کرنے کی کوشش کر رہا ہوں

اس بات کے بعد میں نے خاموشی اختیار کر لی، شادی کے بعد جتنا کو میرے بھوٹ کا علم ہوا تو ذوالنواس پر بھی اس کی اصلیت کھل گئی وہ پیسہ پر جان چھیننے والی پراپرٹی میں ایک حصہ کے مالک ذوالنواس سے کیا وفا کرتی رات رات بھر گھر سے غائب رہتا دعا سے کلی طور پر غفلت برتاؤ ذوالنواس کو خاطر میں نہ لانا اس کا وطیرہ تھا ایک رات اسے تلاش کرتا ذوالنواس اسے جس حالت میں دیکھ کر آیا وہ برداشت نہ کر سکا اور ڈرامائیونگ کرتے ہوئے اس کی گاڑی درخت سے جا ٹکرائی سر پر سخت چوٹ آنے کی وجہ سے وہ کومے میں چلا گیا، حنانے اس تمام عرصے میں اسے ایک فالٹوشے سے زیادہ اہمیت نہ دی ہاں ذون کا حصہ بھی ہتھیانے کی خاطر اس نے ذون کو اپنی چکنی چیری باتوں میں الجھا لیا اور باقاعدہ پلاننگ کے تحت اپنی ہی ایک پری پیڈ ڈانس کے بارے میں غلط سلسلہ شکایتیں بیان کر کے ذون کی شادی کرادی، لیکن اب حنا کا دور آ مریت ختم ہو چکا تھا ذوالنواس کو ایک دن کومے سے ہوش آیا اور شاید اسے ہوش مجھ سے معافی مانگنے کے لئے آیا تھا وہ اپنی فرمائی پر سخت شرمندہ تھا اس نے مجھ سے معافی مانگنے کے ساتھ التجا کی تھی کہ دعا کو حنا کی غلیظ گودی سے دور رکھوں، ذون بھی ٹھوکر کھا کر لوٹ آیا تھا، ذوالنواس کے انتقال کے بعد حنا اب ہر طرف سے مایوس ہو چکی تھی اسے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے تانی ماہ کے آگے ہاتھ پھیلا نا پڑتا تھا۔

”تمہیں اعتراض ہے کہ حنا سے بچی کیوں چھینی گئی تو جان لو کہ یہ اس کے باپ کی وصیت تھی، تم اعتراض کرتی ہو کہ حنا کو حویلی سے کیوں نکالا گیا، تو اس کی وجہ بھی جان لو کہ میں نے عدویہ کو اشعر چاچا کے حصے کی انکم دینی شروع کر دی تھی حنا بیسے کی بوسو بھتی پھرتی تھی اس نے اپنے شیطان باپ کے ساتھ مل کر یہ گھناؤنی سازش کی کہ عدویہ کو زیر کر کے تمام انکم حاصل کر لی جائے، اس کا عیاش باپ رات کی تاریکی میں عدویہ کے پاس جا پہنچا، جبکہ حنانے کمر میں ایک فلکشن منقہ کر لیا تھا جس میں حویلی کے سب مکین مصروف تھے عدویہ کی چیخ و پکار کسی کے کانوں تک نہ پہنچی شوخی قسمت کہ میں اسی دن گھر لوٹا تھا اور گوشہ تنہائی کی خاطر اوپر پہنچ گیا اسی دن سے میں نے حنا اور اس کے خصیث باپ کو فلیٹ میں جانے کو کہا تھا، کیونکہ میں انہیں مزید حد سے کرنے کے لئے حویلی میں آزاد نہیں چھوڑ سکتا تھا۔“

”عنا اس حویلی کی تاریخ ابوزر جاہ اور اس کی آل کے لئے بہت کٹھن ہے میرا خیال ہے اب تمہیں مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کیا ہے؟“ زیدین نے فرنٹ بیٹ پر بیٹھی عنا کو دیکھا وہ باتیں کرتے کرتے گاڑی میں آ بیٹھے تھے زیدین ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے ہلکی سی ڈرامائیونگ بھی کر رہا تھا، زیدین نے ہر بات مربوط منظم اور مختصر بتائی تھی کہ عنا کو کوئی سوال کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی باقی رہا اس سب پر یقین کرنا تو زیدین کے چہرے کی چٹکی اور کرب اس کی ہر اک بات کے ضامن تھے۔ عنا کی خاموشی میں اب بھی فرق نہ آیا اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں، گاڑی ایئر پورٹ کے سامنے رکتے دیکھ کر عنا کے بے جان بت میں جان بھر گئی اس نے زیدین کے اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ پر اپنا کپکپاتا ہاتھ رکھ دیا اور لرزنی زبان سے بولی۔

”اب میرا تصور بھی تو بتا دیں۔“ عنا کا کہنا تھا کہ زیدین خود پر مزید قابو نہیں رکھ سکا اور اپنے ہاتھ پر دھرے اس کے ہاتھ کو دیوانہ وار چومتا ہوا بولا۔

”تمہارا تصور یہ ہے کہ تم نے مجھے پھر سے جینا سکھا دیا ہے اور جب میں جینے لگا تو تم نے کہا سانس لینا چھوڑ دو عنا میں.....“ زیدین کی بات اس کے لب میں ہی رو گئی تھی عنا نے دونوں ہاتھ سے اپنے کان پکڑ لئے تھے اس ادا پر کون قربان نہ ہوتا، اس کا دل تو دھڑکتا ہی عنا کے لئے تھا، زنگی سے بھر پور مسکراہٹ نے دونوں کے چہرے

شوخیان، مستیاں، رنگینیاں ہوں کہ دل فریبیاں ”النور حویلی“ آج سب ہی کامرکز تھی آج زین العابدین کا دلیرہ تھا تمام لاہور شہر حویلی میں سمٹ آیا تھا۔ زیدین نے عنا کی ایما پاتے ہی شادیا نے بیجا دیئے تھے جہا نکیر اور رانیہ کی ہنگامی آمد کے بعد خوب ہنگاموں اور رفتوں کے بعد وہ زیدین کے نام کر دی گئی تھی زیدین کا ہر کام ہی منفرد ہوتا تھا صبح مایوں کا غسل کیا گیا تو دوپہر میں مہندی کے تھال سجائے گئے اور رات کو وہ دلیرہ منعقد کئے ہوئے تھے شاید وہ دنیاوی معاملات نمٹا کر ایک دوسرے کے لئے وقف ہو جانا چاہتے تھے۔

مایوں کی رسم میں اس نے عنا کے چہرے بازو، گال پر اٹن کے خوب نین نش سجائے تھے تو مہندی کی رسم میں تو اس نے مہندی کا تمام تھال اٹھا کر اس کے پاؤں کے نیچے رکھ دیا تھا وہ پانی کے ٹپ کی طرح مہندی کے تھال میں پاؤں ڈالے بیٹھ گئی تھی نوجوان پارٹی کو تو شوخی بھول ہی چکی تھی زیدین کی وارسی اور واری جانی ادا نہیں دیکھنے سے ہی کسی کو فرصت نہ تھی۔ دلیرہ کے فنکشن میں سلور کلر کا شرارہ موتیوں کی کڑھائی سے سجا بھاری کا مدارو پیسہ بہ لباس اس کے لئے نیا تھا وہ عام دلہنوں سے زیادہ تھکان محسوس کر رہی تھی لیکن اس کے ردی کی سنور تادید کے قابل تھی اس لئے کوئی بھی اس سے ہمدردی کرنے کو تیار نہ تھا کہ وہ اپنا ڈریس چیلنج کرے خود زیدین نے بھی اس کی التجا کرتی نگاہیں نرمی سے فنی میں سر ہلا کر رد کر دی تھیں اس منظر سے نگاہ ہٹانے کو تو وہ بھی تیار نہ تھا زیدین نے عنا ہی کے ساتھ میچنگ کرتے ہوئے سلور کلر کا لائٹ کورٹ اور بلیک ٹائٹ پینٹ پہن رکھی تھی اس کے کالر پر لگے سفید موتیوں جیسے ٹن اسکے چہرے کی طرح دمک رہے تھے۔ مہمانوں سے خوب علیک سلطنت کرنے اور حق میزبانی ادا کرتے زیدین کو عنا اشاروں کنایوں میں اسٹیج پر بلا رہی تھی مگر وہ انجان بنا گھوم رہا تھا اتنے میں دعا کی چہکتی آواز نے سب کو متوجہ کیا وہ کہیں سے دوڑتی ہوئی آ کر زیدین کے گلے سے آچھٹی تھی زیدین اسے اٹھائے اسٹیج پر جلا آیا تھا اور خوب چومے جارہا تھا سب ان کی محبت پر مسکرا رہے تھے زیدین نے عنا کو دلچسپی سے خود کو دیکھنا پایا تو سر گوشی کرتے ہوئے بولا۔

”فکر نہیں کرو اس کے بعد تمہاری باری ہے۔ عنا جھینپ کر سر جھکا گئی دعائے عنا کے کا مدار جوڑے کو ٹولتے ہوئے کہا۔

”تا تو یہ کون ہیں؟“ وہ دون کو چاچو اور زیدین کو تا تو پکارتی تھی زیدین کو یہ مخاطب پسند نہیں تھا مگر ذون نے اسے سکھا دیا تھا تو اب وہ اسے بھلانے کو تیار نہ تھی۔

”یہ آپ کے تا تو جان کی جان ہیں۔“ زیدین نے دعا کو عنا سے متعارف کرایا وہ بھی اس انداز میں جو اس کے اوپر سے گزر گیا۔

”عنا! ریکلٹس کر رکھو ہمیں جلد ہی دعا کے ساتھ جمع کرنا ہیں۔“ زیدین مسلسل عنا کو زورس کر رہا تھا جمع کرنے کی اصطلاح پر تو ایک کثیر اجتماع کا تصور کر کے ہی وہ لب دم ہو گئی زیدین اس کی صورت دیکھ کر کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

”دعا! میرے پاس آؤ۔“ حنا دونوں بانہیں پھیلائے دعا کو پکار رہی تھی جو زیدین کی گود میں گھسی ہوئی تھی زیدین نے حنا کی آواز سنتے ہی اسے بانہوں میں چھپا لیا تھا حنا آگے بڑھ کر زیدین کے مضبوط حلقے سے دعا کو لینے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

”میری بیٹی میرے حوالے کر دو زیدین!“ حنا سرخ چہرے کے ساتھ تپتپہ کرتی ہوئی بولی۔

”ذوالنواس کی بیٹی اب کبھی تمہارے پاس نہیں آئے گی۔“ زیدین نے اسے یہ سچے بیوروں سے بلا، خاص میں
 سے کثیر تعداد تقریب کے اختتام پر گھروں کو جا چکی تھی تاہم ابھی تک مہمانوں سے ہال مکمل طور پر خالی نہیں ہوا تھا
 حویلی کے مکین تو کبھی موجود تھے اور حنا اور زیدین کے مابین کلام کو خاموش تماشا کی بنے دیکھ رہے تھے۔
 ”زیدین! اک یاں سے اس کی پچی چھین کر تمہیں کیا مل جائے گا۔“ حنا کا شان و نقا خرمی ہو چکا تھا وہ
 صرف ایک ماں رہ گئی تھی۔

”میرے بھائی کو سکون اور دعا کو تمہاری غلیظ گود سے نجات مل جائے گی“ آج یاں ماں کی رٹ لگائے ہوئے
 ہو اس ماں کو اس وقت اپنی بیٹی یاد نہ تھی جب اسے دو وہ پلاتے وقت گلسر کی فکر رہتی تھی تو گود میں لیتے وقت کپڑے
 خراب ہو جانے کا ڈر تھا، کئی کئی دن تک اپنی بیٹی کی صورت نہ دیکھنے والی ماں کو آج کون سے تمنے لگ گئے ہیں۔“ زیدین
 اگلے پچھلے سارے حساب بے باق کر رہا تھا: ہ کی مروت کے موڈ میں نہیں تھا خود دعا نے بھی اس کی بانہوں سے
 نکلنے کی سعی نہیں کی تھی وہ ماں کی گود کی گرمی کی زیادہ عادی نہ تھی ایک ننگ زیدین کے چہرے کو تھے جارہی تھی۔
 ”ذون! تم ہی اپنے بھائی کو کچھ سمجھاؤ مجھ پر رحم کرے۔“ حنا ذون کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”بھائی! کچھ یاد ہے کہ آپ نے اپنے دور حکمرانیت میں کسی پر رحم کھا یا ہو میرے بستر مرگ پر پڑے جاتی
 کے بارے میں کیا خیال ہے سات سال تک آپ نے اس بے حس و حرکت شخص کے کمرے میں جھانک کر نہیں
 دیکھا آج اس کی نشانی کے لئے اتنی بے قراری کیوں ہے؟“ ذون کے دل سے اس کی رہی سہی عزت بھی نکل
 ہو چکی تھی اس کا لہجہ اور انداز بھی سخت ترین تھا۔

”چھوڑو حنا! ان ظالموں سے کیا باتی ہو؟ یہ کیا جانیں تیر اور ذون۔“ زوبیہ بیٹی کی دادی کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔
 ”سچ کہا چھپو! ہم کیا جانیں درد کیا ہوتا ہے باپ کو خون میں ڈوبا دیکھ کر کہاں درد ہوتا ہے؟ ماں کو بے آسرا
 دیواروں سے سر ٹکراتے دیکھ کر تو درد نہیں اٹھتا بھائی کی جوان لاش کو دفناتے وقت درد کا کیا کام درد تو بس آپ
 لوگ جانتے ہیں جنہیں پہلی بار زخم لگاے زخمی دل زخمی روح والے تو درد سے نا آشنا ہیں۔“ زیدین جب بولنے
 پر آتا تھا تو کسی کے کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا تھا، زوبیہ اور حنا کو تو زیدین کے آگے بولنے کی عادت
 ایک عرصے سے بھول چکی تھی زیدین کا ایک ایک لفظ لگ بھگ کی انتہا تھا سب کی آنکھیں نم تھیں تھیں کہ بچہ پارٹی
 بھی افسردہ تھی جو کہ کچھ خانتی بھی نہ تھی۔

”زیدین! ہمیں معاف کر دو۔“ زوبیہ کی زبان سے ادا ہوتے یہ الفاظ سب کے لئے غیر متوقع تھے مگر خدا کا
 انصاف یہ ہی تھا جس دولت کی خاطر وہ اپنے بھائیوں کی جان لے چکی تھیں وہ بھی بے وفا نکلی تھی احمد فاج کے
 اٹیک کے بعد محتاجی کی زندگی گزار رہا تھا تو پائی پائی کو کھتا خ ماں بیٹی کے لئے کوئی جاہ نہ رہی تھی سب سے
 بڑھ کر وہ زیدین کی عظمت کے آگے سر جھکا چکی تھیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی زیدین نے ان کے خلاف
 کوئی کارروائی نہ کی اور اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا تھا اور خدا نے خوب انصاف کیا تھا کہ آج ان کے دکھ میں کوئی ان
 کا ساتھ نہ تھا۔

”عنا! اللہ تمہیں ماں کا درجہ عطا کرے گا اس ماں پر رحم کر دو۔“ حنا اب دہن بنی عننا سے التجا کرنے لگی، عننا نے ایک
 نظر زیدین کو دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دعا کو زیدین کے بازوؤں سے نکال کر حنا کی گود میں ڈال دیا۔

”آپی! ہم کون ہوتے ہیں سزا جزا کا فیصلہ کرنے والے اللہ جانے اس کا انصاف جانے۔“ حنا دعا کو دیوانہ
 وار چومتی اسے تشکر کی نگاہ سے دیکھتی حویلی کے اندر چلی گئی۔ سب نے حنا کی دریاوولی کے ساتھ دیدہ دلیری کو بھی

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک

سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

رنگ بھری نگاہوں سے دیکھا کہ وہ کمال استحقاق سے زیدین کے خلاف بیٹا فیصلہ کر گئی تھی کیونکہ وہ جاہلی تھی کہ زیدین کا مقصد صرف جتنا کوسدھارنا تھا اذیت دینا نہیں یہ مان بھی اسے زیدین کی جاہت نے بخشا تھا۔

☆☆☆☆

”نظریں جھکی جھکی سانسیں رکی رکی
وہ سامنے ہیں بیٹھے چھائی ہے بے خودی
تو ہی بتا دل کو بھلا
کیسے کوئی سنبھالے
اسے دلنشین مسافر“

زیدین کے مضبوط لبوں سے ہلکی سی گنگناہٹ اسے غرق حیا کر رہی تھی زیدین کے خواہناک کمرے میں کچھ ہی دیر ہوئے وہ استحقاق کے ساتھ داخل ہوئی کبھی بیڈ پر بکھری پتیوں کے اد پر ہی نیم دراز ہوتے اسے صرف اور صرف بھاری کا مدار جوڑے سے رہائی کی خواہش تھی جس نے اسے توڑ کے رکھ دیا تھا اسے صد فیصد یقین تھا کہ کچھ ہی دیر میں اس کی گردن کو ساتھ ہی لئے عروسی دوپٹہ زمین پر آ جائے گا لیکن وہ زیدین کی اجازت لئے بغیر یہ جسارت کرنے کے حق میں نہ تھی اس لئے ٹڈھال بے حال بیڈ پر سیدھا لیٹے آنکھیں بند کئے گہرے سانس لے رہی تھی کہ کانوں میں زیدین کی گنگناہٹ سنائی دی جو نجانے کب روم میں داخل ہو کر اس کے پاس بیڈ پر آن بیٹھا تھا۔ وہ اتنی بدحواس ہو گئی تھی کہ آنکھیں کھولنا تو درکنار گروٹ تک نہ لے سکی زیدین کا کمال شخصیت تھا کہ وہ جہاں ہوتا وہاں وہ ہی ہوتا تھا اور جب عنما کے پاس ہوتا تو پھر تو اس کی مستی و بے خودی اسے اور بھی سحر انگیز بنا دیتی تھی تب تو عنما کو لگتا کہ وہ کبھی تھی ہی نہیں ازل سے تھا تو اس کے وجود میں زیدین ہی تھا۔

”عنا! کچھ ایسا کرو کہ یقین آ جائے کہ تم میرے پاس ہو۔“ زیدین کی بو جھل سرگوشی کے ساتھ بھاری ہاتھ لے اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا وہ چاہ کر بھی آنکھیں کھول کر اسے دیکھ نہیں پا رہی تھی اس کی نازک ناک زیدین کی ناک ٹکرانے سے سرخ پڑ گئی تھی۔

”مجھے یقین دلاتے دلاتے اپنا یقین کھو دیا۔“ مدھم اور سکیپاتے الفاظ میں کتنے مشہوم پوشیدہ تھے زیدین خوب واقف تھا اسے خراج عقیدت بخشتے ہوئے اسے بیڈ سے اٹھا کر اپنے اوپر لے لیا تھا عنما بھاری پونے اٹھاتے سخت چوڑے سینے پر سر رکھ کر یوں سانس لینے لگی جیسے لمبی مسافت پیدل طے کر کے آئی ہو زیدین کو اس کے بھاری جوڑے کی کارستانی کا اب علم ہوا جب وہ خود اس کے سینے اور گردن پر چھینے لگا۔ دھیرے دھیرے عنما بھاری دوپٹہ زیورات سے خود کو آزاد پانے لگی زیدین اسے اپنی آغوش میں لئے لئے ہر فکر سے رہا کر رہا تھا۔

”اے ساحرہ کا کامل گھائل کروناں مورچہ بندی کیوں کئے ہو؟“ زیدین کا اشارہ اس کے عروسی گیٹ اپ کی طرف تھا جن سے آزاد ہو کر وہ ننھی چڑیا اس کی بانہوں میں دبکی ہوئی دکھائی بھی نہ دیتی تھی۔

”ساحرہ وہیں ساحرہ ہمیں کہتے ہیں۔“ منمناتے جواب میں بلا کی شوخی تھی زیدین کی صحبت نے اسے بولنا سکھا دیا تھا۔

”ساحرہ کہاں ہیں ہم ہم تو وہ بیچارے ہیں زندگی میں پہلی بار سا لگرہ منائی اور ایک بھی گفت نہیں ملا۔“ ایک موج کی طرح بہتی وہ زیدین کی بات پر یکدم آنکھ پوری کھولے اسے تکلے لگی۔ زیدین ترنم میں کب رو بدل کر

دے کیا پتہ چلا تھا؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤا مجسٹ [199] اکتوبر 2016ء

”کیا مطلب ساگرہ گفٹ...؟“ عنا پیچھے ہوتی حیرت سے دہرائے گئی۔

”پھر بھول گئیں میں نے تمہیں اپنی برتھ ڈے پرائووائٹ کیا تھا اور تم گفٹ دیئے بغیر ہی لوٹ گئی تھیں۔“
 زیدین نے چار دن پہلے کی رات کا ذکر کیا جس میں وہ اسے دشت میں دھکیل کے لوٹ آئی تھی عنا کے لئے اس وقت کو یاد کرنا اور اس کی بابت گفتگو کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، لیکن زیدین کا نرم لہجہ کہیں سے بھی ثابت نہیں کرتا تھا کہ وہ اسے کٹہرے میں لاکھڑا کرنا چاہتا ہے۔

”وہ..... میں تو.....“

”اگر تم سمجھتی ہو کہ اس طرح بھاگ کے تم رسم تحفہ سے جان بچا لو گی تو ایسا ہو گا نہیں یہ رسم تو ادا کرنا ہی ہوگی۔“ اس کی لڑکھائی وضاحت کو کاٹتے زیدین ٹھنڈے بیٹھے چشمے سے، اس لہجے میں گویا ہوا عنا کی احتسابی لمحہ کی خوبی کو سوں میل دور جاسوئی تھی وہ مطمئن سی مہکتی سانس خارج کرتی ایک بازو بند پرنگائے اس پر تمام بدن کا بوجھ ڈالے اس کے مقابل ہوئی تھی۔

”آپ سے بھاگ کے کہاں جاؤں گی آپ کا گفٹ مجھ پر ڈیوے۔“

”تو دو۔“ زیدین نے اس کے سامنے اپنی ہتھیلی پھیلا دی، عنا ایسی غیر متوقع حرکت پر بوکھلائی گئی۔

”ابھی اس وقت کہاں سے دوں صبح کچھ خریدوں گی تو.....“

”لیکن مجھے تو ابھی چاہئے۔“ بچوں کے سے انداز میں ضد کرتا زیدین اس کی بات پھر کاٹ گیا۔

”اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ عنا بے چارگی سے بولی۔

”جو اس وقت ہے وہ دے دو۔“ اذیل گھوڑے کی طرف سے ضدی تکرار جاری تھی وہ نازک جان نہیں

پارہی تھی کہا سے کیسے ڈیل کرے۔

”اس وقت میرے پاس کوئی میل گفٹ نہیں ہے۔“ وہ اچھی خاصی فرج ہو چکی تھی زیدین جیسے سوہر شخص سے

ایسی غیر سنجیدگی اس کے تصور سے باہر تھی۔

”تو جو میل کے لئے گفٹ ہو سکتا ہے وہ دے دو۔“ زیدین ہنوز اپنے موقف پر قائم تھا، عنا کی جھنجھلاہٹ سوا

نیزے پر تھی ایک ذرا بے گفٹ کے لئے قیمتی سبب برباد کر دینا کہاں کی عقلمندی تھی لیکن ایک انتہائی عقلمند اور

دانا شخص اس غفلت کا مرتکب ہو رہا تھا۔

”اس وقت میرے پاس سوائے اس جوڑے اور جیولری کے کچھ نہیں ہے۔“ عنا بیڈ کی پانکٹی ریپارے

باندھے بیٹھی زیدین کی خود پر جی نگاہوں اور مسلسل جاری تکرار سے اچھی خاصی آؤٹ آف کنٹرول ہو چکی تھی۔

”تمہیں قدرت نے منام سے نوازا ہے انہی میں سے کچھ نوازو۔“ زیدین اسے سر سے پاؤں تک نظروں

میں سموتا سرگوشی میں بولا، عنا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہاتھ جھاڑ کر ایک بار پھر خالی ہاتھ ہونے کا اشارہ کیا، جو ابا

زیدین نے بھی کچھ نہ کہتے ہوئے محض شہادت کی انگلی سے اس کے سرخ باریک لبوں کو چھو لیا تھا، عنا اب تک کی

تکرار سے اس کا اصل مدعا جان کر بے دم ہو کر نگاہیں جھپکائی تھی زیدین کی کوئی بھی بات لایعنی نہیں ہوتی تھی یہ بات وہ

کیوں بھول جاتی تھی۔ رات اس کی تھی بات اس کی تھی وہ روم روم سجائے اس کی تھی، پھر بھی مانگنے کے لئے ہتھیلی

پھیلانے والے کو وہ کیسے خالی لوٹا دیتی، اس کا سر جھکانا تھا کہ دیوانے جذبات کا سراٹھاتا تھا، وہ موم بن کے کی اس کی

بانہوں میں دھڑکنے لگی وہ صورت گرا سے من پسند سانچے میں ڈھالنے کا موم پھلتی جاتی تھی شب سنورتی جاتی تھی۔

☆☆☆ End ☆☆☆



خوشبو کا حصہ

افسانہ

حور بیٹہ سعد

آج ایمین نے حد کر دی تھی۔ ہر وقت کے گھر اس نے شک کی نظر اور کڑی کر دی۔ حتیٰ کہ سامیر کے لڑائی جھگڑے باہر تک پہنچنے لگے۔ سامیر پر اپنی ماں اور بہن بھائی سے بات بھی کرتا تو وہ نمبر

رداڈا جٹسٹ [202] اکتوبر 2016ء



تھا۔ ایمن کی نظر اس لڑکی پر پڑی تو اس نے فوراً
اپنی چپل اتار کر اس لڑکی کو مارنا شروع کر دیا۔
”یہ میرے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔“ ایمن یہی
بولے جا رہی تھی اور مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔

”کیا کر رہی ہو پاگل ہو گئی ہو۔“ سامیر اس
کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی تک لے گیا۔

”ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں وہ کیوں دیکھ رہی
تھی میرے شوہر کو۔“ وہ بہت غصے سے بولی۔

”تو اگر اس نے ایک نظر ڈال لی۔
رہتے سے ہم گزر رہے ہیں تو اس میں کیا برائی

چیک کرنے بیٹھ جاتی۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اتنی
طویل ہوتی چلی گئیں کہ دونوں کے درمیان
فاصلہ بڑھنے لگا۔

☆.....☆

پھر ایک دن وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔
سامیر بہت ہینڈسم اور گڈ لوکنگ اور اسمارٹ
دکھائی دیتا تھا۔

ایمن، سامیر ساتھ ساتھ مووی دیکھنے گھر سے
نکلے تھے۔ والیسی سے سنیہا ہال سے نکلنے کے بعد
اب 23، 25 سال کی لڑکی نے سامیر کو دیکھ لیا

”تم میرے شوہر ہو۔ میں کسی کو یہ حق نہیں دوں گی کہ وہ آن لائن آ کر تم سے بات کرے یا تمہاری طرف دیکھے۔“

”ایمن! تم پاگل ہو بالکل مت کرو یہ حرکتیں میں تمہک گیا ہوں تنگ آ گیا ہوں۔“

تیز رفتاری سے چلتی ہوئی گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرائی اور اس نے دوسری گاڑی کو ٹکرا دی۔

سامیر بے دھیانی میں غلطی کر چکا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ ایمن اور بچے کو زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ پولیس آگئی تھی اور بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔

ایمن کی زندگی انہی مسائل میں گھری رہی کہ میرا شوہر کسی کو دیکھ رہا ہے یا کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

شک و شبہات میں گھری ہوئی عورت کبھی اپنا گھر نہیں بنا سکتی۔ ایمن کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

سامیر گھر سے زیادہ تر باہر رہنے لگا مگر ایمن اس پر بھی خوش نہیں تھی۔ ہر وقت شک کرتی۔ گھر

اور باہر وہ کہیں سامیر کو سون نہ لینے دیتی۔ بس وہ سامیر سے یہ چاہتی کہ سامیر گھر رہے اور اس کی

تعریف کرتا رہے۔

ماہ و سال آگے بڑھتے رہے۔ ان دونوں کی جنگ میں سات سالہ بچہ ان کی تو تو، میں میں سے تنگ آ کر رونے لگتا۔

جب وہ لوگ پاکستان اپنی ماں سے ملنے آئے تو بھی ذرا اسی بات کی شکایتیں کرتا۔

ایمن کا ہر وقت آئینے کے سامنے کھڑے رہنا، اپنا فکر دیکھتے رہنے، روز لڑائی جھگڑے،

خوراک میں صرف فروٹ اور کچھ نہ کھانا، بلیک چارجٹ کے کپڑے پہن کر وہ خود کو اسمارٹ ظاہر کرتی۔

”دادی! یہ لوگ روز لڑتے ہیں بہت لڑتے ہیں۔“ سات سالہ مہیب نے دادی کے سامنے کہا اور اس کی آنکھ سے آنسو کا قطرہ ٹپکا تھا۔

ایک دن سامیر نے اپنی ماما کو فون کیا اور کہا۔ ”ماما! ایمن نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا۔ خونم خون ہو رہا ہے۔ اس کے بھائی کو فون کر رہا ہوں تو وہ نہیں اٹھا رہا۔ اس کی ماں بھی کال پک نہیں کر رہی کیونکہ ایمن نے ان کو منع کر دیا تھا اس لیے وہ سب کال پک نہیں کر رہے۔“

”تم تفصیل لکھ کر میسج کر دو۔ اس کی ماں، بہن اور بھائی کو تا کہ تمہارے پاس ایک پروف رہے کہ یہ یہاں بیٹھی یہ کر رہی ہے۔“

لیکن پھر وہی سمجھوتہ..... دو چار ماہ بعد پھر لڑائی جھگڑا.....!

گھر پھر اسی طرح سے ہو گیا۔

آخر ایک دن سامیر ان تمام حالات سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ گیا۔

ہوٹل میں ایک مہینہ رہا۔ پھر دونوں کا بیچ اپ ہوا۔ پھر معافی تملانی۔ ایک مہینے کے بعد پھر وہی کہانی۔

ایمن صبح اٹھ کر آفس چلی جاتی۔ گھر میڈ سنبھالتی۔ ہر روز بیچ اور ڈنر باہر ہوتے۔ ہر وقت سامیر کی نگرانی وہی تازکا جھانکی۔

”دوستوں کو چھوڑ دو۔“ ایمن کہتی۔

مگر سامیر بچپن سے ایسا تھا کہ جو لکیر ماں باپ نے کھینچ دی ان سے باہر نہ نکلتا۔

سامیر کی ماں نے چلتے چلتے اس کے کان میں بات ڈال دی تھی۔ ”تیریز تمہارا بچپن کا دوست ہے اس کو کبھی نہ چھوڑنا۔ نئے نئے دوست نہیں گئے لیکن تیریز تمہارا بچپن کا دوست ہے۔“

لیکن ایمن کو زیادہ جڑ تیریز سے ہی تھی کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

نکل گیا اور وہ کسی طور سے سمجھوتہ نہ کر سکی۔ سامیر بے حد اپ سیٹ تھا آخر ایک دن اسے ایمن کو طلاق دینی ہی پڑی۔

وہ اپنے رب کے سامنے روتا رہتا۔ ماں نے اس کے لیے ایک لڑکی پسند کر کے اس کی دوسری شادی کا فیصلہ کیا۔

سامیر بھی آخر راضی ہو ہی گیا لیکن ماں مسلسل استخارہ کرتی رہی کہ ”اے رب! اگر یہ لڑکی ہمارے حق میں بہتر ہے تو اسے ہمارے گھر کا نصیب بنا ورنہ اسے بھی دور کر دے۔“

☆.....☆

سامیر ایک دن ویرانے سے گزر رہا تھا خاموش جزیرہ تھا جہاں کچھ ٹوٹے پھوٹے مکانات اور آبادی کم تھی۔ وہاں سے چہنچہ اور رونے کی آواز آرہی تھی۔

”کوئی میری مدد کر دے۔“ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ یہ میرا وہم ہے اسے ایک بھینسی بھینسی سی خوشبو آرہی تھی۔ اس کا مجس بڑھتا چلا گیا وہ اور آگے بڑھا اور آگے بڑھا حتیٰ کہ سسکیاں قریب آگئیں۔ بے یار و مددگار ایک لڑکی رسیوں سے بندھی ہوئی نظر آئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ پہچان گیا۔

”تم.....!“

”رکو.....رکو۔“

”نہیں وہ لوگ کھانے پینے گئے ہیں وہ لوگ واپس آئے تو پھر مجھے قید کر دیں گے۔ دس دن سے میں بھوکی ہوں۔“

وہ نقاہت سے گر پڑی۔

سامیر بھاگ کر اپنی کار کے قریب آیا۔ اس نے لڑکی کو گاڑی میں ڈالا اور کار اسٹارٹ کر دی تھی۔

وہ قریب ریسٹورنٹ کے قریب پہنچا اور اس

دہنوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں، نہ جانے کہاں جاتے ہیں، کیا کرتے ہیں۔

پھر ذہنی ہوا تیسری بار سامیر اپنا بیگ لے کر گھر چھوڑ گیا تھا۔ اس بار ان کے درمیان ایک لمبا وقفہ آ گیا تھا۔

بات سمجھوتے پر نہیں اب طلاق پر چلی گئی تھی۔ شاید ایمن باز آ جائے اس لیے سامیر نے ایک طلاق اسے دے دی تھی۔

سامیر کی ماں نے بہت ہنگامہ کیا کہ یہ تم نے کیا کر دیا۔

”مما! میں نے یہ سب پریشردانے کے لیے کیا ہے تاکہ ایمن ڈری رہے۔“

پھر اس نے ایمن سے رجوع کر لیا۔ ایک طلاق کے بعد شوہر بیوی سے رجوع کر سکتا ہے۔

وہ گھر بچا تار ہا مگر ایمن کا شک و شبہ کم نہ ہوا کہ کیوں فون کیا، کس کو کیا.....!! اللہ جانے کہاں سے معلوم کر لیتی تھی۔

زندگی کی پھر وہی رفتار وہ پھر بیگ لے کر بھاگ رہا تھا۔

پھر دوسری طلاق بھی ہو گئی ان کے درمیان۔ سامیر شرمندہ تھا کہ اس سے کیا ہو گیا۔ رجوع کرنے کا پھر ایک وقت آیا۔ کورٹ پکھری کے معاملات بھی شروع ہو چکے تھے۔

سامیر نے کتنی اذیتیں اٹھائیں تھیں یہ وہی جانتا تھا۔

سامیر پورے گھر کا خرچہ ایمن کو دیتا۔ بچے کی فیسیں اور تمام اخراجات ادا کرتا مگر ایمن بے قابو رہی۔ بس یہی کہتی تھی کہ مجھے طلاق دو مگر سامیر دیتا نہیں تھا کہ اس کا گھر بنا رہے۔ ورنہ

اس کا بچہ زلن جائے گا۔ پھر اسی بھاگ دوڑی میں رجوع کا وقت بھی

ہوں۔ میری زندگی سے میری بیوی ایمن چلی گئی ہے۔ ہم دونوں الگ ہو گئے ہیں میرا ایک بیٹا بھی ہے۔ ویسے تو میری ماں نے میری بات کہیں طے کر دی ہے۔“ اس نے وہیں سے ڈرتے ڈرتے فون کیا تھا پوری تفصیل اس نے بتائی تو ماں بولی۔

”تمہارے نصیب میں وہ لڑکی عندلیب نہیں ہے۔ اللہ نے تمہارے لیے اس کو چنا ہے۔ یہ میرا اور تمہارا فیصلہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اگر وہ راضی ہے تو میں بھی راضی ہوں۔“ سامیر حیران رہ گیا۔ پھر اس نے مڑ کر روبا کی جانب دیکھا اور اس نے پوچھا۔

”ایک بھنی بھنی سی مہک تھی جو مجھے تمہارے قریب لاتی چلی گئی اور میں یوں تم تک پہنچ گیا یہ کون سی خوشبو ہے مجھے بہت پسند آتی۔“ وہ آنسوؤں بھری آنکھوں، لمبے لمبے براؤن بالوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے ہونٹ اس پر رکھ کر بولی۔

”میں ہمیشہ لائف بوائے شیپو استعمال کرتی ہوں۔ آج اس کی خوشبو نے مجھے ایک نئی زندگی دے دی۔“

وہ مسکرا کر اس کی جانب دیکھ کر بولی۔ سامیر نے ہنستے ہوئے اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔ ”آئی لو یو۔“ ”واٹ.....؟“ وہ حیران ہو کر سامیر کو دیکھنے لگی کہ اتنی جلدی وہ فری ہو گیا۔ ”لو..... آئی لولائف بوائے شیپو۔“ ابھی تک سامیر روبا کے بالوں سے آنے والی خوشبو کے حصار میں تھا۔

نے اس کے لیے جوس لیا اور اس کے قریب کر دیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”میں اب کہاں ہوں؟“ ”تم ایک آبادی کے ریستورنٹ کے قریب ہو۔“

لڑکی نے نظر اٹھا کر باہر دیکھا۔ ”ہاں میری ماں اسی جگہ تو لے کر آئی تھی اور یہیں سے وہ لوگ مجھے لے گئے تھے۔“

سامیر نے تیز گاڑی اشارٹ کی اور چلائی۔ وہ دریائے راوی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ لڑکی بھی پوری طرح ہوش میں آگئی تھی۔ اس نے اپنا نام روبا بتایا۔

راوی کنارے کی شام ہلکی ہلکی بارش کی پھوار گرنے لگی۔ دونوں دریا کے کنارے چلتے ہوئے پھر گاڑی میں آکر بیٹھ گئے تھے۔

”تمہیں کہاں جانا ہے۔“ سامیر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس بادلوں والی آنکھیں جن میں بارش بھری تھی۔

”میں لاوارث ہوں میرا کوئی گھر نہیں۔“ اس کی آواز میں دریائے راوی کی لہروں کی طرح کھنک تھی۔ پھر وہ خود ہی جلدی سے بول پڑی۔

”میری ماں مر گئی تھی۔ میرے باپ نے مجھے اپنے دوست کو ذمے دیا۔ وہاں میں عزت سے رہی، پلٹی بڑھی لیکن اس دن جب میں نے آپ کو دیکھا تھا لیکن پہلے آپ نے مجھے دیکھا تھا تو میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ اس دن سے آج تک میرے والدین مجھے طعنہ دے رہے ہیں کہ مجھے ایک عورت نے جوتیوں سے مارا تھا۔“ سامیر کو سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

”مجھے سب یاد ہے میں تم سے سوری کرتا

قریبانی و فرح ناز افسانہ



جاری قبائلی رسم و رواج عورت کو سانس لینے کی اجازت تو دیتے ہیں مگر اس کا قرض چکانا پڑتا ہے آزاد خان کے خاندان کی رسم تھی اگر لڑکی کے لئے خاندان میں رشتہ نہیں تو ساری زندگی گھر بیٹھ کر خوشی سے قید تباہی کاٹے کہ خاندان سے باہر نہ لڑکی جائے نہ جائیداد۔ آزاد کی لاڈلی چھوٹی بیٹی شہ پارہ کی بد قسمتی تھی جو باپ کے دل کو نرم کرتی تھی کہ تا عمر وہ ہی اس کا سہارا تھے۔

”گل رخ! قسم سے تم پر لال رنگ بہت کھلتا ہے‘ جان لے لو گی تم سہل لالہ کی‘۔ شہ پارہ کی شرارت عروج پر تھی۔

”ٹھیک کہتی ہیں اموجان جیاشرم تو ختم ہو گئی ہے تم سے“۔ گل رخ اس کی بے باکی پر تپ اٹھی تھی۔

”ارے جاؤ جاؤ ایک دن کے بعد دیکھیں گے بی بی تمہیں بھی کیوں آئی۔“

”بس کرو دست تنگ کرو اسے وہ رو دے گی سہلے ہی اپنا ڈرتی ہے وہ سہل سے“۔ زرتاج نے گل کو تھکے لگا کر سنی دی تھی۔

”تو کیا نہ ڈروں بچپن میں ساتھ کھیلتے تھے تو اتنا لڑتے تھے بڑے ہو کر جو پردہ ہوا تو کبھی بات بھی نہ ہوئی سلام دعا سے آگے وہ رہتے بھی شہر میں ہیں سچ مجھے تو ان کا چہرہ بھی بھول گیا ہے“۔ گل رخ کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا تھا۔

”یہ دکھ ہے آپ کو میڈم غم نہ کریں اب کبھی نہیں بھولیں گی آپ سہل بہزاد خان کا چہرہ آخر کو وہ ہو جائیں گے آپ کے“۔ شہ پارہ کسی طرح باز نہیں آ رہی تھی وہ خوش بہت تھی اپنی دوست کے لئے وہ جتنا بھی دنیا کے سامنے ہنستی مگر ایک عورت تھی اور اپنی جیسی اذیت میں وہ گل رخ کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ شہ پارہ کا دکھ زرتاج بخوبی جانتی تھی کہ دونوں ہی بناء پھولوں کی ڈالی ہمیشہ خزاں اوڑھنے والی تھیں، بارات کے دن لا کھا اموجان اور سب خواتین کے روکنے کے

اور جو شہ پارہ سہل خان کا راستہ روک کر نیک مانگ

’اڑوہ میرے جہاں شہ پارہ کیا کرتا اے تم جانتی ہو تمہارا آواز مردان خانے تک جاتا ہے آہستہ ہنسا کر دیکھ نہیں آتا تم کو“۔ اڑوہ اموجان! نہ روکیں ایک اس کی ہنسی تو ہے جو زنان خانے میں اس قید خانے میں روشنی کا رو ہزن لگتی ہے بہار کی ہوا محسوس ہوتی ہے۔“ زرتاج نے اموجان کو ٹوکا تھا جو ہمیشہ شہ پارہ کی ہنسی سے خفا رہتی تھیں۔

”خیر سے ایسا کیا ہو گیا ہے زرتاج جو تمہیں یہ گھر قید خانہ لگنے لگا۔“ بڑی بھابی نے اس کی بے بسی پر بھر پور طنز کیا تھا مگر اموجان نے ان کی بولتی بند کی تھی۔

”اوبی بی! خیر سے سہاگن ہو عورت ہو عورت کا غم سمجھو تمہارا نصیب تھا تمہیں ملا اس بد نصیب زرتاج کا تو کبھی نصیب نہیں کھلے گا جانتی ہو ماں باپ کا گھر بہت پیارا سہی مگر ایک وقت کے بعد یہ قید ہی بن جاتا ہے اللہ بھلا کرے سب کا“۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی تھی۔ جب کے زر گل خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی تھی۔

”اموجان جوڑ تو میرا بھی نہیں ہے مگر میں تو بڑی خوش ہوں یہ آپ لوگوں کی باتوں سے زرتاج آپی احساس کمتری کا شکار ہیں۔“ شہ پارہ کی زبان پھر چلی گئی۔

”او اللہ مارا اپنی شادی کا خود بات کرتا ہے سارا شرم کتابوں میں بند کر دیا اے لڑکی یہ اللہ کی مرضی ہم تم کون ہے چلو اٹھو رات کا کھانا دیکھو جا کے“۔ اموجان کی لٹاڑ پر وہ کان دبا کر باہر نکلی تھی کہ دروازہ پر پابا سے نگر ہو گئی۔

”سوری بابا جان!“

”کوئی بات نہیں دیکھ کے چلا کرو“۔ آزاد خان کا جلال اپنی چھوٹی بیٹی کے لئے ہمیشہ ختم ہو جاتا تھا بقول اموجان کے پایا کے سر چڑھ کر بولتی ہے، بھی خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو پرائیویٹ ہی سہی مگر بی اے کر رہی تھی اور اسی کی بدولت اس کی بیسٹ فرینڈ اور چچا زاد گل رخ بھی پڑھ رہی تھی اور نہ صدایوں سے

اور چچا زاد گل رخ بھی پڑھ رہی تھی اور نہ صدایوں سے

”اوہ بیزارا تم تو رہے دو تم پر جی اسی تعظیم کا اثر ہے جس نے ماں باپ کی عزت بھلا دی“۔ بہزاد خان کو سچ بہت کڑوا لگا تھا۔

”بابا جان! میں نے کوئی بد تمیزی نہیں کی آپ سے اور شہہ پارہ کی خواہش کوئی بے ادبی نہیں ہے آپ کی چار دیواری سے باہر تو نہیں جا رہی ناں وہ تو“۔
 ”بس سہل! کچھ دن کے لئے آئے ہو اپنے ضابطے ہم پر مت لگاؤ، ہم بہتر جانتے ہیں کیا کرنا ہے“۔ بہزاد خان کے آگے وہ خاموش ہو گیا تھا۔
 ”گل رخ! مجھے چائے بنا کر دو“۔ سہل کی سنجیدہ صورت سے وہ اس کے موڈ کا اندازہ کر رہی تھی مگر دکھ پوچھ نہ سکی۔

”کیا ہوا کیا دیکھ رہی ہو“۔ سہل نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔
 ”نہیں کچھ نہیں“۔ وہ نظر چراگئی تھی سہل نے اسے ساری بات بتائی تو وہ تاسف سے ہنس پڑی۔
 ”یا گل ہے شہہ پارہ کٹے ہوئے پروں سے اڑنے کی چاہ کیا حماقت نہیں“۔

”وہ احمق نہیں ہے ہمارے پیروں میں بندھی زنجیریں ہیں جو اڑنے نہیں دیتیں گلے میں پڑے فرسودہ برسوں کے طوق ہیں جو سانس لینا دو بھر ہے“۔
 سہل کی گنجی عروج پر تھی اور گل رخ حیران کے یہاں کا کوئی مرد بھی عورت کے لئے بول سکتا ہے۔
 ”ایسے مت دیکھو مجھے میں نے صرف کتابیں چائی نہیں ہیں شعور حاصل کیا ہے دوسروں کو درس دیتا ہوں خود کتنا بے بس ہوں مگر کچھ کرنا تو پڑے گا بشرط یہ کہ تم بھی میرا ساتھ دو“۔ سہل نے اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

”مم میں..... میں کیا کر سکتی ہوں“۔
 ”بس وعدہ کرو جب ضرورت پڑے تو اپنی ذات سے بالاتر ہو کر سوچنا ہم پہلا قدم اٹھائیں گے تو اپنے ذمے والی خلیں شاد ہو جائیں گی پھر کوئی پھوپھی جان

رہی تھی اور آج خوشی کے موقع پر مرد حضرات نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

”سہل لالہ! اتنی بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں دو لاکھ نہیں دے سکتے“۔
 ”شہہ پارہ! بی بی لیکچرار ہوں یونیورسٹی میری ملکیت نہیں ہے یہ پکڑو اور ہٹو آگے سے“۔ اپنا والٹ اس کے ہاتھ پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اسے دروازہ پر سے ہٹایا تھا اندر سے دروازہ لاک کیا تھا باہر وہ تھی اور اس کی دہائیاں سب ہی خوش تھے کہ شہہ پارہ کو سوا سیر مل گیا تھا۔

☆☆☆☆

”بابا پلیز مان جائیں ناں“۔
 ”اب کیا ضد کرتا ہے تم لڑکی“۔ اموجان کو چڑتی۔
 ”کچھ نہیں اموجان یہ میری اور بابا کی بات ہے بابا پلیز میں گل رخ کی شادی کے بعد بہت اور بھر ہی ہوں“۔
 ”مگر بیٹا! گھر والے نہیں مانیں گے“۔ آزاد خان بے بس تھے۔

”بابا میں باہر تو نہیں جا رہی ناں گھر میں بیٹھ کر بچوں کو پڑھا کر ٹائم گزارنا چاہتی ہوں آخر اس میں کیا برائی ہے“۔ وہ بضد تھی۔
 ”ہاں بی بی تمہیں کوئی برائی نظر کب آتی ہے اور پڑھاؤ اسے اب باپ کے منہ لگ رہی ہے“۔ اموجان سخت خفا تھیں شہہ پارہ بے بسی کی انتہا پر بہتے آنسو صاف کر رہی تھی۔

”السلام علیکم! کیا ہو رہا ہے.....؟“۔ سہل خان نے کمرے میں آ کر یہ دخلت کی تھی اس کے آنے پر شہہ پارہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔

”ہونا کیا ہے آزاد خان کی شہہ پر اتنا بولتی ہے ورنہ عورت کی اوقات کیا ہے“۔ بہزاد خان طنز یہ گویا ہوئے تھے۔

”کیوں بابا جان عورت کیا انسان نہیں ہے اوقات صرف مرد کی اونچی ہوتی ہے.....؟“۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



مستقل ہمیشہ رہنے والی قید تنہائی سے انسان اکتا جاتا ہے اپنا آپ بھی برا لگتا ہے۔

”چلو پریشان نہ ہو تمہاری بوریٹ اور تنہائی دور کرنے کا حل سوچ لیا ہے ان قریب تم کمرے میں اکیلے نہیں رہا کرو گی کوئی ساتھ ہوگا۔“ گل رخ کی بات پر وہ ساکت تھی۔

”کسی کے سامنے مذاق مت کرنا جان سے مار دیں گے۔ یہاں کے مرد تمہیں۔“ زرتاج بھڑک اٹھی تھی جب کہ شہہ پارہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ارے بابا میں تو اس لئے کہہ رہی ہوں کہ سہل کچھ دن میں شہر چلے جائیں گے تو میں تمہارے کمرے میں آ جاؤں گی بس۔“ گل رخ نے بات سنبھالی تھی وہ صرف شہہ پارہ کا ری ایکشن دیکھنا چاہتی تھی جو کانی مایوس کن تھا۔

”مجھے سونا ہے۔“ میں دروہور ہا ہے۔“ شہہ پارہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی درحقیقت گل رخ کی بات نے اس کا دل دھڑکا دیا تھا رات کھانے کے بعد قبضہ پینا یہاں کی روایت رہا تھا اب بھی مردان خانے میں سب جمع تھے سہل نے موقع دیکھ کر تیر چلایا تھا سب سے پہلے اس کے بابا بہزاد خان اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔

”وماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا جانتے نہیں ہو شہہ پارہ کا جوڑ نہیں ہے اس خاندان میں تو کیا کسی ملازم کو شہادیں جلال خان کی پونی کا ہاتھ۔“

”غصہ نہ کریں بابا جان! خاندان میں نہیں ہے تو باہر کرویں کوئی غلط بات تو نہیں ہے مسلمان ہیں تو ذات پات کیوں کسی کو زندہ درگور کرویں مگر خاندان سے باہر شادی نہ کریں یہ کہاں کا انصاف ہے۔“ اس کی بات پر سب خاموش تھے مگر بہزاد خان طنز یہ اسے دیکھ رہے تھے۔

”ہو گئی بات ختم؟ ہم مر سکتے ہیں مگر اپنی روایات نہیں توڑتے خاندان سے ماہر کبھی نہیں ہو سکتا۔“

”ٹھیک ہے پھر اس کا جوڑ خاندان میں موجود ہے“

اور زرتاج اپنی شہہ پارہ کی طرح خود کو زندہ درگور نہیں کریں گی کیوں ساتھ دو گی ناں میرا.....؟“ سہل نے جو حل پیش کیا تھا گل رخ ششدری سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مگر سہل! اس سب میں تو میرا نقصان ہے میرا کیا فائدہ میرا کیا قصور ہے۔“

”قصور تو کسی کا بھی نہیں ہے بات صرف یہ ہے کہ تم ایک عورت ہو اور عورت کا درد سمجھ سکتی ہو کوئی انہولی اور غلط بات بھی نہیں کی تم شہہ پارہ کا سوچو میں سب کو سنبھال سکتا ہوں مگر اسے نہیں جانتی ہو وہ کس قدر تم سے محبت کرتی ہے کیا تم اس کے لئے یہ نہیں کر سکتیں حالانکہ راتوں میں جاگ کر تم اس کے لئے روتی ہو میں جانتا ہوں۔“ گل رخ نے گہری سانس لی تھی۔

”ٹھیک ہے سہل خان! میں آپ کے ساتھ ہوں مگر ایک شرط ہے۔“

”اس شرط یہ کھیلوں گی پیار کی بازی جیتوں تو مجھے پاؤں ہاروں تو پیار تیری“ سہل نے عقیدت سے اس کے ہاتھ تھام لئے تھے۔

☆☆☆☆

”شہہ پارہ! تم رات کو جاگتی کیوں رہتی ہو آدھی رات تک تمہارے کمرے کی لائٹ آن تھی۔“ گل رخ کی بات پر نیال بناتے اس کے ہاتھ رک گئے تھے۔

”دل کا یہ دشت عرصہ محشر لگا مجھے میں کیا بلا ہوں رات بڑا ڈر لگا مجھے“

”اف..... ایک تو تمہاری شاعری مجھے سمجھ نہیں آتی۔“ زرتاج نے سر پیٹ لیا تھا۔

”کچھ نہیں آپنی! آپ لوگ تو یونہی پریشان ہو جاتے ہیں بس مورے جان یاد آ رہی تھیں اور اس گل کی شادی کے بعد بہت بوریٹ ہوتی ہے۔“ اس نے بات ٹالی تھی مگر زرتاج اور گل رخ جانتی تھیں وہ کتنا بہادر سہی رات کا کوئی پہر ایسا ہوتا ہے جب

بہزاد خان کا پناہ لہاں خان یعنی میں اب منظور ہے آپ کو رشتہ۔ سہل نے گویا بلاسٹ کیا تھا۔

”سہل خان! تم گل رخ کو دکھ نہیں دے سکتے میں اس کا بھائی نہیں قطعاً ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“ ضمیر خان بول پڑا تھا۔

”میرے فیصلے پر گل رخ کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور دوسری شادی کوئی غیر قانونی غیر شرعی فعل نہیں اس سے پہلے بھی قبیلے میں دوسری شادیاں کی گئی ہیں مگر صرف اپنی ذات اور مفاد کے لئے میں یہ شادی ایک زندگی کو زندہ ہونے کا احساس دلانے کے لئے کرنا چاہتا ہوں میرا نہیں خیال کسی کو کوئی اعتراض ہونا چاہئے اگر ہو تو میں گل رخ کو لے کر شہر چلا جاؤں گا اور میرا اس قبیلے سے ہر تعلق ختم ہوگا یہ سے میرا فیصلہ۔ وہ بہت ٹیر جی کھیر ثابت ہو رہا تھا سب کے لئے بہزاد خان کسی طور اپنے اکلوتے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔

”مگر سہل! شہہ پارہ نہیں مانے گی۔ شاہد اموجان کو بھی اعتراض ہو۔“ آزاد خان نے نقطہ اٹھایا تھا۔

”گستاخی معاف بچا جان! مگر عورتوں کی کیا اوقات کہ ہمارے فیصلوں پر سوال کریں رہی شہہ پارہ تو اس کی حیثیت کیا ہے آپ کی نظروں میں سب جانتے ہیں شہر جانے سے پہلے اس ہفتے میں نکاح کرنا چاہتا ہوں آگے آپ کی مرضی۔ وہ مردان خانے سے اٹھ کر چلا گیا تھا پیچھے سب بے بسی کی انتہا پر تھے۔

☆☆☆☆

سہل نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا اموجان سے پوچھنا تو کیا تھا صرف بتایا گیا تھا اور شہہ پارہ کو تیار کرنے کا حکم دیا گیا اموجان تو اپنی تسبیح سنبھال کر تخت کی ہو گئی تھیں گویا وہ یہ نہیں کر سکتیں مسئلہ شہہ پارہ کی شادی کا نہیں تھا سہل سے شادی کا تھا بہت ہمت کر کے زرتاج کو ساتھ لے کر گل رخ اس کے سامنے آئی تھی جو تمام معاملے سے بے خبر کتاب بڑھ رہی تھی گل رخ نے اس کے ہاتھ سے کتاب نکال کر اس کے ہاتھ

تھام لئے تھے۔

”اللہ خیر کرے سہل لالہ سے لڑ کر آئی ہو کیا۔“ شہہ پارہ نے شرارت سے اسے دیکھا تھا۔

”شہہ پارہ میں بہت خوش ہوں بڑی خوشی کی بات ہے بڑوں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری شادی سہل سے کی جائے ان کے علاوہ کوئی مناسب نہیں ہے۔“ گل کی بات پر اس کے پیروں سے زمین نکل گئی تھی۔

”اگر کوئی میرے لائق نہیں تو بنایا کیوں جا رہا ہے میں نے بھی کوئی شکایت کی مجھ پر اتنی مہربانی کیوں جا کر منع کر دیں سب کو آج تک میری زبان نہیں چلی اب چلے گی میں کبھی تمہارا گھر برباد نہیں کر سکتی اور گل تم مان کیسے گئیں اف! خدا را سہل لالہ نہیں بھی نہیں۔ وہ آڈٹ آف کنٹرول ہو گئی تھی ان دونوں سے سنبھالنا مشکل تھا گل جا کر سہل خان کو بلا لائی تھی سہل اندر آیا تو شہہ پارہ اکیلے اپنا سر تھامے بیڈن پٹی پکڑے بیٹھی تھی۔

”کیوں اتنا ہنگامہ کر رہی ہو۔“ سہل کی آواز پر جھٹکے سے جھکا سر اٹھایا تھا آج اسے نہ اپنی چادر کی پرواہ تھی نہ سہل کے دوہرو ہونے کی۔

”اگر آپ مجھے کنوینس کرنے آئے ہیں تو جا سکتے ہیں میں عین نکاح کے وقت انکار کروں گی بے شک مجھے قتل کر دیا جائے۔“ وہ بہت بڈرا اور بد گھبر ہو رہی تھی سہل سمجھ گیا زری سے کام نہیں چلے گا۔

”اتنی خوش نہیں کیوں ہے کہ تم سے پوچھا جائے گا یا میں کنوینس کروں گا تو میڈم ایسا کچھ نہیں ہوگا تم جتنا شور کرو نکاح تو کل تمہارا ہوگا مجھ سے تو بہتر ہے خوشی خوشی مان جاؤ۔“

”میں نہیں مانتی۔“ شہہ پارہ نے بات کاٹی تھی۔ ”ٹھیک ہے پھر میں گل رخ کو بھی چھوڑ دوں گا اب یہ تم پہ سے تم اپنی دوست کا بھلا چاہتی ہو یا یہ کہ وہ بھی پوری زندگی زرتاج آپ کی طرح گزارے۔“ سہل نے سینٹر اڈل کر اس کے دل پر دار کیا تھا۔

میں آپ کو اس قبیلے کے ہر مرد سے الگ سمجھتی تھی

تذہب ابنی کی اجازت دیتا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں؟
اس شرعی فعل کو برا کہنے والے۔ اس قدم سے تمہیں
آج تکلیف ہوگی مگر یاد رکھو یہ ہمارے قبیلے کی آنے
والی نسلوں کے لئے ایک نئی راہ ہوگا، تمہاری شادی
کے بعد کوئی پھپھو اور زرتاج آپ کی طرح ویران نہیں
رہے گا، لوگ دوسری شادی کے ڈر سے اپنی بیٹی کو
قبیلے سے باہر بھی دے دیں گے یہ کیوں نہیں سوچتیں
”گل رخ نے زمی سے اسے سمجھایا تھا جس کے
خاموش آنسو بہ رہے تھے۔

”گل! مجھ سے پوچھا نہیں اور سے تمہارے ہل خان
نے آ کر مجھے دھمکی بھی دی میرا دل چاہ رہا تھا کہ.....“
”آہ..... میرے نہیں اب تو تمہارے بھی ہیں
بچپن سے ہم نے ہر چیز شیشہ کی ہے اب انہیں بھی
کریں گے یقین کر دو وہ بہت اچھے ہیں اپنی سب
شکایت ان کے رو بہ رو کرنا وہ دور کر دیں گے اوکے کل
تک صبر کرو۔“ گل رخ نے شرارت کی تھی جبکہ وہ
آنکھیں موند کر لیٹ گئی تھی رات جانے کس پہر سکتی
آنکھوں سے گلاس ونڈو کھول کر لان میں دیکھنے لگی
اچانک اسے محسوس ہوا کسی کی نظروں کے حصار میں
ہے غور کیا تو سامنے کے روم کی کھڑکی میں سہل
کھڑا تھا شہہ پارہ کی نظریں جھک گئی تھیں مگر وہ فوراً
پہلے نہ ہٹ سکی چند لمحوں میں اس کی حنائی پہلی بھیگ
چکی تھی اور سہل جان بوجھ کر اس کو ٹٹلی باندھ کر دیکھ رہا
تھا شہہ پارہ نے ایک جھٹکے سے گلاس ڈور بند کر دیا تھا
اور سہل دھیرے سے ہنس دیا تھا۔

☆☆☆☆

شہہ پارہ رخصت ہو کر دوسرے کمرے میں آ چکی
تھی سہل نے گل رخ کو کمرہ نہ چھوڑنے کی ہدایت کی
تھی اس وقت بھی وہ شہہ پارہ کے پاس جانے سے
پہلے گل کے سامنے تھا۔

”سہل! نا تم دیکھا ہے آپ ابھی تک یہاں ہیں
اپنے کمرے میں جائیں ناں۔“

کیونکہ آپ انکو لکھتے ہیں، مگر نہیں فطرت آپ کی بھی
وہی ہے برتری کا نشہ ہے ناں آپ کو جائیں کریں جو
کرنا ہے مگر میں تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گی آپ کے
لئے یاد رکھئے گا سہل بہزاد خان۔“ وہ ہتھ لگا کر ہنس پڑا تھا۔
”اچھی تبدیلی ہے میں ڈر رہا تھا اب بھی لالہ نہ کہہ
دو۔“ جو اب شہہ پارہ نے دھماکے سے ڈرینگ روم کا
دروازہ بند کیا تھا زرتاج نے باقاعدہ سہل کو داد دی تھی۔
”مان گئے سہل! تمہیں کیا دماغ لگایا ہے۔“

”آپ تو سمجھ گئیں مگر گل رخ بدگمان ہے بے
دوقوف لڑکی تمہاری دھمکی میں نے ایسے ہی دی تھی اس
کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا ورنہ وہ کبھی نہیں پانتی۔“
گل اس کے درست اندازے پر جھینپ گئی تھی اس
سے پہلے کہ شہہ پارہ کوئی جذباتی قدم اٹھاتی اگلی صبح
ان کا نکاح کر دیا گیا اور شام میں زرد جوڑا پہن کر وہ
بہت افسردہ تھی گل رخ سے نظریں چراتی بہت حسین
لگ رہی تھی۔

شہہ پارہ خود کو کیوں قصور وار سمجھ رہی ہو اور کیوں
اذاں ہو میں تو بہت خوش ہوں تمہارے لئے۔“ گل
کی بات پر وہ طنزیہ ہنسی تھی۔

”پھر تو گنیز ورلڈ ریکارڈ میں نام آنا چاہئے تمہارا
پہلی عورت ہو جو سوتن کی خوشی میں خوش ہووا۔“

”انتا تلخ ہو کر مت سوچو میں ایک عورت ہوں اور
عورت ہونے کے ناطے صرف میں ہی تمہارا درد کم
کر سکتی تھی مرد سے ہزار گنا زیادہ وسیع ظرف اور
برداشت رکھتی ہے عورت تو کیا ضروری ہے اپنی
نسوانیت کی تسکین کے لئے عورت کو تکلیف پہنچا کر
سکون حاصل کیا جائے نہیں شہہ پارہ ہزاروں مرد
چھپ کر اور سرعام بغیر کسی وجہ سے اپنی ذات اور نفس
کے لئے دوسری شادیاں کرتے ہیں تو پہلی بیوی
برداشت کرتی ہے تو پھر سہل تو ایک اچھے مقصد ایک
زندگی کو زندہ رکھنے کے لئے ایسا کر رہے تھے تو میں
کیوں خود غرض بن جاؤں جو ایسے بھی جب ہمارا

”یہ کمزور بھی میرا ہے گل رخ! میں جانتا ہوں تم نے جو کیا آسان نہیں ہے تمہاری قدر جانتا ہوں تم چاہو تو میں بھی شبہ پارہ تک نہ جاؤں کیونکہ مقصد روایت توڑنا تھا جو ٹوٹ گئی۔“

”سہل کہنے کو صنف نازک ہیں مگر بہت ہمت ہے ہم میں، بخدا میں نے یہ سب اپنی عظمت کے لئے نہیں کیا سب سے زیادہ شبہ پارہ کا سوچا ہے خود کو اس کی جگہ رکھ کر سوچوں تو ہول اٹھتی ہوں، میں بہت خوش ہوں آپ میری جاگیر نہیں کہ قبضہ جمالوں محبت خوشنما پھول ہوتی ہے وہ پھول جس کی خوشبو سب کے لئے یکساں ہوتی ہے کم یا زیادہ نہیں آپ جائیں مجھے پلیر سوئے ہیں بہت تھک گئی ہوں۔“ سہل نے عقیدت سے اس کا ہاتھ چوما تھا اور باہر نکل گیا تھا، گل رخ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تھا اور مسکرا دی تھی۔

شبہ پارہ کے کمرے کا منظر سہل کی توقع کے برخلاف تھا، حیران کن طور پر ہر شے اپنے مقام پر تھی اور شبہ پارہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آکھیں موندے بیٹھی تھی، سہل اس کے روبرو بیٹھا تھا، سہل نے تصور ہو کر بھی شرمندہ ہو گیا تھا، اس نے خوبصورت لکڑی کی کلائی میں ڈالے تھے اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔

”تمہارا یہ انداز بالکل اچھا نہیں ہے تم لڑتی اچھی لگتی ہو میں تو بہت ڈر رہا تھا تمہاری دھمکی سے کہیں میرا چہرہ نہ بگاڑ دو مگر تم نے تو بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیئے۔“ سہل اسے بولنے پر اکسارہا تھا۔

”کوئی انداز دکھانے کے قابل ہی کہاں چھوڑا ہے آپ نے ایک ہی وار میں زبان بند کر دی میں ہاری آپ کو جیت مبارک ہو میں آپ کی جیت کا جشن منانے آپ کے سامنے ہوں۔“ شبہ پارہ کے الفاظ سہل کو دکھ دے رہے تھے۔

”بہت احساس والی بنتی ہو اس کا احساس نہیں تمہارے بے بنیاد الزام کتنے تکلیف دے رہے ہیں۔“

مجھے کیا ضرورت تھی مجھے خانہ داران کے خلاف اس آگ میں کودنا مگر ایسا صرف تمہاری اور آنے والی نسلوں کی بھلائی کے لئے کیا تمہیں تو خوش ہونا چاہئے قربانی تو گل رخ نے دی ہے، اگر تم خوش نہیں ہوگی تو کیا فائدہ وہ تو بلاوجہ ماری گئی ناں۔“

”مجھے اپنا نہیں اس کا دکھ رلا رہا ہے جانے کس اسٹیج پر کس طرح وہ مانی ہوگی وہ خوش واہ! ابھی دل دیکھیں آپ نے دباؤ ڈالا ہوگا۔“

”بس کرو یار۔“ سہل نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

”اوہ بابا کچھ نہیں کہا میں نے تمہارا حق نہیں مگر وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے، کتنا بولتی ہو خاموشی ہی اچھی تھیں اب چپ رہو اور..... اجازت ہو تو میں کچھ آگے چلوں۔“ سہل کی گھمبیر آواز پر کب سے وہ بدو اس کی نظریں لڑ کر جھک گئی تھیں مولی پھر سے ٹوٹ کر برسے تھے، سہل تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا۔

”رشتہ احساس اور روح کا ہوتا ہے باطن دل جڑنا ہے ظاہری یا جسم کا نہیں ہمارے رشتے کی تو بنیاد ہی اپنے ہونے کا احساس دلانا ہے شادی زبردستی ہوتی مگر آئندہ تمہارے جذبات مقدم ہوں گے، چلو شاباش چینیج کر کے آرام سے سو جاؤ، مجبوری ہے گل کے پاس نہیں جا سکتا وہ سو رہی ہے۔“ وہ فریض ہو کر باہر آئی تو سہل آنکھوں پر ہاتھ رکھے جانے پورہا تھا یا نہیں وہ خاموشی سے دوسری طرف آگئی تھی مگر بالکل الٹ تھی۔

”آرام سے سو جاؤ، اٹھ کر بھاگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی تمہیں۔“ آنکھیں بند کئے سہل کی آواز پر وہ اہل گئی تھی سر تک چادر تان لی تھی، فجر کی نماز پڑھ کر وہ بیڈ پر آئی تھی کہ سہل نے چونکا دیا۔

”اگر فارغ ہو گئی ہو تو لاسٹ آف کر دو میں سکون سے سونا چاہتا ہوں ساری رات تمہاری مہربانی سے

میں نے کیا کیا ہے۔ شہبہ پارہ ورہ حیرت میں تھی۔ بہل نے بھرپور نظر ڈالی تھی۔

”آپ کی چوڑیوں کا ساؤنڈ بہت پیارا ہے مگر مجھے نیند نہیں آتی ساری جیولری کے ساتھ انہیں بھی اتار دینا تھا میڈم۔“ بہل نے اس کے بھرے بھرے ہاتھوں پر نظر کی تھی۔

”یہ مجھ سے نہیں اترتی زرتاج آپ ہی پہناتی اور اتار رہی ہیں ہمیشہ۔“ وہ خفت زدہ ہی بتا رہی تھی۔

”میرا نام ہے شہبہ۔“ وہ خفت زدہ ہی بتا رہی تھی۔

”آپ کو نیند آ رہی ہے سو جائیں میں اترالوں گی۔“ اس کی نظریں جھک گئی تھیں، بہل نے گہری سانس بھر کر اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا، شہبہ پارہ بھینکتی ہتھیلیاں اور دل سنبھالتی اسٹڈی میں آ گئی تھی۔

”واقعی تو والہ نہیں ہے ٹیڑھی کھیر ہے یہ۔“ بہل نے مسکراتے ہوئے سر تکیہ پر ڈال دیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

بہل دے قدموں چلا گل رخ کا کپ اٹھا کر شام کی چائے میں شامل ہوا تھا۔

”بہل! یہ میری چائے ہے۔“

”کوئی بات نہیں ایک ہی بات ہے کیوں شہبہ پارہ۔“

اب بہل نے شہبہ پارہ کے ہاتھ سے کپ لے کر ٹھونٹ بھرا تھا، گل کے سامنے شہبہ پارہ جھینپ گئی تھی۔

”جیلس ہوتا ہوں تم دونوں کی دوستی سے کچھ کرنا پڑے گا۔“ مجھے تم دونوں آپس میں لگ کر مجھے بھول جاتی ہو۔“

”تیسری شادی کر لیں اسے ہم اپنے پاس بٹھانے بھی نہیں دیں گے کیوں گل.....؟“ شہبہ پارہ نے طنز پر جواب دیا تھا۔

”خبردار بہل! ایسا کچھ کیا تو یہ شہبہ پارہ تھی جو میں.....“

”پانگل ہو گئی ہو اور کوئی کام نہیں کیا مجھے یہ دیکھو ہنس رہی ہے۔“ بہل کی بات پر شہبہ پارہ کی دلی دلی

☆ ☆ ☆ ☆

گھر میں میلاؤ کے سبب مہمانوں کی وجہ سے شہبہ پارہ کو دیر ہو گئی تھی، بہل سوچا تھا وہ خاموشی سے آ کر لیٹ گئی تھی، اس دم بہل نے اٹھ کر اس کا سائیڈ لیپ آؤٹ کیا تھا۔

”میں نے کیا کیا ہے۔“ شہبہ پارہ ورہ حیرت میں تھی۔ بہل نے بھرپور نظر ڈالی تھی۔

”آپ کی چوڑیوں کا ساؤنڈ بہت پیارا ہے مگر مجھے نیند نہیں آتی ساری جیولری کے ساتھ انہیں بھی اتار دینا تھا میڈم۔“ بہل نے اس کے بھرے بھرے ہاتھوں پر نظر کی تھی۔

”یہ مجھ سے نہیں اترتی زرتاج آپ ہی پہناتی اور اتار رہی ہیں ہمیشہ۔“ وہ خفت زدہ ہی بتا رہی تھی۔

”میرا نام ہے شہبہ۔“ وہ خفت زدہ ہی بتا رہی تھی۔

”آپ کو نیند آ رہی ہے سو جائیں میں اترالوں گی۔“ اس کی نظریں جھک گئی تھیں، بہل نے گہری سانس بھر کر اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا، شہبہ پارہ بھینکتی ہتھیلیاں اور دل سنبھالتی اسٹڈی میں آ گئی تھی۔

”واقعی تو والہ نہیں ہے ٹیڑھی کھیر ہے یہ۔“ بہل نے مسکراتے ہوئے سر تکیہ پر ڈال دیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

بہل دے قدموں چلا گل رخ کا کپ اٹھا کر شام کی چائے میں شامل ہوا تھا۔

”بہل! یہ میری چائے ہے۔“

”کوئی بات نہیں ایک ہی بات ہے کیوں شہبہ پارہ۔“

اب بہل نے شہبہ پارہ کے ہاتھ سے کپ لے کر ٹھونٹ بھرا تھا، گل کے سامنے شہبہ پارہ جھینپ گئی تھی۔

”جیلس ہوتا ہوں تم دونوں کی دوستی سے کچھ کرنا پڑے گا۔“ مجھے تم دونوں آپس میں لگ کر مجھے بھول جاتی ہو۔“

”تیسری شادی کر لیں اسے ہم اپنے پاس بٹھانے بھی نہیں دیں گے کیوں گل.....؟“ شہبہ پارہ نے طنز پر جواب دیا تھا۔

”خبردار بہل! ایسا کچھ کیا تو یہ شہبہ پارہ تھی جو میں.....“

”پانگل ہو گئی ہو اور کوئی کام نہیں کیا مجھے یہ دیکھو ہنس رہی ہے۔“ بہل کی بات پر شہبہ پارہ کی دلی دلی

☆ ☆ ☆ ☆

گھر میں میلاؤ کے سبب مہمانوں کی وجہ سے شہبہ پارہ کو دیر ہو گئی تھی، بہل سوچا تھا وہ خاموشی سے آ کر لیٹ گئی تھی، اس دم بہل نے اٹھ کر اس کا سائیڈ لیپ آؤٹ کیا تھا۔

”گل رخ کہہ رہی تھی میں تمہیں منا نہیں سکوں گا دیکھو کیسے منایا مان گئی ناں گل تم مجھے۔“ سہل نے کمرے میں آئی گل کو مخاطب کیا تھا ”شہبہ پارہ حیران تھی۔“

”گل! تم تو ایک ہفتے کے لئے گئی تھیں ناں.....؟“

”سوری شہبہ پارہ! یہ ہمارا پلان تھا تا کہ سہل کو کچھ وقت ملے بہت ہی بد تمیز اور بڑے ہیں آپ دونوں۔“ شہبہ پارہ نے دونوں کو لٹاڑا تھا۔

”سوری شہبہ پارہ۔“ گل نے اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

”نہیں گل! تمہاری غلطی نہیں تمہارا تو احسان ہے مجھ پر ان فرسودہ روایات پر یاں انشاء اللہ ہماری کوشش رنگ لائے گی تمہاری قربانی رنگ لائے گی مگر سفر جاری رکھنا ہے اس امید پر کہ ظالم لاقانونیت سے بھرپور جبر گئے اپنی روایات کی آگ میں کسی لڑکی کو زندہ جلانے کا حکم بند دیں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی رضا سے قربانی دی انسانیت کو بچانے کے لئے اور ہم اس آخری نبی ﷺ کے امتی ہو کر عورت کو زندہ جلا رہے ہیں جو حالت جنگ میں بھی عورت پر ظلم کی اجازت نہیں دیتے اپنے نبی ﷺ اور تمام انبیاء کی قربانی کو بھول گئے ہیں چلو اس عید قربان پر عہد کریں انسانیت کو بچانے کے لئے خود کو قربان کر گئے۔“

”عید مبارک۔“ سہل نے دونوں کے ہاتھ تھامے تھے جو مسکرا کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئی تھیں۔

”ہماری عیدی۔“ شہبہ پارہ نے ہاتھ آگے کیا تھا۔

”یار عید تو آنے دو ابھی تو ایڈوانس میں مبارکباد دی ہے۔“ سہل گھبرا گیا تھا۔

”ویسے اصولاً تو آج عید تمہاری ہے تم کیا دو گے مجھے۔“ گل رخ کے جاتے ہی سہل نے شہبہ پارہ کو نشانے پر لیا تھا جو گلزار چہرہ لئے رخ موڑ گئی تھی، سہل کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

خود آکر بد گیا مجھے کہہ دیتے خیر مجھے کیا۔“ شہبہ پارہ سوچتی اپنی خیر منائی سوئی تھی صبح اس کا رومال دیتا ہاتھ نظر انداز کر کے بغیر ناشتہ کئے وہ نکل گیا تھا شہبہ پارہ کا اطمینان تب غارت ہوا تھا جب شام میں گل رخ اموجان کے ساتھ پھپھو مرجان طرف چلی گئی تھی اور رات 9 بجے سہل بغیر بات کیئے کھانا کھائے اپنے روم میں چلا گیا تھا تب مجبوراً اسے کمرے میں جانا پڑا تھا جہاں سہل کوئی ٹیبلٹ کھا کر بیڈ پر لیٹ رہا تھا شہبہ پارہ نے ڈرتے ہوئے اس کے سر کو چھوا تھا جو دبک رہا تھا۔

”سہل! آپ کو بخار ہے کچھ کھالیں خالی پیٹ میڈیسن نہیں کھاتے۔“ اس کی آواز پر سہل نے جھٹکے تھے اس کا ہاتھ ماتھے سے ہٹایا تھا۔

”میں زندہ رہوں یا مروں تمہیں کیا۔“ سہل غرایا تھا شہبہ پارہ نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

”آپ کیوں کر رہے ہیں ایسا میرے ساتھ آپ تو سب جانتے ہیں پھر بھی۔“ بات کے آخر تک اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

”میں نے کہاں کچھ کیا ہے تمہارے ساتھ یہی تم چاہتی تھیں اب مسئلہ کیا ہے۔“

”پلیز سہل! میری غلطی تھی آپ خود کو تکلیف نہ دیں مجھے تکلیف ہوتی ہے آئی ایم سوری فاریا پوری تھنک۔“

”واقعی.....“ سہل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا جو اثبات میں سر ہلا کر پلکیں جھکا گئی تھی۔

”مگر یہ احسان عظیم کیوں.....؟“ ایک اور طنز کیا تھا جو اب خاموشی تھی۔

”کیا کچھ سلسلہ محبت ہو گیا ہے مس شہبہ پارہ۔“

”نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہے اصل میں.....“

”میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیا جھوٹ بولو گی کبھی کیا تم نے سوچا ہے کہ لہجہ ٹوٹ جاتے ہیں۔“ سہل نے اس کے لڑکھڑاتے لہجے پر اپنے یقین کی مہر شہبہ پارہ کو لڑکیوں کے ساتھ ان

القریش پبلی کیشنز کے نئے ناول شائع ہو گئے ہیں

- | | | |
|------------|----------------|-----------------------|
| 600/- روپے | سائرہ رضا | اب کر میری رفوگری |
| 600/- روپے | صالحہ محمود | رگ جاں جو قریب تھے |
| 600/- روپے | اشتیاق فاطمہ | دل کی دہلیز پر |
| 600/- روپے | فاخرہ گل | میرے ہمنوا کو خبر کرو |
| 400/- روپے | سمیرا شریف طور | زندگی کی حسین راہ گذر |
| 400/- روپے | سمیرا شریف طور | وہ اک لمحے محبت |
| 900/- روپے | نبیلہ عزیز | درِ دل |
| 400/- روپے | نایاب جیلانی | زرد پتوں کا شجر |

سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور

042-37668958-3765254

القریش پبلی کیشنز

دردِ عجزِ فگاہ

”جنونِ جذام اور برص“۔ وہ فوراً بولے۔
”ہوں جب پچاس سال کی عمر کو حالتِ اسلام میں پہنچتا ہے تو؟“



”اس کا حساب بلکا کر دیتے ہیں۔“
”ہوں جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو؟“
”اس کو اپنی طرف رجوع کی توفیق دیتے ہیں۔“
”ہوں جب ستر سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو؟“
”تو سب آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں“
”ہوں جب اسی سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو؟“
”تو اس کے حسنات یعنی (اچھائیاں) لکھتے ہیں اور سیرتات یعنی (برائیوں) کو معاف کر دیتے ہیں۔“ وہ بلا
انکے فر فر جواب دے رہے تھے۔
”ہوں پھر جب نوے سال کی عمر ہو جائے؟“

دوسری قسط



نہندے کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف فرمادیتے ہیں اس کو اپنے اہل بیت کے معاف کرنے میں شفاعت کا حق دیتے ہیں اسے قبول فرماتے ہیں اور اس کا لقب اسیر اللہ فی الارض (یعنی زمین میں اللہ کا قیدی) ہو جاتا ہے کیونکہ اس عمر میں پہنچ کر عموماً انسان کی قوت ختم ہو جاتی ہے کسی چیز میں لذت نہیں رہتی قیدی کی طرح عمر گزارتا ہے۔

”آخری سوال؟ جب ارزل عمر کو پہنچ جائے؟ اس نے کتاب بند کر کے سعید صاحب کو دیکھا۔
 ”وہ نیک اعمال جو وہ جوانی کی عمر میں کرتا تھا برابر نامہ اعمال میں لکھے جاتے ہیں اور اگر کوئی گناہ کر لیتا ہے تو وہ نہیں لکھا جاتا۔“ سعید صاحب کا جملہ ختم ہوا تو وہ کتاب رکھ کر اپنے بیڈ سے اٹھ کر باپ کے پٹنگ پر پاس آ بیٹھی۔
 ”تو جب ہمارا اللہ اتنا مہربان ہے ہم کیوں افسردہ ہوں یہ تو ناامیدی ہوئی اور ناامیدی اللہ کی ذات کی نفی ہوتی ہے اتنے مہربان رب کی ذات کی نفی کر کے ہم کیوں گناہ گار بن جائیں وہ ہمیں دیکھ رہا ہے ہمارے حال سے باخبر ہے ہم کیوں اسے ناراض کریں وعدہ کریں آپ آئندہ افسردہ نہیں ہوں گے۔“ اس نے باپ کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

”کیا کروں بیٹی بندہ بشر ہوں شیطان دوسو سو میں ڈال دیتا ہے کمزور دل کو اللہ نے اتنی اچھی بیٹی دی ہے جو سنوں میں میری افسردگی ختم کر دیتی ہے پھر بھی میں مایوس ہوتا ہوں تو شاید میری کم نصیبی ہے یہ وعدہ کرتا ہوں آئندہ ناامید نہیں ہوں گا اور اگر ہو بھی گیا تو جانتا ہوں میری پیاری نیک سی بیٹی مجھے ٹھیک کر دے گی۔“ وہ آبریدہ ہو گئے حرم نے ان کے آنسو پونچھے انہیں دوا کھلائی اور چادر ٹھیک کرتی لائٹ بند کر کے پٹنگ پر آ بیٹھی۔
 کئی اہل بیت گئے اس نے اپنے باپ کو دیکھا وہ ہلکے ہلکے خزانے لیتے ہوئے چکے تھے حرم کو بالکل نیند نہیں آ رہی تھی وہ کپن میں چائے بنانے آ گئی اس نے موم بتی جلائی اور چائے کا پانی چڑھا کر آج ڈراسی تیز کر کے وہ کپ اٹھانے لگی کپ اور چھلنی سلیب پر رکھ کر وہ مٹری تو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے لیے تڑنگے سائے کو دیکھ کر دل گرجا رہا تھا ایک دم اس سائے نے سوچ بورڈ پر ہاتھ مارا اور کپن میں روشنی پھیل گئی اس نے مقابل کی خوف سے پھیلی آنکھوں اور دل پر رکھے نازک دودھیہا ہاتھ کو دیکھ کر خود کو بہت بے بس محسوس کیا تھا۔
 ”اتنی اچھی لڑکی کیسے دل رہی ہے اس کی جگہ یہ گھر تو نہیں ہے۔“
 وہ شرمندہ ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے حرم خوفزدہ ہوئی تھی۔

”آپ اتنے اندھیرے میں کیوں کام کر رہی ہیں لائٹ کیوں نہیں جلائی؟“ وہ سنبھل کر بولا تھا۔ حرم کا خوف اطمینان میں بدل گیا وگرنہ اچانک سے لمبا سانس لیا دیکھ کر اس کی جان نکل گئی تھی۔
 ”مجھے رات کو موم بتی کی روشنی میں چائے بنانا اچھا لگتا ہے۔“ وہ رخ موڑ کر بولی۔
 ”یہ نہ کہہ سکی کہ اگر کپن کی لائٹ اتنی رات کو جلتے دیکھ لی چچی نے تو اس کی شائست آ جائے گی کیا کیا طعنے اسے سننے کو نہ ملیں گے۔“

”واہ بہت عجیب لڑکی ہے اس سے شادی کر کے تو میں بہت مزے میں رہوں گا رات کو موم بتی جلا کر چائے بنانے والی لڑکی کے ساتھ زندگی بہت بہل ہوگی۔“ فرحان نے اس کی عجیب و غریب سی منطق سن کر سوچا تھا۔ اس کی پشت پر لہرائی بسی چوٹی کو تکتے وہ خوابوں کی راہ گزر پر چل نکلا جس میں وہ اکیلا نہ تھا یا اس و کم کسی حسین لڑکی بھی سنگ تھی۔ چائے بن گئی تو وہ کپ میں ڈالنے لگی اسے حیرت ہو رہی تھی کہ فرحان اب تک وہاں کیوں موجود تھا اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”اگر برانہ لگے تو ایک کپ مجھے بھی چائے؟“ فرحان کی بھاری آواز پشت سے ابھری۔ اس نے فرحان کو

کپ پکڑا اور اسے کپ کے پاس بے زرارے لگی۔
 ”ہم دونوں کزن ہیں، سگے چچا زاد کوئی اجنبی تو نہیں، کیا ہم ایک ساتھ چائے بھی نہیں پی سکتے؟“ فرحان کی
 بوجھل مردانہ آواز میں کیا کچھ نہ تھا دکھ، شکوہ، امید، محبت، اپنائیت، حرم ساکت ہو گئی، ٹھہر گئی دل کی دھڑکن نامعلوم
 انداز میں دھڑکنے لگی، وہ ایسے لہجوں کی عادی کبھی چچا اور باپ کے سوا اس نے کسی مرد سے بات کرنے کی
 ہمت نہیں کی تھی وہ بچپن سے ہی شرمیلی اور الگ طبیعت کی تھی۔ اس کی ہمت نہ تھی رات کے اس پہرا کیلے فرحان
 کے ساتھ چائے پینے کی گروہ صرف یہی سوچ کر رک گئی کہ فرحان بھائی کیا سوچیں گے، حرم کو مجھ پر بھروسہ نہیں،
 ان کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں، ابو سے اتنی محبت کرتے ہیں اور میں ان کی بات نہ مان کر بدگمان کر دوں۔“
 دونوں کے بیچ خاموشی در آئی تھی۔

حرم یوں مر جھکائے کھڑی تھی گویا کوئی قصور کر بیٹھی ہو اور فرحان اسے نصیحت جانے اس کے کھلے سر کو تکتا جا رہا تھا۔

”کیا غضب ہے کہ اس کی خاموشی

مجھ سے باتیں ہزار کرتی ہے“

”چائے بہت اچھی بنی ہے۔“ کچھ تو کہنا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا حرم کبھی خود سے نہیں بولے گی۔ وہ بیچاری کیا
 کہتی سر اشارت میں ہلا گئی۔

”شکریہ۔“ فرحان نے دیکھا کہ وہ کپ ہاتھ میں پکڑے اس کے سامنے پینے سے کتر رہی تھی اور کپ

تھلے ہاتھ پر ہلکی کپکپاہٹ کا گمان بھی ہو رہا تھا اسے بہت افسوس ہوا۔

”آپ چائے پییں ناں، ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ فرحان کے کہتے ہی وہ چونکی اور سر اٹھا کر فرحان کو دیکھا۔

”ہوں..... جی۔“ نگاہیں جھکا کر جلدی سے کپ لبوں سے لگایا اور بڑا سا گھونٹ بھرا جیسے اگر حکم کی تعمیل نہ

کی تو ہمزادے دے گا۔

”اتنی حسین اور ذہین لڑکی کتنی قابل رحم حالت میں ہے اگر تائی زندہ ہوتیں تو یہ آج اپنے گھر میں اک
 مختلف حرم ہوتی، پراعتماد حرم!“ ایسے حقیقتاً بہت دکھ تھا۔

وہ اس سے آٹھ سال چھوٹی تھی تائی کی زندگی میں وہ جب کبھی ان کے ہاں جاتا وہ فرائگ میں لمبے بالوں کی
 پونی ٹیل بنائے حسین پھولوں سی نازک بچی پڑھائی میں مگن ملتی، تائی تائی نے اسے شہزادیوں کی طرح سینٹ سینٹ کر
 رکھا تھا اور آج وہ لوگوں کی جوتیاں سیدھی کر رہی تھی، ملازمہ بنی دن رات کام میں جتی رہتی اور صرف دو وقت
 کی روٹی اور سر چھپانے کی چار دیواری کی ضرورت کے لئے وقت بھی انسان کو کیسے کیسے حالات سے گزارتا
 ہے۔

”آپ نے آگے پڑھائی کا کیوں نہیں سوچا، حالانکہ اچھے خاصے گریڈ لے کر ہر سال کامیاب ہوتی تھیں
 آپ؟“ فرحان نے یونہی خیال آنے پر پوچھا مگر مقابل کا تو رنگ اڑ گیا۔

”آپ خاموش کیوں ہیں؟“ فرحان نے اس کے گریز اور گھبراہٹ کو محسوس کر کے پوچھا۔

”وہ..... ابوا کیلے ہوتے ہیں، ہر وقت ان کے پاس رہنا پڑتا ہے، اسی لئے آگے پڑھنے کا خیال ہی نہیں آیا
 میں انہیں اکیلا چھوڑ کر پڑھنے نہیں جاسکتی۔“ وہ نگاہیں جھکا کر بولی فرحان کو اس کی آواز نرم سی لگی تھی۔

”وہ گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی نیا محلہ نئے لوگ وہ تو تھی بھی ڈر پوک اور بزدلی اور پھر اس محلے میں اکبر
 جگجو کی کارروائیوں کے زبان زد عام تھے تو وہ سن ہی چکی تھی بلکہ اسے تو اکثر گھر کے اندر بھی ڈر لگتا جیسے اکبر جگجو

وہاں پچھپا سے دیکھ رہا ہو وہ بہت متوجس اور خوفزدہ رہتی تھی۔ زبیدہ کو اس کا وجود گھر میں بگلتا تھا ان کا بس چلتا تو اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر چلتا کرتیں ناں کہ اسے پڑھائی کرنے دیتیں، فرحان کے دوست کی اکیڈمی میں اسے سفارش پر نوکری دلوائی، اشفاق چچا اور فرحان کو ابھی تک اس بات کی خبر نہ تھی وہ لوگ گھر کی بہو بیٹیوں سے پیسے کمانے کے حق میں نہیں تھے پھر حرم تو بہت نازک اور نازدں میں پئی تھی زبیدہ نے اس کے آنسو اور خوف کچھ اثر نہ لیا وہ بہت خوفزدہ تھی گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی مگر زبیدہ نے خوب لتاڑا ان کے آگے اس جیسی کمزور لڑکی کی بھلا کہاں چلتی اسے یہ بھی یاد کروادیا گیا تھا اگر گھر میں مردوں کو خبر ہوگی تو صاف کہہ دینا میں اپنے ہنر کو رنگ نہیں لگانا چاہتی اسی لئے اپنی پڑھائی کو اکیڈمی میں بروئے کار لارہی ہوں اور وہ سوائے ماننے کے کچھ نہ کر سکی، باپ معذور چارپائی پر بڑا تھا وہ انہی کے رحم و کرم پر تھی چچا سے شکایت کرنے کا تو وہ مر کر بھی تصور نہیں کر سکتی تھی اس کی طرف سے زبیدہ مطمئن تھیں۔ وہ فرحان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ خاموشی کا یہ طویل وقفہ بہت تکلیف دہ تھا۔

”حرم!“ اس کی پکار پر حرم کا دل اچھل کر حلق تک آ پہنچا۔

”آپ..... سب بہت یاد آؤ گے گھر اپنا وطن اور آپ سب اپنے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے اتنے دن رہ کر واپس پر دلیں جانا۔“ وہ کہنے کچھ چارہا تھا اور زبان سے کچھ اور نکل گیا۔ حرم نے جملہ مکمل ہونے تک سانس روک رکھا تھا اس کی پکار ہی پتہ دے رہی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہوگا۔

حرم اس کے جواب میں کیا کہتی وہ دو قدم چل کر سلیب تک گئی اور سنک میں چائے کے برتن دھونے لگی، فرحان بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

”چائے کے لئے شکر یہ بہت مزہ آیا چائے کا، کانی عرصے بعد۔“ وہ یہ نہ کہہ سکا کہ یہ رات اور اس کے ساتھ لی ہوئی اس کے ہاتھ کی مزے دار چائے وہ بھی بھلا نہ پائے گا۔ فرحان نے اپنا کپ بھی سلیب پر رکھا، حرم نہایت پھرتی سے برتن دھو کر ہاتھ دھونی کچن سے جانے لگی۔

”شکریہ۔“ فرحان کی بھی آواز اس کی سماعتوں نے بخوبی سنی تھی وہ باہر نکل آئی۔ فرحان اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ اسے کمرے سے نکلتی زبیدہ نے دونوں کو کچن سے آگے پیچھے نکلتے دیکھ لیا تھا، حرم کی نگاہیں ان سے ملیں تو وہ زمین میں گڑھی کیونکہ زبیدہ نہایت حسکین نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔ اس کی ٹانگیں کانٹے لگیں رنگ زرد پڑ چکا تھا۔

”اچھا تو یہاں یہ ڈرامہ چلتا ہے رات کو اور میں تمہیں معصوم سمجھ کرے فکری سے جا کر سوجانی ہوں میرے پیچھے یہ سارے گل کھل رہے ہیں۔“ وہ طنز کے تیر برسانی اس کے پاس چلی آئیں حلق میں آنسوؤں کا گولہ اٹکا تھا، منہ میں تو زبان پہلے ہی نہ تھی زبیدہ کے سامنے تو وہ گونگی پڑ جاتی تھی۔

”گھر میں جگہ دے رکھی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں میرے ہیرے سے بیٹے کو پھانس لوگی اور میں تمہیں اپنی بہو بنالوں گی یہ غلط نہیں دل سے نکال دو میں اپنے فرحان کے لئے کھاتے مئے امیر خاندان سے دہن لاؤں گی تم جیسی مسکین اور اکیلی نہیں ہوگی جس کے پیچھے بہت سے رشتے ہوں تاکہ کل کو میرا فرحان اکیلا نہ پڑے وہ مضبوط ہو۔“ ان کی باتیں اس کا گلا کاٹ رہی تھی وہ مجبور تھی سوائے تڑپنے کے کچھ نہ کر سکی۔

”زیادہ ٹسوے بہا کر مظلوم بننے کی ضرورت نہیں اپنے چچا اور میرے معصوم بچے کو تمہاری یہ ادائیں بے وقوف بنا سکتی ہیں میری جیسی جہاندیدہ عورت کو نہیں، بولو کیا کر رہی تھیں اتنی رات کو فرحان کے ساتھ شرم نہیں آئی تمہیں میسنی، جس تھالی میں کھاتی ہو، اسی میں چھید کرنی ہو، سارے گھر میں تمہیں کچن ہی ملا تھا میرے بیٹے کو پھانسنے کے لئے بے چہیا۔“ انہوں نے اس کا نازک بازو اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ کر گرفت سخت کرتے

اسے کئی ٹکٹے دے کر چبا چبا کر کھا تھا۔ اتنے بے باک انعام پر حرم شرم سے کت کر رہ گئی۔
 ”بولو..... اب یہ رونا دھونا کس لیے؟“ وہ اس کو زارہ قطار روتے دیکھ کر غرائی تھیں۔

”میں..... چائے بنانے..... آئی تھی..... فرحان بھائی آئے..... اور انہوں نے بھی چائے بنانے کو کہا“
 میں بس چائے بنا کر دے رہی تھی۔ روتے روتے بمشکل اس نے اپنی صفائی پیش کی تھی۔ زبیدہ حرم کو بخوبی
 سمجھتی تھیں اور اپنے خون پر بھی پورا اعتبار تھا مگر حرم کو دبانے اور ڈرانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتی
 تھیں اس کی بات پر اک ہاتھ اسے جڑ دیا۔

”یہ بات پہلے نہیں بک سکتی تھیں میرا تانا تم ضائع کیا، نیند بھی بھاگ گئی، مجھے فرحان پر پورا بھروسہ ہے، مگر
 آج کل کی لڑکیوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے، باہر سے جتنی معصوم دکھتی ہیں اندر سے اتنی ہی پوری ہوتی ہیں۔ اپنی
 بات اسے سنا کر وہ سارا الزام اس کے سر ڈالتی کچن کی سمت چلی گئیں۔ وہ سست ہوتی ٹانگوں کو کھینچتی بمشکل اپنے
 پلنگ تک آئی تھی۔ اس الزام کی کسر رہ گئی تھی۔

”زندگی تو مجھے اور کتنے امتحانوں سے گزارے گی، میں اتنی بہادر نہیں، تھک گئی ہوں، کیا اس دنیا میں کوئی
 ایسا نہیں جو مجھے خوشیاں دے میری عزت کرے، میرا کوئی نہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میری کوئی وقعت ہی
 نہیں، میں بھی تو انسان ہوں۔“ زندگی کا یہ پہلا معصوم سا شکوہ تھا جو اس کے دل اور زبان پر آیا تھا۔ پلنگ پر لیٹی
 وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی، باپ سے اپنا دکھ بھی تو چھپاتا تھا، بد نصیبی اتنی کہ وہ کھل کر اپنے دکھ پر رو بھی نہیں سکتی
 تھی۔

☆☆☆☆

”فلک نے بہت کہا، آنے کو اس کی خواہش تھی لڑکیوں سے مل لے گی، مگر میں نے منع کر دیا، اچھا نہیں لگتا
 بس ملنے آگئی، بہت دن ہو گئے تھے پھر فرحان بھی آیا ہوا ہے، سوچا اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“
 روبینہ کی بات اور آمد پر زبیدہ اب تک حیران تھیں کہاں تو وہ خوشی ملی میں تھوڑی دیر کو آجاتی تھیں آج جانے کیا
 بات ہوگئی تھی جو وہ صبح ہی صبح آگئی تھیں۔

”بچیاں کہاں ہیں؟“ زبیدہ کی خاموشی محسوس کر کے وہ بات بڑھانے کو ادھر ادھر دیکھتے بولیں، جس کو ان
 کی نظریں تلاش رہی تھیں وہ سامنے پن کی کھڑکی میں سے کام کرتے نظر آگئی تھی۔

”سورہی ہیں، آج وہ دونوں گھر پر رکی ہیں، کل فرحان بھی واپس چلا جائے گا، بھائی کے ساتھ زیادہ سے
 زیادہ وقت گزارنا چاہتی ہیں۔“ وہ بادل خواست وضاحت دیتے ہوئے بولیں۔

بیٹیوں کا صبح دیر تک سونا نہیں بہت کھٹکتا تھا مگر وہ دونوں کہاں کسی کی سنتی تھیں؟

”اور بیٹے کی شادی کا کچھ سوچا، ماشاء اللہ سے اب تو بہت اچھا کمانے لگا ہے، محلے بھر میں فرحان بیٹے کی
 تعریفوں کا چرچا ہے۔“ روبینہ نے بظاہر سکون سے مسکراتے ہوئے کہا تھا مگر دل ہی دل میں ڈر رہی تھیں کہ شاید
 حرم کے لئے انہوں نے سوچ رکھا ہو۔

”اللہ کا احسان ہے، اتنی فرمانبردار اولاد اللہ کسی کسی کو دیتا ہے، مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے اللہ نظر بد سے بچائے
 اسے شادی تو میں اس کی بہت اونچے گھرانے میں کرواؤں گی، سارا زمانہ دیکھے گا۔“ فرحان کے ذکر پر وہ ہمیشہ
 پر جوش ہو جاتی تھیں۔ ان کی بات پر روبینہ کے دل کی دھڑکن چل پڑی، اک اطمینان پورے وجود میں پھیل گیا (شکر ہے مالک تیرا، دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔)

”ماشاء اللہ... خدا تمہاری خواہش پوری کرے اس کی خوشیاں دکھائے۔“ وہ بیٹے کے دل سے دعا دیتی تھی۔
 ”ووہ... تمہارے دیور کی بیٹی کیا نام تھا بھلا؟ ہاں حرم وہ کیسی ہے؟ دل لگ گیا یہاں؟“ وہ اصل بات پر آئیں۔
 ”ہاں خوش ہے اسے یہاں کس شے کی کمی ہے جو دل نہیں لگے گا۔“ حرم کے ذکر پر ان کا منہ کڑوا ہو گیا۔
 رو بینہ ان کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ حرم نے دوپہر کے لئے سالن تیار کر لیا برتن
 دھو کر جگہ پر رکھتی وہ منہ ہاتھ دھو کر روپے سے پوچھتی باہر نکلتی تھی آج اکیڈمی بھی جانا تھا ان دنوں فرحان کی وجہ
 سے کالی مہمان آتے تھے اس کی اچھی خاصی چھٹیاں ہو گئی تھیں کل سرفیصل نے اسے ڈانٹ بھی پلائی تھی۔ وہ
 لاؤنج میں مہمان خاتون کو بیٹھا دیکھ کر جھجک کے رک گئی تھی۔ سمجھ نہیں آیا کہ ان کے پاس جا کر سلام کرے یا
 کمرے میں جا کر اکیڈمی جانے کی تیاری کرنے زبیدہ کے مزاج کا بھی پتہ نہیں چلتا تھا ہر آئے گئے کے سامنے
 بھی لتاڑ کر رکھ دیتی تھیں۔ وہ ابھمن میں گرفتار انگلیاں مروڑتی وہیں کھڑی رہی۔

”آؤ بیٹی! رک کیوں گئیں؟ میرے پاس آؤ۔“ رو بینہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ حرم پسینے میں نہا گئی
 ایک قطعی اجنبی عورت کا اس کے لئے کھڑا ہونا اور اتنے پیار سے مخاطب کرنا اس کے لئے کسی امتحان سے کم نہ تھا۔
 اس نے خوفزدہ ہو کر زبیدہ کی طرف دیکھا۔

”اکبر کی ماں ہے کوئی غیر نہیں آ کر مل لو۔“ زبیدہ نے جس انداز سے منہ بنا کر کہا تھا وہ سمجھ گئی تھی کہ کس اکبر
 کی ماں ہو سکتی ہیں وہ خاتون رہا سہا اعتماد بھی زائل ہو گیا اس کا جی چاہا کسی کی پرواہ کئے بغیر وہاں سے بھاگ
 جانے لگا اس میں اتنی ہمت نہ تھی۔

”السلام علیکم۔“ وہ پاس آ کر سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔
 ”وعلیکم السلام جنتی ریو ماشاء اللہ۔“ رو بینہ نے دو قدم آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر محبت بھرا بوسہ دیا۔ وہ اتنی
 ڈارنی بے ہوش ہونے لگی یوں لگ رہا تھا اکبر سامنے کھڑا ہو۔

”بیٹھو حرم بیٹا! اکبر او بیٹس میں تمہاری ماں کی طرح ہوں مجھ سے کیا گھبرانا۔“ انہوں نے حرم کا ہاتھ پکڑ کر
 پاس بٹھایا اور محبت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”مجھے تو یہ چکر ہی کچھ اور لگ رہا ہے کس خوشی ہی میں ہے یہ رو بینہ؟ اس کے غنڈے اکبر کو میں حرم جیسی
 معصوم لڑکی دے دوں گی ہونہہ... بری ہوں مگر اتنی بھی نہیں اس کو لڑا ایک چھوڑوں بہترین رشتے مل جائیں گے
 اس غنڈے سے اب میں رشتہ داری بناؤں گی بھی نہیں رو بینہ بیگم بہت جلد تمہاری یہ خوشی ملیا میٹ کر دوں گی تم
 پہلے منہ سے بھاپ تو نکالو یہ محبتیں کس خوشی میں ہو رہی ہیں؟“ زبیدہ نے چونک کر رو بینہ کے حرم کی طرف
 التفات کو ملاحظہ کیا تھا۔ حرم کے گود میں رکھے ہاتھ کانپ رہے تھے جھکی پلکیں لرز رہی تھیں وہ صوفیے کے
 کنارے پر یوں نکلی تھی گویا ابھی بھاگ نکلے گی رو بینہ کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خونزدہ ہے۔

”بیچارہ بن ماں کی بچی ایک بار میرے گھر آ جائے اتنے پیار سے رکھوں گی کہ ہر خوف اور ڈر بھول جائے
 گی۔“ وہ چھبلی بار اشفاق صاحب کی طبیعت کا پوچھنے آئی تھیں تو واپسی پر انہوں نے فلک سے پوچھا تھا کہ یہ
 خاموش سی لڑکی کون ہے وہ اس وقت پائپ لگائے صحن دھونے میں مگن تھی نازک سے ہاتھ بہت نفاست سے صفائی
 میں جتے ہوئے تھے سیاہ لباس میں دوپٹہ اوڑھے گم صم واداس سی یہ لڑکی ان کے دل میں گھر کر گئی تھی اپنے ارد گرد
 سے بے نیاز پورے گھر کا کام کرتے ہوئے اسے کسی شے سے سروکار نہ تھا فلک نے بتایا کہ اشفاق چچا اپنے بڑے
 بھائی کو گھرنے آئے ہیں حرم انہی کی بیٹی ہے ماں کا کچھ سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور پھر فلک کی بات پر وہ حرم کو

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اپنی بھابی کے روپ میں دیکھا جاتی تھی ہے ذل میں دبی خواہش انگڑائی لے کر شدت سے بیدار ہوتی تھی۔
 ”حرم جاؤ! تم ذرا بہنوں کو تو جگا لو! اتنی دیر ہو گئی یہ لوگ ابھی تک نحوست پھیلائے سو رہے ہیں۔“ زبیدہ سے
 اور برداشت نہ ہو تو گھبرائی سی بیٹھی حرم کو بہانے سے اٹھا دیا اسے تو بس اسی بات کا انتظار تھا اس کا بس چلتا تو
 فوراً دوڑ لگا لیتی اس کے جاتے ہی روبینہ بھی کھڑی ہو گئیں زبیدہ نے ناچاہتے ہوئے بھی جھوٹے منہ چائے کا
 کہا مگر روبینہ مزید ٹھہرنا نہیں چاہتی تھیں۔ حرم نیچے آگئی تو وہ جا چکی تھیں۔
 ”ادھر آؤ۔“ اسے کمرے کی سمت جاتا دیکھ کر زبیدہ نے آواز دی۔
 ”جی چچی۔“ وہ پاس آئی۔

”اکبر سے شادی کرنا چاہتی ہو؟ اگر ہاں تو صاف صاف بتا دو۔“ وہ صوفے پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی
 تھا نیدارنی لگ رہی تھیں۔
 ”جی.....؟“ وہ ہونق بنی ان کو دیکھے گئی۔

”اگر تمہیں اکبر پسند ہے چاہتی ہو کہ تمہاری شادی اس سے ہو تو مجھے بتا دو میں روبینہ سے بات کرتی
 ہوں۔ حرم کو اس سے پہلے بھی زبیدہ سے اتنا خوف محسوس نہیں ہوا تھا جتنا کہ اس وقت۔
 ”نہیں۔“ اس کے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے اتنی سنگین بات بھلا وہ کیسے سوچ سکتی تھیں حرم
 کے بارے میں حالانکہ وہ تو اکبر کو جانتی تک نہ تھی بس غائبانہ تعارف سنا تھا اس بلا کا۔

”کیا نہیں.....؟“ بھی اگر شادی کرنی ہے تو صاف صاف بتاؤ؟“ وہ ہنوز اس کے خوف کو ہوا دے کر مزے
 لے رہی تھیں وہ بھی تو یہی چاہتی تھیں کہ حرم کو اتنا ہراساں کریں کہ وہ کبھی اکبر کے گھر والوں کے سامنے نہ آئے۔
 ”مجھے اس..... سے شادی..... نہیں کرنی چچی..... پلیز۔“ وہ پچکیوں سے منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

”بھئی مجھے تو لگتا ہے تمہیں وہ لوگ اچھے لگتے ہیں میں نے سوچ لیا ہے روبینہ سے کہہ کر سادگی سے نکاح
 اور زنجستی کی چھوٹی سی تقریب رکھ لیں گے۔“ انہیں لگا حرم ابھی دو سیکنڈ میں بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔
 ”پلیز چچی!“ وہ بھاگ کر آئی اور ان کے قدموں سے لیٹ کر زار و قطار اہٹا کرنے لگی۔

”پلیز ایسا نہ کریں میں مر جاؤں گی مجھے اس سے شادی نہیں کرنی پلیز مجھے بچالیں۔“ وہ جس طرح رورہی
 تھی زبیدہ کا سخت دل موم بن کر پگھل گیا ان کا تو ارادہ تھا خوب اسے خوفزدہ کریں گی مگر وہ جتنی نازک اور
 بزدل بھی نہیں ڈرتا کچھ ہونہ جائے وگرنہ سارا نام ان پر آ جائے گا۔

”اچھا اچھا اب بس کرو! اٹھو یہاں سے۔“ انہوں نے سخت لہجے میں اسے ڈپٹا اور کندھوں سے پکڑ کر پاس بٹھالیا۔
 ”اگر وہ لوگ تمہیں ایسے ہی ناپسند ہیں تو کیوں تم پھر روبینہ کے پاس آ کر لاؤ وصول کر رہی تھیں۔“ کب
 سے جو بات انہیں کھٹک رہی تھی بالآخر زبان پر آ ہی گئی۔

”آپ نے تو بلایا تھا مجھے۔“ وہ آنسو صاف کرتے ڈرتے ہوئے بولی زبیدہ کا کیا بھروسہ تھا شاید اس بات
 پر اک ہاتھ جڑ دیتی انہوں نے اس کی سرخ روئی روئی خوفزدہ نم آنکھوں میں گھور کر جھانکا۔

”ساری زندگی منہ کی منہ رہنا“ کبھی میرے کہے بغیر بھی کچھ سمجھ جایا کرو اب وہ گھر آئی مہمان تھی بھرم تو
 رکھنا تھا میں نے بلا بھی لیا تو تم کوئی بہانہ کر کے وہاں سے ٹل جاتیں مگر نہیں بھئی تم تو معصوم ہو جو چچی نے کہہ دیا
 اسے پھر بریکر سمجھ کر قبول کر لیا۔“ انہوں نے بھی خوف تا کہ کر نشانے لگائے۔
 ”پلیز چچی آؤ سناؤ میں کبھی ان کے سامنے نہیں آؤں گی مگر پلیز ایسا مت کریں مجھے اس آدمی سے بہت

ڈر لگتا ہے پلیز چچی میں بر جاؤں گی۔ وہ پھر سے رونے لگی۔
 ”میں بھی تو تمہارا بھلا چاہتی ہوں نہ ہی تم ان کے سامنے آؤ گی اور نہ ہم اس جھنجھٹ میں پڑیں گے میں کسی سے نہیں ڈرتی مگر اس اکبر سے چاہ کر بھی خود کو ڈرنے سے باز نہیں رکھ سکتی جتنا بندہ اس سے ددر رہے گا اتنا ہی سکون میں ہوگا اس کے سامنے آنے کا مطلب ہے ساری زندگی سر پکڑ کر رونا تم معصوم ہو خوبصورت ہو اور سب سے بڑھ کر بزدل ہو وہ اگر تمہارے حسن سے متاثر ہو گیا تو تم جیسی کمزور لڑکی کو حاصل کرنا اس جیسے خطرناک غنڈے کے لئے مشکل نہیں پھر تمہیں تمہاری یہ زبیدہ چچی بھی بچا نہیں پائے گی میری اپنی بیٹیاں بھی اس کے سامنے آتی ہیں مگر تمہاری بات اور ہے تم بہت حسین ہو میں نہیں چاہتی کہ ہمارا اس سے کوئی ناٹھ جڑے بندہ زبان سے بات کرتا ہے مگر وہ جنگجو گولی کی زبان سے بات کرتا ہے میری ماں تو کبھی اس کے سامنے نہ آتا میں نے خبردار کر دیا ہے باقی تمہاری مرضی۔ انہوں نے گویا ہاتھ جھاڑے مطلب ان کا کام ختم وہ جتنا اسے خوفزدہ کرنا چاہتی تھیں حرم اس سے کئی گنا زیادہ ڈر گئی تھی۔ وہ تھر تھر کانپتی روتی رہی۔

”اب ایسے بیٹھی کیا رو رہی ہو اکیڈمی نہیں جانا کیا؟“ انہوں نے پھر سے جھاڑ پلائی۔

”مجھے باہر جانے سے بہت..... ڈر لگ رہا ہے۔“ اس نے مارے خوف کے اپنا کاغذ ہاتھ منہ پر رکھا۔
 ”عجیب بے وقوف لڑکی ہو اب ایسی بھی اندھیر نہیں مچی پاگل وہ تو پھر سے شہر چھوڑ کر روپوش ہو گیا ہے اور اس طرح چلا جائے تو بہت عرصے بعد لوٹتا ہے باہر گھات لگائے تھوڑی بیٹھا ہے کہ حرم نکسے گی اور وہ تمہیں پکڑ کر لے جائے گا یہ نہیں تمہارا کیا بنے گا لڑکی میرے بغیر تو تم کسی کام کی نہیں۔ وہ جھلا کر بولیں اس کا خوف تو کم نہیں ہوا تھا مگر دل کو ڈھارس ضرور ہوئی۔

”اٹھو بھی۔“ اسے سوچوں میں گن بیٹھے دیکھ کر زبیدہ نے گرگا وہ اٹھی تھی۔

”نہ رہے گی میں نہ بچے گی بانسری۔“ حرم کی نازک پشت پر لہرائی بسی چوٹی پر نگاہیں جمائے وہ مسکرائی تھیں۔ اس بات سے بے خبر کہ قسمت کیا طے کئے بیٹھی تھی۔

☆☆☆☆

”کہاں جا رہی ہیں؟“ وہ جوان در داخل ہوا حرم کو بیٹک اور فائل تھا سے سیاہ چادر میں لپٹے دیکھ کر پوچھ لیا۔
 ”وہ.....“ حرم سہم کر گڑ بڑائی تھی بے بسی سے گاہیں جھک گئیں۔ اس کی کھڑکتی پلکیں کانپتے ہونٹ اور سہا سہا سا انداز فرحان کو بے خود کر گیا جو پوچھا تھا اس کا جواب بھی خوفزدہ محبوب کے حسن نے بھلا دیا۔

”اس کی صورت کو جب سے دیکھا ہے

میری آنکھوں پہ لوگ مرتے ہیں“

”کیا ہوا حرم! رک کیوں گئیں؟“ زبیدہ اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر پاس چلی آئیں۔

”فرحان بیٹا! تم کب آئے؟“ وہ فرحان کو دیکھ کر سنبھل گئیں۔

”ابھی آیا ہوں حرم آپ نے جواب نہیں دیا کہاں جا رہی ہیں؟“ ماں کو جواب دے کر وہ حرم سے گویا ہوا۔

”اللہ میاں کی گائے ہے یہ کجخت ڈبو دے گی اس کی یہ بزدلی ہمارے خاندان کو۔“ انہوں نے سر جھکائے

بجروں کی طرح ہاتھ کی انگلیاں چٹخاتی حرم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”اکیڈمی جا رہی ہے۔“ اس کے بجائے زبیدہ نے جواب دیا۔

”یہ تو بہت خوش آمدات ہے کس چیز میں داخلہ لیا ہے؟“ وہ خوش ہوا وہ خاصوش رہی۔

یہ پڑھ نہیں رہی بلکہ بڑھا رہی ہے۔ زبیدہ ہی اس کے سوالوں کا جواب دے رہی تھیں۔
 ”کیا.....؟“ فرحان کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”پڑھا رہی ہے مگر کیوں؟“ اب کی بار زبیدہ بھی خاموش رہ گئیں جواب نہ دے سکیں۔
 ”آپ لوگ جواب کیوں نہیں دیتے آخر ایسی کیا مجبوری آگئی کہ حرم کو گھر سے نکلنا پڑا؟ آپ لوگ جانتے بھی ہیں کہ ہمارے خاندان میں یہ روایت نہیں میں پولیس میں اپنوں سے دور بیٹھا کس لئے کما رہا ہوں؟ آپ سب لوگوں کے لئے“ کیا حرم کا خرچ اس گھر میں پورا نہیں ہوتا جو یہ خود کمانے لگی ہے؟“ فرحان کو بہت دکھ بلکہ صدمہ پہنچا تھا حرم کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔

”بیٹے ایسی کوئی بات نہیں حرم کو اس گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں بس آج کل کی لڑکیوں کو عادت نہیں گھر میں فارغ بیٹھے کی پریشان ہو جاتی ہیں پھر ماشاء اللہ سے اس کے پاس ڈگری ہے یہ خود چاہتی تھی کہ اپنے ہنر کو کام میں لائے گھر بیٹھے اس کی شخصیت کو گن لگ جائے گا اب بھلا میں کیا کرتی اس کی خواہش ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا میں اسے سگی بیٹی سمجھتی ہوں پھر کیسے اس کی بات رد کرتی۔“ ہمیشہ کی طرح کسی کی پرواہ کئے بغیر وہ اپنی کہہ گئیں۔

”سوری اماں! میں سمجھا تھا شاید یہ ضرورت کے تحت نکلتی ہیں گھر سے میری تربیت جیسے آپ نے کی ہے آپ جانتی ہیں ہم بہن بیٹیوں کی کمائی نہیں کھا سکتے۔“ وہ ماں کی وضاحت پر شرمندہ ہو گیا۔
 ”سوری حرم! اگر آپ کو برا لگا ہو۔“ اب کے وہ آنسو ضبط کرتی حرم سے مخاطب ہوا۔
 ”چلو جاؤ حرم! تمہیں دیر ہو رہی ہے۔“ زبیدہ نے خاموش کھڑی حرم کو مخاطب کیا۔
 ”آئیے میں چھوڑ آتا ہوں۔“ وہ نکلنے لگا۔

”ارے بیٹا تم تھک گئے ہو گے جا کر آرام کرو میں ویسے بھی نسرین (پڑوسن) کے ہاں جا رہی ہوں چھوڑ آؤں گی۔“ وہ فرحان کو روک کر اسے اشارہ کرتی روڑے کی سمت بڑھی گئی وہ رو بوٹ کی مانند ان کی تقلید میں چل پڑی فرحان کو اپنے کمرے میں مجبوراً جانا پڑ گیا۔

”میرے معصوم سے بیٹے کو اپنے جال میں پھنسا لیا ہے کبخت نے“ حسین چہرے کے بل بوتے پر کیسے تڑپ گیا تھا اس گھنی کی نوکری کا سن کر خوب سکھاپڑھا کر مری سے بہشتن۔“ انہوں نے سلگ کو فائل سینے سے لگائے خود حرم کو دیکھا یوں لگ رہا تھا گویا ابھی ان سے لپٹ جائے گی۔
 ”ہونہہ..... خوب جھٹی ہوں یہ چالبازیاں میں نہیں ساثر ہونے والی۔“

”کل چلا جائے گا فرحان..... کوئی ضرورت نہیں اس کے سامنے آنے کی میں نہیں چاہتی جاتے وقت اس کی نظر تم پر پڑے۔ کبخت کا حسین بھولا بھالا چہرہ اسے وہاں کہاں چین سے رہنے دے گا میرے بیٹے سے دور رہو بہت تم دل ہے میرا معصوم سا بیٹا ترس کھا کر کہیں بیوی ہی نہ بنالے اس کو۔ لونسرین کا گھر آ گیا اب تم بھی جاؤ اور بہادر بنو کب تک میرے پلو سے بندھی رہو گی ساری زندگی میں تو تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی ناں۔“ وہ سلگ کر کہتے نسرین کے گھر میں کھس گئیں حرم نے آنسو پونچھ کر خوفزدہ سے انداز میں قدموں کی رفتار بڑھا دی تھی۔

☆☆☆☆

گھر میں گزرنے والی آخری رات اس نے بہت بے چینی میں گزاری تھی کھڑکی میں کھڑے ہو کر چاند کو دیکھتے ہوئے وہ خود سے لڑ رہا تھا۔

”اے دل! جب انہما کی طاقت نہیں تھی تو کبخت کیوں کی؟ محبت تو بہادر بنا دیتی ہے پھر میری محبت بزدل

کیوں اس نے معصوم چہرے کو دیکھ کر میرے قدم رکے گئے ہیں اس کی اداس آنکھیں دیکھ کر میری نظریں الجھنے لگتی ہیں اس کے بغیر میرا دل بہت دیران ہے کیسے کہوں کہ میں صرف اسے دیکھنے آیا ہوں وہ میرے گھر میں رہتی ہے میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے اپنی محبت کو اپنے ہی گھر میں چلتے پھرتے رہتے بستے کام کرتے دیکھا ہے کتنی قریب محسوس ہوئی تھی اب پھر سے دوری حاصل ہونے والی ہے میں کیونکر پردیس میں چین سے رہ پاؤں گا۔ وہ کھڑکی سے ہٹا اور کمرے سے نکل کر بیڑھیاں اترنے لگا۔

وہ اپنے مہربان نجات دہندہ کے روپ میں فرحان کو موچنے لگی تھی وہ دل میں آنے کو دروازے پر منتظر کھڑا تھا کہ کب یہ بند کھواڑ کھلے اور اس دکھی لڑکی کو قفس سے رہائی دلا کر اپنے سنگ لے جائے۔ آنکھیں بند کئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کھڑکی سے آتی ہو آنے اس کے سر سے دو پٹے سر کا دیا وہ یوں مسکرائی جیسے کسی نے ہاتھ سے سر کا دیا ہو کسی کے آنے کی آہٹ محسوس کر کے اس نے موندیں آنکھیں کھولیں اور سیدھی ہو چکی تھی۔ فرحان بند دروازے کے پاس کھڑا دستک کے لئے ہاتھ اٹھانے کو تھا حرم پٹنگ سے پاؤں لٹکاتی چپل پیروں میں اٹس کر دو پٹے پہنتی بھاگ کر دروازے تک آئی تھی۔ کیا دل جو ترغیب دے رہا تھا صبح تھا خوف تو تھا ہی مگر دل کے دھڑکنے کی آواز اسے محتاط بھی کر رہی تھی۔

اسے انجان راستوں پر گزر جانے کی خواہش تھی
محبت میں امر ہو جانے کی مر جانے کی خواہش تھی
وہ کہتا تھا جون تیرگی ہے

اور ہمیں اس تیرگی میں رنگ بھرنے ہیں روشنی کے
اور یہ ہم کو مختصر سے چند لمحے جو میر ہیں
لمحے ہمیں محبت سے آباد کرنے ہیں

کسی کو دور سے دیکھنا اور کسی سے بات کرنی ہے
جہاں پہ دن گزر جائیں وہیں پر رات کرنی ہے
وہ کہتا تھا محبت کا کوئی موسم نہیں ہوتا

یہ ہر موسم کا جذبہ ہے جو بھی بھی کم نہیں ہوتا
ادھوری ہی محبت ہے ہمیں تکمیل کرنی ہے
محبت کو نئے ڈھب سے بسر کرنے کی خواہش

اسے شب بھر جگانی ہے
نہ جانے کون سی خواہش اسے ہریل رلاتی ہے
شناسہ تھا ہر ایک سے بہت انجان رہتا تھا

اسے ہر شخص کو حیران کر جانے کی خواہش تھی
محبت میں امر ہو جانے کی مر جانے کی خواہش تھی
اس نے دھڑکتے دل پر قابو پاتے مسکرا کر دروازہ کھولا وہاں کوئی نہ تھا رات کا خاموش سناٹا ہر سوں چھایا ہوا

تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے واپس اپنی جگہ پر آئی تھی۔

”یہ میں کیا کرنے لگا تھا میرے اللہ! شکر ہے تو نے بچا لیا میں اسن جان سے پیاری معصوم سی لڑکی کو دولتوں

www.paksociety.com
 کے دلدل میں دھکیئے جا رہا تھا اگر کوئی دیکھ لیتا تو میری نیت بڑی نہ بکنی پر وہ تو بے نام ہو جاتی میں اس کا کرن ہی
 سہی پر کون یقین کرتا کہ رات کے دو بجے میں اس کے پاس کیا کرنے جا رہا تھا۔ میں تو عزت سے باہر چلا جاتا
 پیچھے اس بیچاری کے لئے نفرتوں کی اونچی دیواریں تعمیر کر جاتا جسے ڈھاتے ڈھاتے وہ خود ڈھے جاتی۔ کمرے
 میں پہنچ کر اس نے دروازہ لاک کیا اور ماتھے پر آیا پسینہ صاف کر کے سر پکڑتا کمرے میں کھڑا تھا۔

”مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا، محبت لوگوں کو بہادر بناتی ہے مگر مجھے میری محبت نے بزدل کیوں بنایا؟
 صرف حرم کے لئے اس کی وجہ سے میں کمزور پڑ گیا ہوں میں اسے تاریکیوں میں نہیں دھکیل سکتا، میں خاموش
 رہوں گا، صرف اور صرف حرم کے لئے مجھے اس کی لاج رکھنی ہے، وگرنہ یہ دنیا اس جیسی معصوم لڑکی کو جینے نہیں
 دے گی وہ جینے لگا تھا مگر محبت نے اسے ہارنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆☆

سنا ہے اس محبت میں
 بہت نقصان ہوتا ہے
 مہلنا جھومتا جیون
 قہموں کے نام ہوتا ہے
 سنا ہے چین کھو کر وہ
 سچ و شام روتا ہے
 محبت جو بھی کرتا ہے
 بہت بد نام ہوتا ہے
 سنا ہے اس محبت میں
 کہیں بھی دل نہیں لگتا
 بنا اس کے نگاہوں میں کوئی موسم نہیں چلتا
 خفا جس سے محبت ہو وہ جیون بھرنے نہیں ہنستا
 بہت انمول ہے وہ دل
 اجڑ کے پھر نہیں بستا

سنا ہے اس محبت میں بہت نقصان ہوتا ہے

رات جاگنے کی وجہ سے دن میں دیر تک وہ سو نہ رہا، تیریدہ نے صبح سے حرم کو گھن چکر بنا کر کاموں میں الجھا
 رکھا تھا اور خود اس کے پاس سے ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں دل میں چور تھا کہیں بیٹھا جاتے جاتے کوئی عہد و
 پیمانہ باندھ جائے اس دو ٹکے کی لڑکی سے یہی خوف انہیں حرم کے سر پر منڈلانے پر مجبور کر رہا تھا۔ پورے گھر
 کی صفائی اور کچن کا کام ختم کروا کر وہ اسے اکیڈمی خود چھوڑ کر آئیں اور باہر کا دروازہ لاک کر دیا، بیٹیاں ماں کا
 بولا یا بولا یا عجیب سا رویہ اور حرکتیں دیکھ کر حیران تھیں وہ سمجھ رہی تھیں شاید فرحان بھائی کے جانے کا دکھ انہیں الجھا
 رہا ہے، فرحان غسل کر کے تیار نیچے آیا تو ماں نے خودناشتہ لاکر سامنے رکھا اور دیر تک اس سے باتیں کرتی رہیں۔
 ”کہاں جا رہے ہو؟“ اسے باہر کی طرف جاتا دیکھ کر وہ بغیر چہل پہنے صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس

WWW.PAKSOCIETY.COM تیزی سے آئی تھیں۔

رداڈائجسٹ [229] اکتوبر 2016ء

”دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں پھر جانے کتنا عرصہ لگے واپس آئے ہیں“ وہ اداسی سے مسکرایا۔
 ”فیصل سے بھی ملنے جاؤ گے؟“ وہ جھجک کر نظریں چراتے بولیں۔
 ”فیصل کی ہی اکیڈمی میں حرم پڑھاتی تھی۔“

”نہیں ای! وہ ایئر پورٹ سی آف کرنے آئے گا۔“ وہ ماں کی بے قراری کو حیرت سے دیکھتا بولا۔
 ”اچھا پھر جلدی آنا میں انتظار کروں گی۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولیں۔

”پلیز ای! ریلیکس میں پہلی بار تھوڑی جا رہا ہوں اچھا آپ فکر نہ کریں آدھے گھنٹے تک آؤں گا اور پھر فلائٹ تک کا ٹائم آپ کے ساتھ گزاروں گا اب تو خوش ہو جائیں۔“ وہ ان کے گرد بازو دلیپٹ کر ساتھ لگاتے ہوئے محبت سے بولا۔

”جیتے رہو۔“ اس کی اس قدر جنتیں اور توجہ پر ان کی آنکھیں نم ہو گئیں ماشاء اللہ خدا نظر بد سے بچائے۔ وہ باہر جاتے فرحان کے لمبے چوڑے سر پاپے کو نکھیں دل ہی دل میں بولیں اور اندر چلی آئیں۔ اس نے وعدہ پورا کیا آدھے گھنٹے میں واپس آیا اور سارا وقت انہی کے ساتھ گزار دیا سب نے دوپہر کا کھانا بھی اکٹھے مل کر کھایا تھا۔ دو بجے اس کی روانگی بھی آخر وقت تک اس کی بے قراری نظریں وہ حسین چہرہ تلاشتی رہیں مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس چہرے کو منع تھا محبوب کو دیکھنے سے وہ مجبور تھی زبیدہ بیٹی کی تکلیف کو محسوس کر رہی تھیں مگر وہ مستاکے ہاتھوں مجبور خود غرض بن گئی تھیں وہ ٹیکسی میں بیٹھا ٹیکسی روانہ ہوئی جس وقت حرم نے گلی میں قدم رکھا زبیدہ سید یہ اور سہماں دھول اڑاتی ٹیکسی کو نم آنکھوں سے دور جاتا دیکھتی رہیں اس کا دل ڈوب گیا۔

”تو فرحان بھائی چلے گئے۔“ ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوئی تو دونوں بہنیں اندر چلی گئیں حرم اور زبیدہ باہر رہ گئیں۔
 ”بیٹی مجھے تمہاری فرمانبرداری پر کوئی شبہ نہیں جیسی رہو میں نے بیٹی کی آنکھوں کے خواب پڑھ لئے تھے مگر مجبور تھی تم ابھی چکی ہو کم عمر ہواں ہوگی تو مستاکا خوف اور مجبوری سمجھ جاؤ گی مجھے معاف کر دینا میں خود غرض بن گئی تھی۔“ انہوں نے روتے ہوئے حرم کو سینے سے لگا لیا حرم کو سخت گریہ زبیدہ آج پہلی بار مہربان ہی ماں محسوس ہوئی تھیں ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے شاید بیٹی کی دوری نے اثر دکھایا تھا۔

☆☆☆☆

ایک مہینہ لگا تھا انہیں سنبھلنے میں بیٹی کے جانے کا غم انہیں چپ کر گیا تھا وہ تیز طراری زبیدہ اب دکھائی نہ دیتیں رفتہ رفتہ بدلنے لگیں اور وہی چٹنی چلاتی طنز کے طعنے پارتی زبیدہ بن گئیں۔

حرم باپ کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ گھر کے سارے کام بھی ذمہ داری سے نبھاتی اور اکیڈمی بھی باقاعدہ سے جاتی اب تو شفیق صاحب کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ خود کمانا چاہتی ہے اچھا تو نہیں لگا تھا مگر کیا کہہ سکتے تھے خاموش رہے وہ فائل سینے سے لگائے سیاہ چادر میں لپیٹی بے خبر چلی آ رہی تھی گلی کی طرف آتے ٹکڑ پر کچھ آدمی باتیں کرتے نظر آئے وہ ہمیشہ کی طرح سر جھکائے نیچے دیکھتی جا رہی تھی۔

”اکبر بھائی اس بار تم کچھ جلدی نہیں آ گئے؟ بھاگنا پڑا تھا کیا؟“ ہنستی مسکراتی آواز کسی مرد کی تھی۔ اکبر کے نام پر حرم کے کان کھڑے ہو گئے۔

”اللہ کیا یہ واپس آ گیا ہے چچی نے تو کہا تھا کہانی عرصہ تک باہر روپوش رہے گا۔“

”اکبر جنگجو بھاگنے والوں میں سے نہیں بھگانے والوں میں سے ہے کام تو اس بار بہت تھکوا تھا مگر بہت آسانی سے کم وقت میں پورا کر آیا ہوں واہ واہ ہو رہی ہے ہر جگہ بڑے بڑوں نے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی ہے مگر میں جکڑ جائے والوں میں سے نہیں آؤں اور جتنا پسند کرتا ہوں اپنی من مرضی سے کام کرتا

www.paksociety.com
 ہوں۔ یقیناً اس کی پشت تھی حرم کی طرف گر آواز ہو، ہو وہی دنگ اور ڈونوک تھی جو اس دن اس نے اپنے گھر میں سنی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ نکلا، پیروں تیز ہو گئے گویا پہلے لگ گئے ہوں۔
 ”اللہ میری حفاظت کرنا۔“

”اچھا یا! یہ تو بتاؤ تم ہر کام اتنی آسانی سے کر کے پولیس سے بچ کیسے جاتے ہو؟“ بہت دلچسپی سے یہ سوال پوچھا گیا تھا۔

”ابے کیسے جاہل ہو تم جو ابھی تک اکبر بھائی کا اصول نہیں جانتے۔“ اکبر کے بجائے اس کا چچا محسن بولا تھا۔
 ”کیسا اصول؟“ اسی شخص نے دوبارہ پوچھا۔

”لوگ پہلی بار میں بولتے ہیں دوسری بار میں سمجھاتے ہیں مگر ہمارے اکبر بھائی پہلی بار میں بولتے ہیں اور دوسری بار میں گولی چلاتے ہیں۔“ وہ اپنی بات پر محفوظ ہو کر تہقہہ لگا گیا۔ اکبر نے اسے چپت لگائی تھی۔
 ”یہ بھی تو بول..... ماں کی دعا ہے میرے ساتھ۔“ اب کی بار تہقہہ لگانے والوں میں اکبر بھی شامل تھا، حرم خوف سے بے ہوش ہونے کو تھی گھر میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کیا اور کچن میں آئی نائل سلیپ پر رکھ کر اس نے ایسٹل کے گلاس میں پانی انڈیل کر لبوں سے لگایا، تھک کی کپکپاہٹ کی وجہ سے وہ پی کم رہی تھی، گرا زیادہ رہی تھی، زہیرہ نے ریہوٹ رکھ کر کچن کی سمت رخ کیا آج انہیں حرم بہت خوفزدہ لگی تھی، دروازے سے کچن تک جاتے ہوئے ان کی تیز نظروں نے تھر تھر کانپتی حرم کا مکمل جائزہ لیا تھا۔

”حرم! انہوں نے کچن کی جو کھٹ تھامے اسے آواز دی۔ وہ پہلے ہی خوفزدہ تھی ان کی آواز پر ایسٹل کا گلاس زمین پر گر کر اور شور پیدا کرتا رک گیا، سارا پانی نیچے گر گیا تھا۔
 ”کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟“ وہ حیران تھیں۔

”چچی۔۔۔ وہ اتنا کہہ کر رو پڑی۔
 ”الہی خیر..... بولو کیا ہوا؟ کچھ کر تو نہیں آئیں؟“ وہ دو ہتھوڑ سینے سے لگاتیں دو قدم آگے آئیں۔
 ”جی..... وہ..... انبر؟“ اتنا کہہ کر وہ خوفزدہ سی پھر سے رونے لگی۔
 ”اللہ.....“ چچی نے اکبر کے نام پر وہل کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔
 ”کیا کہہ دیا اس ڈاؤن؟“ کہیں کہیں دیکھ کر نہیں لیا؟“ وہ بہت خوفزدہ ہوئیں۔
 ”نہیں وہ..... گلی میں کھڑا تھا، میں نے نہیں دیکھا اسے۔“ وہ روتے ہوئے بمشکل بولی۔
 ”تو پھر کہیں اس نے تو نہیں دیکھ لیا تمہیں؟“ وہ پاس آ کر اس کا کندھا تھامے جھنجھوڑنے لگیں۔
 ”نہیں..... چچی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، میں باہر نہیں جاؤں گی۔“ وہ بہت خوفزدہ تھی کسی ہانگی کی طرح ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

”عجیب بے وقوف لڑکی ہو، سہا کر رکھ دیا میرے دل کو..... میں سمجھی بد معاش نے جانے کیا کہہ دیا جو تم اتنا ڈری ہوئی ہو، کچھ نہیں ہوتا بس آتے جاتے احتیاط کیا کرو۔“ وہ لا پرواہی سے کہہ کر کچن سے نکل گئیں۔
 ”حرم! امی کہہ رہی ہیں روٹی ڈال دو، سب کو بھوک لگی ہے۔“ سیماب نے اس کے حال پر توجہ دینے کی زحمت بھی نہ کی، پیغام پہنچا کر چلی گئی۔

☆☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

(باقی آئندہ)

رداؤ انسٹ 231 اکتوبر 2016ء

رواکی ڈائری

بچ کے بھی نکلنے کا راستہ نہیں جاناں!
جس طرح تمہیں سچ کے لازوال لحوں سے
واسطہ نہیں جاناں!

ہم نے سوچ رکھا ہے تم سے کچھ نہیں کہنا

مہوش جوادی ڈائری سے

منشی منظور حسین کی غزل

جس نے لوٹا تھا میرا گھر بار میرے سامنے
دیر تک روتا رہا وہ بار میرے سامنے
جو گناہوں میں رہا میرے برابر کا شریک
بن رہا ہے اب وہ با کردار میرے سامنے
میں بھی دل سے اس کی کم ظرفی کا قائل ہو چلوں
میری چاہت سے کر لے انکار میرے سامنے
اس زمانے کی خوشی بہ میرا حق بھی تھا ضرور
پر زمانہ بن گیا دیوار میرے سامنے
آئینے پر مارنے کو سنگ اٹھایا جب کبھی
تیرا چہرہ آگیا ہر بار میرے سامنے
میرے فن کی سلطنت کو کوٹنے کے واسطے
آگے منظور سب فنکار میرے سامنے

سیدہ تحسین ساجد کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد کی ایک خوب صورت غزل
بیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجد ہم نے بچتے دیکھا کم
تاریکی کے ہاتھ پہ بیعت کرنے والوں کا

روشنی فاطمہ فیصل کی ڈائری سے

نوٹی گیلائی کی نظم

ہم نے سوچ رکھا ہے

چاہے دل کی ہر خواہش

زندگی کی آنکھوں سے اشک بن کر

بہ جائے

گھر کی ساری دیواریں

چھت سمیت گر جائیں

اور بے مقدر ہم

اس بدن کے لمبے میں

خود ہی کیوں ندب جائیں

تم سے کچھ نہیں کہنا

کیسی نیند تھی اپنی، کیسے خواب تھے اپنے

اور اب گلابوں پر

نیند والی آنکھوں پر

زخمِ خو سے خوابوں پر

کیوں عذاب ٹوٹے ہیں

تم سے کچھ نہیں کہنا

گھر گئے ہیں راتوں میں

بے لباس باتوں میں

اس طرح کی راتوں میں

کب چراغ جلتے ہیں، کب عذاب ٹلتے ہیں

اب تو ان عذابوں سے

مہوش جواد کی ڈائری سے

نوشی گیلانی کی غزل

چراغِ دشت سے زندہ جلا گیا مجھ کو
یہ درورات کے لمحوں میں کھا گیا مجھ کو
ہمیں تو پھول کی خوشبو پہ نیند آئی تھی
نجانے خاک پہ کیسے سلا گیا مجھ کو
یہاں تو وقت کی آنکھوں سے خون چپکتا ہے
یہ میزبان کہاں بٹھا گیا مجھ کو
تیرے خواب کو چھو کر ہوا میں آئی ہیں
یہی خیال تو پتھر بنا گیا مجھ کو
ہمارے ضبط کی دنیا مثال دیتی ہے
نکل کے آنکھ سے آنسو رلا گیا مجھ کو

آسیہ علی کی ڈائری سے

حسن نازی کا کلام

پچھڑتے تو وقت
اس نے کہا تھا
نہ سوال کرنا
نہ جواب ملے گا
مجھے بھول جانا
قرار ملے گا
ہم اس مقام پر تھے
نہ سوال کیا
نہ جواب ملا
نہ بھول سکے
نہ قرار ملا

سورج کی بس ایک کرن سے کھٹ جاتا ہے غم
رنگوں کو کلیوں میں جینا کون سکھاتا ہے
شبنم کیسے رکنا سیکھی تھی کیسے رم
آنکھوں میں یہ رکنے والے خواب نہ رکنے پائیں
دل کے چاند چراغ کی دیکھو تو نہ ہو مرہم
ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انسان
بہت خوشی سے بھی تو آنکھیں ہو جاتی ہیں نم

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

نوشی گیلانی کی نظم

جہیز کی خاطر
گھر میں بیٹھی
ایک مفلس کی
میں ہوں بیٹی
اور ہم وطنوں سے

پوچھ رہی ہوں
جہیز پیارا مجھ سے کیوں ہے
کوئی بتائے اپنا کیوں ہے

شائقہ ایاز کی ڈائری سے

نوشی گیلانی کی غزل

ریزہ ریزہ سپنوں والے ٹوٹے چہرے آدھے لوگ
جانے والے کب آتے ہیں کیوں کرتے ہیں وعدے لوگ
آس میں بیٹھی شہزادی کی مانگ میں چاندی جھانک چکی
اتنی دیر سے کیوں آئے ہیں آخر یہ شہزادے لوگ
پیار کی راہ پہ انگلی تھامے اندھا دھن چل پڑتے ہیں
نہ بھی میں مر جاتے ہیں ہم سے سیدھے سادھے لوگ
ہم دونوں میں کون سے مجرم یہ طے ہونا مشکل ہے
آدھا شہر ہے حائی تیرا ساتھ ہیں میرے آدھے لوگ

انشعار

ثناء حیات _____ کراچی
 محبتوں میں عداوتیں کیسی
 چاہنا کسی کو تو پھر شکایت کیسی
 جب تمہارا اس پر اعتبار ہے اتنا
 تو ذرا ذرا سی بات پر وضاحتیں کیسی

روشنی فیصل _____ کراچی
 کتنا نادان تھا طوفان کو کنارہ سمجھا
 کتنے بے چارے سہاروں کو سہارا سمجھا
 کتنے کم ظرف تھے وہ لوگ جو ساحل پر تھے
 ہمیں ڈوبتا دیکھا اور نظارا سمجھا

شاملہ ملک _____ کراچی
 آپ کی چاہت میں ہم زمانہ بھول گئے
 آپ کے بعد کسی اور کو اپنا بنانا بھول گئے
 آپ سے محبت ہے یہ بتایا سارے جہاں کو
 مگر آپ ہی کو بتانا بھول گئے

حنانیازی _____ میانوالی
 تیرے بنا ہم جینا بھول جاتے ہیں
 زخموں کو سینا بھول جاتے ہیں
 تو زندگی میں سب سے عزیز ہے ہمیں
 تجھ سے ہر بار یہی کہنا بھول جاتے ہیں

پلو شہ _____ پشاور
 مجھ کو بھی راس آیا نہیں دوسرا کوئی
 اس کو بھی میرے بعد سہارا نہیں ملا

عانیہ نیازی _____ ربوہ
 تجھ سے نہیں وقت سے ناراض ہوں میں
 جو کبھی تجھ کو میرے واسطے نہیں ملا
 امیرین حیدر _____ اسلام آباد
 ہم شہر بھر میں اذیت پسند مشہور ہیں
 گر دعا چاہیے تو میرا دل دکھائیے

صرف منیر _____ سرگودھا
 غم زندگی، غم بندگی، غم دو جہاں، غم کارواں
 میری ہر نظر تیری نظر تیری ہر نظر میرا امتحان
 دھنک ناز _____ کراچی

اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا
 لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا
 تم نے کون سی اچھائی کی ہے
 چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا

حناعلی _____ ملتان

آگہی کا عذاب اب باقی ہے
 کھل گئی آنکھ خواب باقی ہے
 وقت قتل تھا اڑ گیا کب کا
 ڈاری میں گلاب باقی ہے

نور علی _____ لیہ

کچھ تجھ کو محبت پر یقین تھا نہ وفا پر
 کچھ دکھ میری تقدیر میں لکھا بھی بہت ہے
 چنانی اندھیروں سے بھلا کیسے بچاتا
 اک شخص ترے ہجر میں جاگا کتنی بہت

وہ بات ہے تجھ میں کہ کوئی تجھ سے نہیں ہے
اے کاش کوئی دیکھے تجھے میری نظر سے
شبانہ حمید مغل _____ کھاریاں
رات کے اندھیروں وہ ایسے یاد آتا ہے
جیسے کوئی جان نکل رہی ہو پانی مانگتے مانگتے
سنبل محسن _____ کھاریاں

اتنے خلوص سے تجھے جانتے ہیں ہم
جیسے تیرا پیار میری بخشش کا وسیلہ ہو
پروین نور _____ کھاریاں

خاموشیاں ہی بہتر ہیں شاید
لوگ لفظوں سے روٹھتے بہت ہیں

ثوبیہ بشیر _____ کھاریاں

عیب بہت ہیں مگر اک بات کہوں
کسی سے تعلق کبھی مطلب کے لیے نہیں رکھا

انیلہ رضوان _____ کھاریاں

تقدیر نے جیسے چاہا ویسے ڈھل گئے ہم
بہت کنبھل کے چلے پھر بھی پھسل گئے ہم

کسی نے مجھ سے توڑا کسی نے دل
اور لوگوں کو لگتا ہے کہ بدل گئے ہم

صائمہ قریشی _____ کراچی

میری روح میں جو اتر سکیں وہ محبتیں مجھے چاہئیں

جو مراب ہوں نہ عذاب ہوں وہ رفاقتیں مجھے چاہئیں

اپنی ساعتوں کی تلاش ہے جو کلینڈروں سے اتر سکیں

جو لمحے کے ساتھ گزر گئیں وہی فرصتیں مجھے چاہئیں

فاطمہ ظہیر _____ حیدرآباد

پچھڑ کے تجھ سے نہیں ہو سکے کسی کے بھی

تیری تلاش میں ملتے تو ہر کسی سے ہیں

برسوں سے پھر رہا تھا میں جس کی تلاش میں
وہ مل گیا تو اس سے ستارہ نہیں ملا

زابعدہ منیر _____ سرگودھا

گزرے سالوں کی طرح سب کچھ ویسا ہی ہے

بس اک تو نہیں تیرا احساس نہیں

اریشہ _____ کمالیہ

سوچا کہیں کہ ٹوٹ نہ جائے کسی کا دل

گزری ہے اپنی عمر اسی دیکھ بھال میں

خالد وہ بات تو اب اسے یاد بھی نہیں

ہم جی کو خون کر گئے جس کے ملال میں

صباحہ _____ ہارون آباد

اواس لمحوں کا نہ کوئی ملال رکھنا

طوفان میں بھی وجود سنبھال رکھنا

کسی کے لیے شرط زندگی تم ہو

کسی کی خاطر ہی اپنا خیال رکھنا

عاصمہ رشید _____ فیصل آباد

تم کیا جانو کہا ہے تنہائی

اس ٹوٹے ہوئے پتے سے پوچھو کیا ہے جدائی

یوں بے وفائی کا الزام نہ دے جاناں

اس وقت سے پوچھ کس وقت تیری یاد نہیں آئی

نوشین مدثر _____ لاہور

بہت چاہا مگر نہیں بھلا نہ سکے

خیالوں میں کسی اور کو لا نہ سکے

اس کو دیکھ کے آنسو تو پونچھ لیے

پر کسی اور کو دیکھ کے مسکرا نہ سکے

فوزیہ احمد _____ بہاولنگر

اترا ہے میرے دل میں کوئی جانے مگر سے

اب خوف نہیں کوئی اندھیروں کے سفر سے

اس ماہ میں

اس ماہ کے اقتباس

اس ماہ کے اقوال

حضرت علیؑ نے فرمایا:

☆ اخلاق وہ چیز ہے جس کی کوئی قیمت نہیں دینی جتنی مگر اس سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔
☆ خاموش رہو یا ایسی بات کرو جو خاموشی سے بہتر ہو۔

☆ زندگی استاد سے زیادہ سخت ہوتی ہے استاد سبق دے کر امتحان لیتا ہے اور زندگی امتحان لے کر سبق دیتی ہے۔

☆ اگر اللہ تمہاری دعائیں پوری کر رہا ہے تو وہ تمہارا یقین بڑھا رہا ہے اور اگر دعائیں پوری کرنے میں دیر کر رہا ہے تو وہ تمہارا صبر بڑھا رہا ہے اور اگر تمہاری دعاؤں کا جواب نہیں دے رہا تو وہ تمہیں آزار رہا ہے۔

☆ مجھے تعجب ہوتا ہے اس شخص پر جو کل تک نطفہ تھا اور کل مردار ہو جائے گا اور پھر پھر بھی دنیا میں اکڑتا ہے۔

عشرت شفیق - کراچی

اس ماہ کا شعر

حقیقت

آگہی کا شعور رکھنے سے
زندگی ہو گئی ہے اداس بہت

روشنی فاطمہ فیصل - کراچی

ناک

کچھ لوگ بالکل ناک میں بولتے ہیں۔ کئی ناک کے ذریعے خراٹے لیتے ہیں۔ کچھ ہمیشہ ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں کئی کو ناک میں نیل ڈال کر مطیع کیا جاتا ہے۔ انسان ناک گھس کر منتیں کرتا ہے تو بہ کرتے وقت ناک رگڑتا ہے۔ ناک میں دم آجائے تو ناک سے تن سیدھی لکیریں کھینچتا ہے۔ خاندان کی ناک بنا رہتا ہے۔ اپنی ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ کسی کی بے ہودہ حرکت سے خاندان کی ناک کٹ جاتی ہے موم کی ناک چدھر چا ہو موڑ لو۔ ناک کا بال ناک سے زیادہ قیمتی ہے۔ بعض لوگ دوسروں کے معاملے میں خواجواہ اپنی ناک ٹھونس دیتے ہیں۔ ناک سناکن ہے چہرہ متحرک ہے اس لیے جہاں چائے چہرہ جاتا ہے۔ ناک کو بھی جانا پڑتا ہے، ناک صرف سو گھننے کے لیے ہے بہت سے لوگ اپنی ناک سے ہی بہت کچھ تاڑ جاتے ہیں۔

شفیق الرحمن کی کتاب "انسانی تماشہ" سے انتخاب

عانیہ نیازی - ربوہ

عشق

عشق انسان کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ یہ ایک رنگ مال ہے اگر انسان پتھر ہو تو اس کی رگڑ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

رداؤ انسٹ 236 اکتوبر 2016ء

تم میرے ہو کر نہیں دیتے

شاعر: وصی شاہ

انتخاب: اریشہ۔ کمالیہ

اس ماہ لفظوں سے روشنی

☆ شہر، دکھ اور محبتیں ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں کبھی پرانے نہیں ہوتے، ہمیشہ نئے ہی لگتے ہیں۔

☆ دعا کریں کہ اگر انسان کو موت آجائے تو حالت گناہ میں نہ آئے بلکہ حالت توبہ میں آئے۔

☆ مصیبت کی جزا انسان کی گفتگو ہے۔

☆ تعجب ہے انسان توبہ کے ہوتے بھی مایوس ہوتا ہے۔

☆ عقل مند دشمن سے مشورہ کرو اور جاہل کی رائے سے بچو۔

☆ کوئی شیشہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر پیش نہیں کر سکتا جتنی اس کی گفتگو۔

☆ کسی کو اتنا دکھ مت دو کہ اسے جینے سے نفرت ہو جائے۔

☆ کسی کو خوش دیکھ کر مسکرایا بھی صدقہ ہے۔

☆ نرمی جس چیز میں ہوتی ہے اسے سنوار دیتی ہے اور سختی ہر چیز کو بگاڑ دیتی ہے۔

☆ تم اللہ کے گھر کو اپنی عبادت سے آباد رکھو وہ تمہارے گھر کو رحمتوں سے آباد رکھے گا۔

☆ کسی کا دل توڑ کر معافی مانگنا بہت آسان ہے لیکن اپنا دل ٹوٹ جائے تو کسی کو معاف کرنا بہت مشکل ہے۔

☆ ہر چھوڑ کر جانے والے شخص بے وفا نہیں ہوتا اسی طرح ہر ساتھ رہنے والا آپ کا اپنا

ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور وہ ہیرا ہو تو چمک دکھ جاتا ہے۔ یہ کلی طور پر انسان کی پوینشل پاور پر منحصر ہے کہ عشق اسے کیا عطا کرتا ہے۔ عشق کچھ لوگوں کے لیے صرف ہجر ہے اور کچھ کے لیے ہجر بھی وصل ہے۔ (بانو قدسیہ)

امبرین حیدر۔ اسلام آباد

اس ماہ بیٹیوں کے لیے

☆ جو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔

☆ جو ماں باپ کے لیے بخشش کا پیغام لاتی ہیں۔

☆ جو پھول کی پتیوں کی طرح نازک اور شبنم کی طرح پاکیزہ ہوتی ہیں۔

☆ جو بڑی حساس اور انتہائی نازک دل کی ہوتی ہیں۔

☆ ان کی کلیوں کی قدر و قیمت وہی لوگ جانتے ہیں جن کے آئینے میں یہ مہکتی ہیں۔

☆ پھولوں کی طرح مہکتی اور دلوں کی ٹھنڈک ہوتی ہیں۔

☆ باپ کا نخر اور ماں کی ساتھی ہوتی ہیں۔
حنا علی۔ ملتان

اس ماہ کی نظم

جتنی دعائیں آتی تھیں

سب مانگ لیں ہم نے

جتنے وظیفے یاد تھے سارے

کر بیٹھے ہیں

ہی سرح سے جی دیکھا ہے

کی لڑن۔۔۔ یہ بیٹھے ہیں

لیکن جاناں!

کسی بھی صورت

مسائل، مشکلات اور ناامیدی انہیں بزدل بنا دیتی ہے اور ان کا آگے بڑھنے کا حوصلہ دم توڑ دیتا ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ جی یہ لوگ زندگی کے سفر میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور تمام عمر تک یادوں کے سوا ان کے دامن میں کوئی شے باقی نہیں بچتی۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

شاملہ ملک۔ کراچی

اس ماہ کی غزل

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سجالے مجھ کو
میں ہوں تیرا نصیب اپنا بنا لے مجھ کو
میں جو کاٹا ہوں چل مجھ سے بچا کر دامن
میں ہوں گر پھول تو جوڑے میں سجالے مجھ کو
مجھ سے پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ تیری سادہ ولی مار نہ ڈالے مجھ کو
میں کھلے در کے کسی گھر کا ہوں ساماں پیارے
تو دبے بناؤں کبھی آکر چرالے مجھ کو
کل کی بات اور ہے میں اب سا رہوں یا نہ رہوں
جتنا جی چاہے ترا، آج سستا لے مجھ کو
بادہ پھر بادہ سے میں زہر بھی پی جاؤں قاتل
شرط یہ ہے کہ کوئی بانہوں میں سنھالے مجھ کو
(قتیل شفائی)

انتخاب: ریمیا نور رضوان۔ کراچی

اس ماہ کا فلسفہ

اعتماد اور سفر!

زندگی کا سفر ہر انسان کا کٹ ہی جاتا ہے مگر
بعض لوگوں کے لیے یہ سفر آسان اور بیشتر کے
لیے بہت تکلیف دہ سمجھنا اور دشوار ہوتا ہے۔ جن
لوگوں کا سفر مسائل میں گھرا ہوتا ہے، ان میں دو
طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جواں
ہمت، بلند حوصلہ اور جدوجہد پر یقین رکھنے والے
ہوتے ہیں، انہیں خود پر مکمل اعتماد ہوتا ہے یعنی
مسائل سے گھبرانا نہیں آتا۔ دوسری قسم کے لوگوں
میں حوصلے کی تو نہیں البتہ اعتماد کی کمی ہوتی ہے جو
انہیں مزید مشکلات کا شکار کر دیتی ہے۔ یہ درپہ

اس ماہ کی نمکین غزل

روشنی کی سے سزا بجلی کا بل
یا مقدر کا ٹکھا بجلی کا بل
تو جو چکرا کر گرے تو خیر ہے
پر محبت سے اٹھا بجلی کا بل
وقت سے پہلے ہی قربانی ہوئی
اپنے بکرے پر گرا بجلی کا بل
اڑ گئے ہاتھوں کے طوطے دفعتاً
جو بجلی ہاتھوں میں لیا بجلی کا بل
ڈس کنکشن کا بھی نوٹس ساتھ ہے
کس قدر ہے بے وفا بجلی کا بل
خون دشمن کا نہ لے تو اپنے سر
بس اسے جا کر دکھا بجلی کا بل
تھا مریض دل بے چارا چل بسا
دیکھتا ہی رہ گیا بجلی کا بل
کی شکایت میں نے بجلی کی مجھے
دیکھتے ہی جل گیا بجلی کا بل
روشنی کو لوگ ترسیں گے یہاں
اب اندھیرے لائے گا بجلی کا بل
جاں کے لالے پڑ گئے تہذیب خاں
اس قدر چنگا پڑا بجلی کا بل

شاعر: راؤ تہذیب حسین تہذیب

انتخاب: سبائل گل۔ رحیم یار خان

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

حجرت

☆ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا نام شموود تھا۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن پاک کی 25 سورتوں میں ہے۔

☆ حضرت یعقوب علیہ السلام کے والد کا نام حضرت اسحاق علیہ السلام تھا۔

☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت اور لیس علیہ السلام کے درمیان ملاقات شب معراج میں چوتھے آسمان پر ہوئی۔

روشنی فیصلہ کراچی

اقوال زریں

﴿ گفتگو میں اختصار سے کام لو طویل کلامی ذہنوں کو ضائع کر دیتی ہے۔ ﴾ (حضرت ابو بکر صدیق)

﴿ مومن کے لیے اتنا علم کافی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔ ﴾ (ابو بکر صدیق)

﴿ عقل مند کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا جب کہ بے وقوف کہتا ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ﴾ (حضرت عثمان غنی)

﴿ تمام خوبیوں کا مجموعہ علم سیکھنا، اس پر عمل کرنا اور اسے دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ﴾ (حضرت علی)

﴿ اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کو کم رکھو گے تو

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

”دنیا کی لذتوں کو ختم کرنے والی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔“ (صحیح بخاری)

”احادیث نبوی کے مطابق دعا کی قبولیت کے پانچ اوقات ہیں۔ (1) فرض نماز کے بعد (2) اذان اور اقامت کے درمیان (3) تہجد کے وقت (4) بارش برستے وقت (5) سفر میں۔“ (صحیح بخاری)

سیدہ نورین۔ کراچی

انبیاء کرام کے بارے میں متفرق معلومات

☆ پیغمبروں میں سب سے طویل عمر پانے والے پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام تھے۔

☆ سب سے زیادہ اولیاں جانتے والے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام تھے۔

☆ جد انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب ہے۔

☆ قوم عاد کا سب سے ٹھکانا انسان 60 گز کا تھا۔

☆ حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر قرآن پاک میں 25 جگہ 9 سورتوں میں آیا ہے۔

☆ حضرت آدم علیہ السلام نے 936 سال عمر پائی۔

کنجوس

ایک انتہائی کنجوس شخص کے دانت میں درد ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر نے دانت کا معائنہ کیا اور کہا۔ ”جناب یہ دانت تو آپ کو نکلوانا پڑے گا۔“
کنجوس شخص نے پوچھا۔ ”اس کی کتنی فیس ہو گی؟“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”دو سو روپے۔“
کنجوس شخص نے اطمینان سے پچاس روپے ڈاکٹر کے ہاتھ پر رکھے اور بولا۔ ”آپ میرا دانت صرف ڈھیلا کر دیں میں گھر جا کر خود اسے نکال لوں گا۔“

رابعہ منیر۔ سرگودھا

پچھ دودھ والے سے۔ ایک کلو بھینس کا دودھ دے دو۔“

دودھ والا۔ ”تمہارا برتن چھوٹا ہے۔“
پچھ معصومیت سے بولا۔ ”تو پھر بکر کی کا دودھ دے دو۔“
اریشہ۔ کمالیہ

ہیرے اور سونے میں فرق
☆ حضرت شیخ سعدی سے کسی نے دوست اور بھائی کے بارے میں دریافت کیا۔ شیخ سعدی فرمانے لگے۔
”دوست ہیرے کی مانند اور بھائی سونے کی مانند ہے۔“

وہ شخص بہت حیران ہوا اور کہنے لگا۔
”حضرت بھائی جو حقیقی اور سگا رشتہ ہے اسے آپ کم قیمت چیز سونے سے منسوب کر رہے

راحت پاؤ گے۔ (حضرت اویس قرنی)

دل ایک آئینہ ہے اگر وہ بدی سے پاک ہے تو اس میں خدا بھی نظر آ سکتا ہے۔
(مولانا روم)
ہر مشکل انسان کا امتحان لینے آتی ہے۔
(افلاطون)

علم دل کو ایسے شاداب رکھتا ہے جیسے خشک زمین بارش کو۔ (حکیم لقمان)
آرام و آسائش راحت و سکون جنت الفردوس میں ہے۔ لوگ اسے فانی دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔ (شیخ سعدی)

برائے ہونا بھی نیکی ہے۔ (ابن جوزی)
بڑگمانی کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دو ورنہ دنیا میں کوئی ہمدرد اور دوست نہ ملے گا۔
(حضرت لقمان)

ایک بزرگ

ایک بزرگ نے 50 سال کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان میں سے صرف 4 سنہری باتیں اپنے لیے منتخب کیں۔

- 1۔ اللہ کے دیئے ہوئے پر راضی ہو جاوے اور نہ کوئی اور مالک تلاش کر جو اس سے زیادہ دے۔
- 2۔ جن باتوں سے اللہ نے منع فرمایا ان سے رک جاوے اور نہ اس کی کائنات سے باہر چلا جا۔
- 3۔ اگر گناہ کرنا چاہتا ہے تو ایسی جگہ تلاش کر جہاں اللہ نہ دیکھ سکے ورنہ مت کر۔
- 4۔ اللہ کی عبادت کرو ورنہ اس کا دیا ہوا رزق بھی مت کھاؤ۔

نارنجی، فیروزی شعلوں کے رقص کا نام آگ ہے جو جلتی ہے، جلاتی ہے، جھلسا کر راکھ اور تپا کر کندن بناتی ہے۔

آگ..... اوزار بھی ہے اور ہتھیار بھی، اس سے آرام بھی ملتا ہے اور آزار بھی..... یہ روٹی پکائے، ہنڈیا سجائے۔ آگ نہ ہو تو سمجھو کچھ پک ہی نہ پائے۔

آگ گولوں میں سے آگ گونی میں ہے
چھوٹا ہو یا بڑا ہم کی جھولی میں ہے



سردی میں کردے گھر کو گرم
آگ آلو کردے خستہ نرم
آگ بھرے اگر تو لگائے زخم
آگ چھوٹا نہیں وہ کرے نہ گرم



آگ جھل میں لگے تو چھپانا مشکل
آگ سن میں لگے تو بھجانا مشکل

ایس ایم ایز احمد - کراچی

بہترین دوا

حکیم لقمان کا کہنا ہے۔ ”میں نے زندگی میں مختلف دواؤں سے لوگوں کا مکمل علاج کیا مگر اس طویل تجربے کے بعد میں نے سیکھا کہ انسان کے لیے سب سے بہترین دوا محبت اور عزت ہے۔

کسی نے پوچھا۔ ”اگر یہ اثر نہ کرے؟“
وہ مسکرائے اور بولے۔ ”دوا کی مقدار بڑھا دو۔“

دھنک ناز - کراچی

ہیں اس میں کیا حکمت ہے؟

شیخ سعدی نے فرمایا۔ ”سونا اگر چہ کم قیمت ہے لیکن اگر ٹوٹ جائے تو اسے پگھلا کر اصل شکل دی جاسکتی ہے بھائیوں میں اگر کوئی وقتی چپقلش ہو جائے تو وہ دور ہو جاتی ہے لیکن اگر دوستی کے رشتے میں کوئی دراڑ آجائے تو اسے دور نہیں کیا جاسکتا۔“

وہ شخص شیخ سعدی کے حکمت سے بھرپور جواب سن کر سحر زدہ ہو گیا۔

صباحر - ہارون آباد

اقوال کنجاں

- 1۔ روزی کی فکر میں دن اور تارینیں یا نہیں رہتی۔
- 2۔ بلدیہ کے ملازم نالیاں صاف کرتے ہیں۔ گلیاں گندی کر دیتے ہیں۔
- 3۔ انسان کی غرضیات اسے پیشہ ور بنا دیتی ہیں۔
- 4۔ مجھے سب سے زیادہ عینشن اس وقت ہوتی ہے جب میرے پاس لکھنے کے لیے پینسل نہیں ہوتی۔
- 5۔ کھیتوں کو سراب رکھو آندھی سے اڑنے والی مٹی سے محفوظ رہو گے۔

- 6۔ جب انسانوں کی تعداد زیادہ اور مکانات کی تعداد کم پڑ جائے تو درندگی پیدا ہوتی ہے۔
- 7۔ بلاشبہ قبرستان ایسے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جو نیہ سمجھتے ہیں کہ بوڑھے ہونے پر اپنی زندگی اسلام کے لیے اور اسلام کے مطابق ڈھال لیں گے لیکن افسوس کہ وہ اس عمر تک پہنچ ہی نہ پائے۔

اسلم سچال کی کتاب ”تخت تنہائی“ سے اقتباس

ایم جے قریشی - ڈی آئی خان

دردِ پیر کا کہنا

میں نے دیکھی تو نہیں کر بلا لیکن.....!

میں نے دیکھی تو نہیں کر بلا لیکن
اب بھی وہ شہرِ دھرمِ غمِ حسین میں روتے ہوں گے
ذریا اور کنارے گلے مل کر سوگ مناتے ہوں گے
ہو کر بے قرار شمسِ دُقر، منہ چھپائے روتے ہوں گے
میں نے دیکھی تو نہیں کر بلا لیکن
اب بھی اس شہر میں خدائے دفا کے
پرچم لہراتے ہوں گے

لہذا اگر حوصلے حسین والوں کے بڑھاتے ہوں گے
اور رازِ حسین کو زیارت یہ بلا تے ہوں گے
میں نے دیکھی تو نہیں کر بلا لیکن
اب بھی اس شہر میں جلے خیمے ہواں اٹھاتے ہوں گے
لٹی چادر دوں، کٹے سردوں کے غم
منائے جاتے ہوں گے

اور اشکوں کے نذرانے لائے جاتے ہوں گے
میں نے دیکھی تو نہیں کر بلا لیکن
اب بھی اس شہر میں جھولے اصغر کو بلا تے ہوں گے
غمِ اصغر میں ماؤں کے دل رلاتے ہوں گے
اور قبرِ اصغر پر پھول چڑھائے جاتے ہوں گے
میں نے دیکھی تو نہیں کر بلا لیکن

اب بھی اس شہر میں جب محرم آتے ہوں گے
گلشنِ زہرا کے اجرے پر غم منائے جاتے ہوں گے

اور سیدہ کو پر سے پہنچائے جاتے ہوں گے
میں نے دیکھی تو نہیں کر بلا لیکن
اب بھی اس شہر میں شبیر پکارے جاتے ہوں گے
صدقہ سیکڑہ خالی جھولیاں بھرتے جاتے ہوں گے
اور چہرہ زیدیت پر طمانچے لگاتے ہوں گے
میں نے دیکھی تو نہیں کر بلا لیکن
اب بھی اس شہر میں بھاگوں بلائے جاتے رہیں گے
قرعے ان کے ناموں کے نکالے جاتے ہوں گے
ہے یقین میرا کہ سید مجھے بھی بلا تے ہوں گے
نظیر فاطمہ

غزل

مہکتی فضاؤں نے رنگ بدل لیا ایسے
کون سا یہ دل سے گزر گیا ہو جیسے
گزر گیا یہ برس بھی اس طرح
بہت اچھا دوست بچھڑ گیا ہو جیسے
دسمبر کی تیخ بستہ اداس شامیں
خزاں آلودہ موسم ٹھہر گیا ہو جیسے
ہوا میں دیتی ہیں اسی کے سندیے
وہ شخصِ خوشبو کی طرح بکھر گیا ہو جیسے
عجب دشتیں پھیلی ہیں ارد گرد سحر
میری روح میں سنانا اتر گیا ہو جیسے

شہلا گل سحر صالح

آیا ہے بہت یاد جاوید پھر سے ان کا قسم
جب بھی بہت گہرے داغ زمانے سے ملے ہیں
محمد اسلم جاوید

غزل

مری لگن کے شجر پر ثمر نہیں آتا
میں لاکھ رستے بدلا ہوں گھر نہیں آتا
میں سانس لیتا ہوں دو مختلف زمانوں میں
اگرچہ ہوتا ہوں لیکن نظر نہیں آتا
اب اپنی آنکھیں مسافر کے ساتھ بھیجوں گا
مجھے تو اس، کوئی بھی سفر نہیں آتا
ارادے باندھ کے آیا ہوں ان ہی کہنے
یہ اور بات کہ عرض ہنر نہیں آتا
یہ پیار ہے کہ نظر کا حسین دھوکا ہے
تجھے تو تیرے سوا کچھ نظر نہیں آتا
تلاش کرتے ہو سایہ فضول امتیاز
دفا کے راستے میں کوئی شجر نہیں آتا
ایس امتیاز احمد

میرے دل کا قرار ہو تم
میری زندگی میرا سنسار ہو تم
من آنگن میں جو ٹھہر گئی
محبت کی وہ بہار ہو تم
تم سے ہی ہے میرے چہرے پر شوق
میرا سارا سنگھار ہو تم
دکھوں کی کڑی دھوپ میں
شجر سایہ دار ہو تم
مطلب کی اس دنیا میں
بس اک قابل اعتبار ہو تم
دل جس کے پیار کو تر سے
رب کا وہ شاہکار ہو تم
میری زیست کے افسانے کا
اک مرکزی کردار ہو تم
میرے دل کا قرار ہو تم
میری زندگی میرا پیار ہو تم

درخشاں ضیاء

غزل

محبت کرنے والے آپس میں روٹھتے ہیں
بھی مان جاتے ہیں
لیکن سنو! اے مری روح کے ہمسفر
جب محبت روٹھتی ہے تو.....
آپس میں صلح نہیں ہوتی
سمجھو تہ کرنا تو محبت کی عادت ہی نہیں
یہ یا تو جیت کر امر ہو جاتی ہے
یا..... ہار کے مرجالی ہے
درمیان کی راہ
اس کی روایت ہی نہیں

پیار میں جب کچھ لگ مسکرا کے ملے ہیں
تیری یادوں کے کیا کیا پھول کھلے ہیں
یہ انداز وفا کا یہ تیرے بدلے ہوئے تیور
کانٹوں سے بھی اے مہرباں کہیں زخم سلے ہیں
میرے لیے تو سب کچھ تیرے حسن کی دولت سہی
تجھ کو تو میری بے رخی کے پھر سے گلے ہیں
خاموشی احباب تمنا پہ نہ ہم کبھی مسکرائیں گے
دل میں تو بہت کچھ سہی مگر ہونٹ سیلے ہیں
سننے ہیں کہ اس بار بھی آئی تھیں بہاریں
تیرے گلشن میں اس بار بھی کچھ پھول کھلے ہیں

فرزانہ شوکت

غزل

کم پڑ گئی تھی رات بہت دور تک گئے
کہنی تھی دل کی بات بہت دور تک گئے
کل چودھویں کی رات تھی اور ہمسفر تھا وہ
اک دوسرے کے ساتھ بہت دور تک گئے
چھاؤں کی جب تلاش نے بے تاب کر دیا
سورج کے ساتھ ساتھ بہت دور تک گئے
اپنا سراغ مل نہ سکا عمر بھر کہیں
کھائی جب ہم نے مات بہت دور تک گئے
اس نازنین سا اور کوئی مل نہ سکا
اے حسن کائنات! بہت دور تک گئے
عشق و وفا کا راستہ کتنا طویل ہے
کم پڑ گئی حیات بہت دور تک گئے
تا عمر لب یہ لا نہ سکے ہم جسے حکیم
جب چھڑ گئی وہ بات بہت دور تک گئے
حکیم خان حکیم

دنیا

بات دنیا کی تجھ کو سنا تا ہوں میں
تجھ کو اس کی حقیقت بتاتا ہوں میں
بات عبرت کی غافلوں کے لیے
اک سبق اس میں ہے عاقلوں کے لیے
اس کا ہر دن لیے ہے سبق اک نیا
غافلوں کو حقیقت دکھاتا ہوا
ہے یہ ظاہر میں دنیا بڑی دل نشیں
اس کا باطن مگر خوب صورت نہیں
ہے حقیقت میں دنیا بڑی بے وفا
اس کی ہر رات ہر دن مصیبت بھرا
اس کا عاشق اسے چھوڑ سکتا نہیں
اس سے رشتہ کبھی توڑ سکتا نہیں

جو ذرا دل لگا یا تو پچھتا سکتے گا
جاں عبث اس کی خاطر تو تڑپائے گا
گر اٹھا دے تو اس پر دل و جان و تن
بد لے پھر بھی نہ اس کی دعا کا چلن
یہ ہوئی نہ کسی کی نہ ہوگی کبھی
لے کے ہاتھ اپنے خالی گئے ہیں سبھی
اس نے کتنے ہی زہد ہیں بہکا دیئے
کتنے نادان خون میں ہیں نہلا دیئے
مکرو فن میں کوئی اس کا ثانی نہیں
شکل اصلی بھی یہ دکھاتی نہیں
ایسے نادان فلک نے نہ دیکھے کہیں
جو یہ کہتے ہمیشہ رہیں گے یہیں
کتنے اس کی طلب میں ہوئے شرمسار
کہ حقیقت میں دنیا ہے ناپائیدار
کتنے آئے گئے خود اور خستیں
کیسے کیسے جواں کھا گئی یہ ز میں
چھوڑ اس کی ہوس دل نہ اس سے لگا
ساتھ دنیا کا ہتا نہیں سے سدا
زندگی امتحاں سے تاشا نہیں
جا کے دنیا سے پھر کوئی آتا نہیں
ہوش مند اس سے دھوکا ہیں کھاتے نہیں
عوض وہ عقبی کے دنیا بناتے نہیں
جس نے دنیا کی فطرت ہے پہچان لی
بات اس نے حقیقت کی ہے جان لی
رات دن بن کے رہتی ہے اس کی غلام
جس نے تقویٰ سے اپنے کیا اس کو رام
اس کے ظاہر کے منظر سے دھوکا نہ کھا
اس کے باطن کی دلدل سے خود کو بچا
گھات میں ہے اجل ہوش میں آذرا
فکر دنیا کو چھوڑ دل خدا سے لگا

تیرے لیے تو میری جان! جان حاضر ہے
میری وفا سے عبارت ہے زندگی میری
راؤ تہذیب حسین تہذیب

محبت کی تھی ہم نے

عجیب ہے زندگی کا سفر
ہر قدم یہ آبلہ پائی ہے
قدموں میں لرزش سہائی ہے
روح بے چین حال برا
زندگی کی دھول ہاتھوں سے اڑاتی ہے
چلتے رہے تنہا!
ملا تھا سفر میں ہمسفر سا کوئی
پر اکلادہ بھی ہر جانی ہے
اک عمر کی رفاقت تھی جس سے
اک پر سکون سی محبت تھی جس سے
اب اسی محبت سکون نے لی ودائی ہے
وہ ساتھ ہے اب بھی
پاس ہے اب بھی
پھر کیوں محسوس ہوتی تنہائی ہے
اپنا تو آغاز سے ہی انجام رہا
بس آس سی جھوٹی لگائی ہے
جب رخصت کیا اسے
لگا خود کو خود سے جدا کیا
محبت کی تھی ہم نے!
تو سزا بھی ہم ہی نے پائی ہے

یا سمین آفریدی

عمر غفلت میں اپنی گنوا نا نہیں
جا کے دنیا سے پھر تجھ کو آنا نہیں
خود کو دنیا کی دلدل سے آزاد کر
فکر عتشی سے دل کو تو آباد کر

دھول پاؤں کی تیرے یہ بن جائے گی
پیچھے پیچھے تیرے یہ چلی آئے گی
بات مطلب کی ہے جو تو سمجھے اگر
کاش کر جائے یہ تیرے دل پہ اثر
اک حقیقت عیاں کی ہے سب کے لیے
اک نصیحت بیاں کی ہے سب کے لیے
یہ نصیحت جو ہو تیرے دل کو قبول
میری کاوش کا بدلہ بھی ہو گا وصول

صابر حسین صابر

غزل

خاک میں مل گئی ہے خاک یہاں
محو حیرت ہے اب افلاک یہاں
ان کی نظریں اب اٹھ نہیں پاتیں
اُدچی رکھتے تھے جو اپنی ناک یہاں
بھیڑیے، ناک، سانپ کچھ بھی نہیں
جیسے انسان ہیں اسفاک یہاں
جھوٹ، رشوت، سفارش میں سب غرق ہیں
کس کا دامن رہا ہے پاک یہاں
حق سچ کے ترانے پڑھے جس نے گل
وہی پھرتا ہے گریباں چاک یہاں
سباس گل

صبح آزادی

میرے وطن تیری چاہت ہے زندگی میری
تیری زمین سے محبت ہے زندگی میری

سندھ

زبردست ہے۔ پہلی قسط پڑھی تو دل کیا آگے بھی پڑھنے کو مل جائے باقی آئندہ نہ لکھا ہو (ہا ہا ہا)۔ مکمل ناول میں ”ہمیں مارگئی تیری چاہ پیا“ فریدہ جی ناول بالکل اپنے نام کی طرح بہت خوب صورت ہے۔ ہر کردار بہت انٹرسٹنگ ہے۔ ایک قسط پڑھنے کے بعد اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ ”جگنوؤں کی تلاش میں“ سحر مبین زبردست بہت اچھا لکھا آپ نے۔ ناولٹ میں ”وفاؤں کے چراغ“ حصہ کنوں نے بہت خوب صورتی سے وفا کے چراغ جلانے تو ضروری سا ہے مجھ کو مصباح مسکان سچ ہے زندگی میں کچھ لوگوں کا ساتھ بہت ضروری ہوتا ہے۔ ہوس کا ناسور سلیمی غزل کے قلم نے بھی خوب جادو جگایا۔ اب باری آتی ہے افسانوں کی۔ ثناء کنول سرفیصد سچ کہا ہے آپ نے معاف کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ شیریں بلسم کی تحریر بھی اچھی تھی۔ ماہم علی کے انٹار مجت نے سچ میں دل گداز کر دیا شہلا گل سحر یہ سچ ہے نیت صاف تو منزل آسان ہوا کرتی ہے۔ ماریہ پارس عمیر بے شک اللہ بڑا غفور الرحیم ہے وہ اپنے بندوں کو بھی بے آسہ نہیں چھوڑتا۔ ملکہ جعفری نے بھی اچھا لکھا۔ زاہدہ ہاشمی کی تحریر بھی اچھی تھی۔ ماریہ یاسر نے بھی بہت خوب لکھا۔ ”تم میرا مان ہو“ ماورا بشارت کی تحریر بھی اچھی تھی۔ ملوک سحرش فاطمہ نے بھی اچھا لکھا۔ ”ردا کی ڈائری“ سے شہلا گل سحر کا کلام بہت پسند آیا۔ اشعار سب ہی میسٹ تھے۔ اس ماہ میں

رابعہ افضل خان — کراچی
ڈھیر ساری دعاؤں، نیک تمناؤں اور محبت کی خوشبو سے مہکتا سلام الفت۔ پیاری صالحہ آپی، نورین ملک اینڈ ردا اسٹاف، رائٹرز و قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ قبول کیجیے۔ میری تمام ردا سے جڑی پیاری ہی دوستوں کو عید قرباں بہت بہت مبارک ہو۔ پچھلے ماہ کچھ پرسنل پر اہم کی وجہ سے ردا میں شرکت نہ کر سکی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ صالحہ آپی آپ کا انٹرویو پڑھ کر ایسا لگا جیسے آپ سامنے بیٹھ کر بات کر رہی ہوں۔ آپ کا انٹرویو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اب آتے ہیں ردا کی طرف فرنٹ پیج پر نائٹیل گراں کے روپ میں صائمہ انصار کی مہندی اور چوڑیوں سے بے ہاتھ نے توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ آگے بڑھے تو صدف سعد کے گھریلو ٹوکے سچ میں بہت انٹرسٹنگ تھے۔ ”گوشہ آگہی“ کا ہر لفظ ہمیشہ کی طرح دل میں خوشبو کی طرح اتر گیا۔ ”ردائے جنت“ بھی ہر بار کی طرح بہت اچھا لگا۔ زاہد احمد کا انٹرویو بہت دلچسپ تھا۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ شازیہ جی اس بار بھی ردا سے غیر حاضر تھیں۔ دل اداس ہو گیا۔ شازیہ جی ہم اللہ تعالیٰ سے آپ کی جلد صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد صحت یاب کرے، آمین۔ قمرش شہک کے سلسلے وار ناول کی پہلی قسط ردا کی فہرست میں دیکھ کر دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔ قمرش جی آپ کے ناول کی شروعات ہی بہت

بہت اچھی شروعات کے ساتھ آپ کا ناول نظروں سے گزرا۔ شروعات سے جاندار اور آگے یقیناً شاندار ہوگا۔ وہ تو شروعات اور یونیک ناموں سے ہی ظاہر ہو رہا ہے۔ ماہ اگست میں شامل کبھی افسانے خاص و عام ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ خاص طور پر صالحہ ایسا کی تحریر ہو اور قابل تعریف نہ ہو بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ شاہ کنول ردا میں شامل ہو اور افشاں کے قلم پر شاہ کا نام نہ آئے بھلا یہ کیسے ممکن ہے پیاری سی شہلا گل ہمارے سنگ عید منائیں اور ہم اپنے لفظوں کے سنگ محبت کے رنگ ان کے آس پاس نہ بکھرائیں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے ماضی و حال کو بیان کرتا ایقان کا قلم ہو اور ہم تعریف کے الفاظ نہ لکھیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ سحر مبین کا افسانہ مسکراہٹ کھیر گیا۔ جو یہ بانو نے بہت تلخ حقیقت بیان کی ماہ اگست میں شامل دونوں ناول ہی بہت زبردست تھے۔ جب کہ دونوں مکمل ناول بھی بہت عمدہ تھے۔ ریحانہ آفتاب کی آمد خوش دے گئی اور ان کی تحریر دل خوش کر گئی۔ عائشہ ذوالفقار کا خوب صورت سا ناول بالآخر ہمیں ادا اس کرتا اختتام پذیر ہوا نہ جانے کیوں ہر کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ ”سندیسے“ میں درخشاں ضیاء، رابعہ افضال، گیتی آراء، عائشہ نیازی، دھنگ ناز اور حنا علی نے رونق بخشی مجھے یاد رکھنے کے لیے بے حد شکریہ۔

ثوبیہ جواد۔۔۔ گجرات

میری طرف سے پیاری صالحہ آپی اور اشاف ردا کو پیارا پیارا اور پیار چاہت محبت بھرا سلام۔ ماہ ستمبر کا ردا ڈائجسٹ 5 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے صالحہ آپی سے ملاقات کی تو قسم سے اسی ٹائم بارش شروع ہو گئی اور موسم اے ون ہو گیا اور سب سے زیادہ مزے کی بات بجلی ہمیں گئی۔ ”ردائے جنت“ ہمیشہ کی طرح دل میں ایمان کی شمعیں روشن کر گیا۔ زاہر احمد سے ملاقات اچھی لگی۔

شکریہ۔ ”سندیسے“ میں فریدہ فرید، گیتی آراء، شہلا گل سحر، چھا گئیں۔ پیاری سی صالحہ دعاؤں کے لیے شکریہ۔ ارے ہاں مجھے ایقان علی کی ”اسیر“ بہت پسند آئی تھی۔ اسے میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ اس یار پورا ردا خوب صورت تھا تو سوچا تبصرہ نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ ردا دن چوگنی تر تری کرے۔“

افشاں علی۔۔۔ گجرات

ہر دل عزیز سی صالحہ ایسا، پیاری سی نورین ملک اور ہماری تمام پیاری پیاری سی رائز، قارمین بہنوں کو افشاں علی کا جھلملانا شوخیوں سے سجا اپنائیت سے بھرا سلام عرض ہے۔ امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ردا کے ساتھ دل کا ہی نہیں دھڑکنوں کا بھی رشتہ جڑ چکا ہے ایک ماہ بھی غیر حاضر ہو جاؤں یا خط نہ لکھ سکوں تو ایک بے نام سی چینی رگ و جاں میں دوڑتی ہی رہتی ہے۔ انگلیاں قلم کو تھامنے کو اور الفاظ قلم سے نکلنے کو بے تاب سے نظر آتے ہیں۔ اتنا خاص و گہرا سا رشتہ بن چکا ہے جتنا سروں کا ساز سے شاعر کا شاعری سے لکھاری کا قلم سے ہوتا ہے۔ کچھ ایسے ہی جڑے ہیں افشاں و ردا اور اس کے لیے تہہ دل سے میں صالحہ ایسا اور اپنی پیاری قارمین بہنوں کی مشکور ہوں۔ آپ سب کی ہمت حوصلے اور محبتوں کے آگے شکریہ لفظ بھی بہت چھوٹا سا لگتا ہے۔ جناب محبتوں کے ہمراہ آگے بڑھتے ہیں پہلے بات ہو جائے خوب صورت ٹائٹل سے سچے جشن آزادی و سالگرہ نمبر کی ٹائٹل بہت ہی خوب صورت و دل موہ لینے والا تھا۔ صالحہ ایسا کے بارے میں جان کر ایک ایک لفظ محبتوں سے بھرا پڑھ کر اچھا لگا جسے ہم چاہتے ہیں اپنا مانتے ہیں ان کے بارے میں جانتا خوشی دیتا ہے۔ پیاری فریدہ فرید ہمیں ”مارگنی تیری چاہ جیا“ خوب صورت سے ٹائٹل کے ہمراہ

بشارت اور سحرش فاطمہ سب نے قلم کے ساتھ انصاف کیا۔ ”ردا کی ڈاڑھی“ میں سب نے اچھا لکھا۔ ”خوشبو“ اور ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سب کی کاوشیں زبردست تھیں۔ ”دوستوں کے نام پیغام“ فریدہ جی کی کم شیر خور سے کے لیے کوہاٹ آنا پڑے گا۔ صبا سحر ڈیز ہینکس۔ آپ بھی میری دعاؤں میں ہیں۔ ”سندیے“ سب کے اچھے تھے۔ کیتی جی آپ میرے دل میں ہیں سوری افسانے میں تذکرہ نہ ہو سکا۔ فریدہ، درخشاں، ثوبیہ ملک اور کیتی آراء کا تبصرہ زبردست تھا۔

گیتی آراء

پیاری آبی اور نورین السلام علیکم! مزان بخیر۔ سب سے پہلے تو آپ کو، نورین کو اور ردا کے تمام قارئین، رائٹرز کو عید کی دلی مبارکباد! اللہ ہم کو آپ کو سب کو ایسی ہزاروں عیدیں خوشیاں دیکھنا نصیب کرے، آمین۔ 6 ستمبر کو ردا ملا۔ دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ سب سے پہلے ”گوشہ آگہی“ اور ”ردائے جنت“ کی دینی اور خوب صورت باتوں سے مستفید ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ اپنے من پسند آرٹسٹ اداکار زاہد احمد کی سچی اور کھری باتیں دل کو بھانگیں۔ آگے چل کر قمروش شہک کا ناول ”صحرائوں کی گلیوں میں عشق“ کی پہلی قسط پڑھنے کو ملی تو اگلی قسط کے لیے تجسس اور بڑھ گیا۔ روشانی کی ”دیدہ عبرت نگاہ“ بھی خاصی دلچسپی رہی۔ حصہ کنول کا ناول ”دفاؤں کے چراغ“ میں رباب کا زریاب کو چھوڑ کر دیور سے ملاپ کچھ عجیب سا لگا۔ ثناء کنول کی ”محبت، قربانی اور یہ عید“ کا منفرد انجام اچھا لگا۔ ”بدلے نظارے“ اپنے اندر مزاح کا رنگ لیے ہلکی پھلکی دلچسپ تحریر تھی۔ ماہم علی کی ”ایثار محبت“ ایثار اور اپنے سوہنے رب سے پیار کرنے والوں پر لکھی گئی۔ عید قربان، عید ایثار، قربانی و ایثار کی اعلیٰ تحریریں تھیں۔

سلسلے وار ناول میں ”دیدہ عبرت نگاہ“ روشانی نے عبدالقیوم بہت پسند ہے۔ مکمل ناول دونوں ہی بہت پسند آئے۔ ناولٹ میں ”ہوس کا ناسور“ بہت پسند آیا۔ باقی بھی اچھے تھے۔ افسانوں میں ”محبت، قربانی اور عید“ ثناء کنول۔ ”ایثار محبت“ ماہم علی بہت پسند آئے۔ باقی بھی خوب تھے۔ اب تشریف کا ٹوکرا لاتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف۔ ”ردا کی ڈاڑھی میں ریمانور رضوان آف دی منتھ رہیں۔ ”اشعار“ میں نگہت توقیر۔ آف دی منتھ رہیں۔ ”اس ماہ میں“ عانیہ نیازی۔ آف دی منتھ رہیں۔ ”خوشبو“ میں ملک جو اونواز نمبرون رہے۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ ریاض حسین قمر پہلے نمبر پر رہے۔ ”سندیے“ سبھی اے ون تھے۔ ”دوستوں کے نام پیغام“ میں اسماء جمشید بازی لے گئیں۔ ”کچن“ تو پھر کچن ہی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اب مجھے اجازت دیجیے کیونکہ بارش ٹورک گئی ساتھ بجلی کو بھی لے گئی۔ اگلے ماہ پھر اسی طرح ملاقات ہوگی۔ ماہ اکتوبر تک کے لیے اجازت رب رکھا۔

شہلا گل سحر۔۔۔ کوہاٹ

ڈیز آبی، نورین جی اور قارئین ردا کو محبت بھرا سلام اور دعا میں۔ ماہ ستمبر کا چمکتا، مہکتا و لفریب سرورق کے ساتھ ردا ملا۔ صالحہ آبی سے ”گوشہ آگہی“ میں ملاقات کی، ان کی باتوں سے استفادہ کرنے کے بعد فہرست پر نظر ڈالی۔ اپنا افسانہ دیکھ کے دل خوش ہوا۔ قمروش کا نیا ناول ویلڈن، فریدہ ناول میں عناس اور زین کا کردار دل کو پھار رہا ہے۔ روشانی بھی نئے نئے ناول کے ساتھ حاضر تھی۔ سحر مبین کا ناول اچھا لگا۔ ناولٹ تینوں اچھے تھے۔ مصباح کا مخصوص شرارتی انداز شروع سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ افسانوں میں ثناء کنول نے اچھا لکھا۔ تیسریں تبسم کا شرارتی انداز اچھا لگا۔ ماہم علی، مہرین کنول، ماریہ پارس، ملکہ جعفری، زاہد ہاشمی، ماریہ یاسر، ناورا

عائشہ الیاس — کراچی

ڈیرِ صالحہ آپ، نورین ملک اور میری ردا کی تمام ہی پیاری سہیلیوں کو سلام۔ امید کرتی ہوں سب ہی خیریت سے ہوں گی۔ ردا میں کافی وقت بعد خط لکھ رہی ہوں۔ وجہ وہی زندگی کی گنگلک مصروفیات لیکن ان مصروفیات میں کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ ردا سے کبھی تعلق ٹوٹا ہو اور نہ ٹوٹے گا۔ کتنا وقت گزر گیا اور کتنی ہی نئی رائٹرز کاردا میں تعارف ہوا اور سب ہی اپنے بہترین فرائض انجام دے رہی ہیں۔ آپ کی معذرت کے ساتھ میں ردا میں ہر ماہ خط تو نہیں لکھ پاتی لیکن ہر تحریر کو بغور پڑھتی ضرور ہوں۔ سندیے کی بھی محفل ہمیشہ کی طرح لا جواب تھی۔ فریڈہ فریڈہ کا مکمل ناول ابھی تک پڑھا نہیں پہلے سب اقساط جمع کروں گی، پھر پڑھوں گی البتہ فریڈہ آپ کا بہت شکریہ آپ کو میرا ناول "پائل" پسند آیا، یقین چاہیے آپ کی تعریف میرے لیے بہت بڑا اعزاز رکھتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میری باقی بہنیں برا منائیں۔ آپ سب کا بھی شکریہ۔ شاء کنول، ایقان علی اور باقی سب بھی جنہوں نے عید کے موقع پر بھی یاد رکھا۔ بس سب میں مجھے اپنا آپ سب لگتا ہے جو کبھی بھی بروقت شرکت نہیں کرتی لیکن آپ سب کو پڑھتی تو ہوں۔ یاد بھی رکھتی ہوں، میرے خیال میں یہ بھی ایک اچھی بات ہے۔ آپ کی ردا کی محنت ہرگزرتے دن کے ساتھ نظر آتی ہے۔ خدا سے دعا ہے جس مقصد کے لیے آپ نے اس کا آغاز کیا ہے وہ کامیاب ہو اور یونہی ترقی کرے۔ بس مجھے تو ان لوگوں پر دکھ ہوتا ہے جو علم حاصل تو کرتے ہیں پر اس پر عمل کرنا نہیں جانتے۔ اجازت چاہوں گی آپ کی اپنا بہت خیال رکھیے گا اور میری باقی قاری بہنیں بھی جو کوئی اگر مشکل کا شکار ہیں تو خدا سب کی مشکلات کو آسان بنائے۔ ☆☆

ملکہ جعفری کا "اعتزاز زندگی" میں عربیت کی عکاسی اور تصویر خوب کھینچی گئی۔ زاہدہ ہاشمی کی "فرق" ایک سبق آموز تحریر تھی۔ ماریہ یاسر کا "محبت ہمارے جیتی" دلچسپ رہا۔ ماورا بشارت "تم میرا مان ہو" کا انداز اور طرز تحریر متاثر کر گیا۔ "ملوک" سحرش فاطمہ کی موجودہ حالات پر لکھی تحریر بہت سے لوگوں کو دکھی کر گئی۔ روشنائی کی "دیدہ عبرت نگاہ" کی پہلی قسط اچھی رہی۔ خاص کر اکبر جنگجو کا کردار کہانی کی جان رہا۔ "ردا کی ڈائری" کے سبھی انتخاب اچھے رہے خاص کر ثناء کنول کا انتخاب لا جواب تھا۔ "اس ماہ میں" ہمیشہ کی طرح لا جواب رہا۔ ہر کالم اور مضمون اپنی مثال آپ رہا۔ "خوشبو" میں القرآن ہمیشہ کی طرح لا جواب رہا۔ ملک جواد کا عوام زبردست تحریر تھی۔ "ذرا پھر سے کہنا" میں سبھی بہن بھائیوں نے اچھا لکھا۔ "سندیے" ردا کی جان پڑھ کر مزہ آیا۔ فریڈہ فریڈہ ایسی عزت افزاں پر ہم آپ کے مشکور ہیں۔ شہلا گل سحر ہماری تحریر کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

زاہدہ ہاشمی زاہسی — کراچی

ڈیرِ صالحہ آپ! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیریت خوش باش ہوں گی۔ ستمبر کا ردا میرے ہاتھ میں ہے اور ہمیشہ کی طرح ردا کے لیے دعا میں میرے لبوں پر۔ ٹائٹل بہت خوب صورت اور اشاکل بھی۔ تمام افسانے، ناولٹ اور مکمل ناول اپنی خوب صورتی اور دلچسپ تحریروں کے ساتھ سبق دیتے ہوئے نظر آئے۔ اپنا افسانہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ٹیکس آپ کی ہی حوصلہ افزائی نئے لکھنے والوں پر رہتی ہے۔ والوں کے لیے مشعل راہ بنتی ہے۔ باقی تمام سلسلے بھی زبردست ہیں۔ میری طرف سے تمام ردا اشاف، قارئین اور رائٹرز کو دل کی گہرائیوں سے عید مبارک اور سوئیٹ سی پیاری سی صالحہ آپ کی کو خاص طور پر دعاؤں کے ساتھ عید مبارک

دوستوں کے نامے دیجئے

اپنی زندگیوں کے نام

السلام علیکم! سب کو محبت بھرا سلام عشق قبول ہو۔ تو لیجئے جس نے بھی ہمیں یاد کیا ہم آگئے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے آنکھوں میں آپ سب کو بسائے۔ آپ نے میری کمی محسوس کی تو ہم چلے آئے۔ لفظوں نے دماغ میں اودھم مچا رکھا ہے کیا کیا نہ سوچا تھا کہ لکھوں گی اور اب جب لکھنے بیٹھی ہوں تو الفاظ کہیں کھو سے گئے ہیں کسی ناراض محبوبہ کی طرح ناز نخرے کرتے مجھ سے دور جا رہے ہیں۔ باری باری پکڑ لائی ہوں، پیاری ہی زندگی سے بھر پور افشاں علی تمہاری دعاؤں کے بدلے کیا کہوں کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ مجھے تو اپنا آپ کیچڑ میں کھلا ہوا گلاب جیسا لگتا ہے جسے پسند کرتے ہیں مگر آگے بڑھ کر کوئی بھی اسے اس کیچڑ سے نکالنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اتنی دعاؤں کے لیے تھینک یوسوچ اور صاء عبدالغنی بالکل دعاؤں جیسی معصوم سی لڑکی خدا تمہیں ہمیشہ آباد رکھے۔ سنو اگر تم میرے لیے ایسے ہی دعا کرتی رہی ناں تو کبھی کوئی بھی دکھ مجھے چھو کر نہیں گزرے گا۔ سچ میں اگر میں کچھ کہوں تو مانو گی اگر ہاں تو پلیز میرے لیے کوئی اچھی سی دعائیں کی تنہائی میں ضرور کرنا تب جب اللہ پاک ساتویں آسمان پر موجود ہوتا ہے۔ تب تم دعا کرنا: دیکھنا تمہاری وہ

دعا میری قسمت بدل دے گی کچھ بھی مانگنا ضرور اس رب سے صرف میرے لیے (مانگو گی نا) اور سو سو سو تمہاری میں نے سالگرہ دش نہیں کی۔ بٹ لیٹ ہی سہی پپی برتھ ڈے ٹو یوسوچ خوش رہو، ہنستی مسکراتی بالکل جھکتے چاند کی طرح روشنی بکھیرتی رہو، آئی لو یوسوچ بالکل اصلی والی محبت ہو گئی ہے تم سے۔ رابعہ افضل خان میری جان اتنی دعاؤں کے لیے کیا کہوں بس حیران سی بیٹھی میں نہ جانے کتنی دیر شیشے میں اپنی شکل دیکھتی رہی۔ کیا شاء کتول اللہ دتہ اس قابل ہے کہ کوئی اس کے لیے دعا کرے تھینک یوسوچ اور عید الاضحیٰ لیٹ ہی سہی تمہیں بھی مبارک ہو بہت۔ گیتی آراء، درخشاں ضیاء، ثوبیہ ملک، اسویرہ علی، فریڈہ فرید سب کو لیٹ ہی سہی عید الاضحیٰ مبارک ہو۔ میری تو وہی والی بات ہو گئی ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میرا بھی وہی حال ہے آپ سب کے لیے ایک اظہار محبت

آنکھوں میں رہنے والوں کو ہم یاد نہیں کرتے دل میں رہنے والوں کی بات نہیں کرتے آپ سب میری روح میں بس گئے ہو اب تبھی تو ہم ملنے کی فریاد نہیں کرتے اور ہاں ستمبر میں افشاں علی، سحر مبین آپ کی سسٹر صنم ناز کی عانیہ نیازی حافظہ مون شاہ بخاری چار ستمبر حیرا عروش میں سب کی برتھ ڈے تھی تو میری

تمہاری زیست کا ہر لمحہ مسکرائے
میرا رب صدائے پر خوشیوں کی بارش برسائے
رابعہ افضل خان۔ کراچی
آویز کے نام

کب کون کسی کا ہوتا ہے سب رشتے ناتے جھوٹے ہیں
سب دل رکھنے کی باتیں ہیں سب اصل روپ چھپاتے ہیں
اخلاص سے خالی لوگ یہاں لفظوں کے تیر جلاتے ہیں
ایک بار نگاہوں میں آکر ساری عمر راتے ہیں
آویز آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا
ہے آپ ٹھیک نہیں ہو۔ میری دلی آرزو ہے میری
محبت جہاں بھی ہے اس کو میرے دامن کی ہر
خوشی ملے۔ اس سال آپ پورے 25 سال کے
ہو گئے ہیں۔ میری دعا ہے آپ خوش باش اپنی
زندگی میں رہیں۔ کھڑوس کیسے ہو!!

ہاتھ اٹھاؤں اور تیرا نام نہ لوں
جان کفر دس چاہت
آپ تو میری دعاؤں میں شامل ہو
آمین کی طرح

سمیرا گل ناز یوسف۔ کراچی
توقیر کے نام

چوم لیتی ہیں لٹک کر کبھی چہرہ کبھی لب
تم نے زلفوں کو بہت سر پر چڑھا رکھا ہے
چشم سازی نے یہ کیا کھیل رچا رکھا ہے
کوئی زاہد کوئی میخاں بنا رکھا ہے
جو پھنسا پھر نہ اس نے کبھی ربائی مانگی
زلف تیری نے بھی عجب جال بچھا رکھا ہے
اب میں سمجھا تیرے رخسار پہ تل کا مطلب
دولتِ حسن یہ دربان بچھا رکھا ہے
دل یہ چاہے کہ تو کبھی بدنام نہ ہو
دیکھ تیرا ذکر ہے مگر نام چھپا رکھا ہے

طرف سے سب کو آپ کی سالگرہ بہت بہت
مبارک ہو۔ خدا آپ سب کی ہر آرزو کو پورا
کرے، ایسے کئی ہزار تمہارا آپ کے مقدر کر دے،
آمین ثم آمین۔ پیاری سی شہلا گل سحر میری تحریر کو
پسند کرنے کا شکریہ، کاش آسان ہوتا غموں کو
لفظوں میں اتارنا تو آج میں آزاد ہوتی۔ نظیر
فاطمہ میری اچھی سی دوست سدا مسکراتی رہو۔
پچھلی عید پر ”وہ اک کانچ سی لڑکی“ پسند کرنے کا
شکریہ۔ ریحانہ آفتاب و یلکم، رجانہ آفتاب بھی تھی
ناچلیز اسے بھی واپس لے آؤ نا آئی مس ہر عانیہ
نیازی میری دوست عائشہ الیاس میری بہن صبا
سحر میری جان تم تینوں کو سلام کہتی ہوں اور کیا
ہو رہا ہے مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

لٹل برادر عاصم خان کے نام

میرے لٹل سویٹ اینڈ کیوٹ سے بھائی
عاصم خان کو میری طرف سے سالگرہ بہت بہت
مبارک۔ سالگرہ کے اس اہم دن پر میری طرف
سے ایک چھوٹی سی دعا۔

تمہارے جنم پر
بے ساختہ ایک دعا
میرے لبوں سے آزاد ہوئی
تم جو ہزاروں سال
سال کے دن ہوں پورے پچاس ہزار
تمہیں خوشیاں ملیں بے حساب
مسکرائیں دس تمہارے لبوں پر دستک
تمہارے بخت کا ستارہ ہر دم جھلملائے
تم ہر قدم پر کامیاب رہو
صدا آباد رہو شاد رہو
کوئی غم بھی تمہیں نہ ستائے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



عشق ہوا کہ حسن ہو دونوں کا اثر یکساں ہے
چیز ایک ہے مگر نام جدا رکھا ہے
تیری محسوس نگاہوں سے ہے رونق ساری
ورنہ ساقی تیرے میخانے میں کیا رکھا ہے
(ساغر صدیقی)

مریم توقیر۔ کھاریاں

ایم جے قریشی کے نام

مجھے محسوس ہوتا ہے وہ بالکل میرے جیسا ہے

کہ جیسے عکس پانی میں

یا سایہ رو برو میرے

وہی لہجہ وہی باتیں

وہی آنکھوں سے ہنس دینا

کبھی جو روٹھنا تو بے رخی کی حد پار کر جانا

کبھی آنکھوں کے رستے سے

کہیں دل میں اتر جانا

کبھی بے چین رکھنا خود کو

مجھ کو بھی سزا دینا

کبھی اک بل میں ہنس دینا

میری دنیا سجا دینا

کبھی تو برف سا لہجہ

نگاہیں بھی سر ڈکھ لینا

کبھی تنہی کے سارے رنگ

میرے دامن میں بھر دینا

مجھے اکثر یہ لگتا ہے وہ بالکل میرے جیسا ہے

(نوشی گیلانی)

ثوبیہ جواد۔ کھاریاں

دوستوں کے نام

124 اکتوبر کو میرے پیارے بھائی اور دوست

مرحوم حسنین شہزاد کی برسی ہے۔ تمام دوستوں

ساکھیوں سے درخواست ہے کہ اگر ہو سکے تو
میرے مرحوم پیارے بھائی کے لیے تین تین دفعہ
قل پڑھ کر بخش دیں۔ بے حد ممنون اور شکر گزار
رہوں گی۔ شکریہ!

گیتی آراء۔ کراچی

جزواں بھائیوں کے نام

27 نومبر کو میرے دو جزواں بھائی سید اور

ثقلین کی سالگرہ ہے۔ میری اور میرے سپینڈ کی

طرف سے تم دونوں کو سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ

تمہیں ہمیشہ خوش اور آباد رکھے۔ اللہ پاک تمہیں

بہت ترقی دے۔ آمین!

گیتی آراء۔ کراچی

امی جی، ابو جی اور پوری فیملی کے نام

پھر میری کمی ہوگی

گلشن کی بہاروں میں

رنگین نظاروں میں

جب تم مجھے ڈھونڈو گے

آنکھوں میں نمی ہوگی

محسوس تمہیں ہر دم

پھر میری کمی ہوگی

ساون کی گھاٹوں کا

جب شور سنو گے تم

بکھرے ہوئے ماضی کا

اوراق چھوؤ گے تم

ماحول کے چہرے پر

جب دھول چھی ہوگی

محسوس تمہیں ہر دم

پھر میری کمی ہوگی

ناہید حیدر۔ کراچی



گلاوٹ کی بیف بوٹی

چھڑکیں اور لیموں سے سجا کر پیش کریں۔

قیمے والے نوڈلز

اجزاء

نوڈلز (اُبلے ہوئے)	جزاء:	گائے کی بوٹیاں (بغیر ہڈی)	: آدھا کلو
دو پیالی		دہی (چھینٹی ہوئی)	: ایک پیالی
تین سوگرام	قیمہ	چار کھانے کے چمچے	
ایک کھانے کا چمچ	سپاہسن	ایک چائے کا چمچ	
آدھا چائے کا چمچ	کٹی ہوئی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ	
آدھی پیالی	بند کونجی (باریک کٹی ہوئی)	دو کھانے کے چمچے	
آدھی پیالی	فرنج بینز (باریک کٹے ہوئے)	دو کھانے کے چمچے	
آدھی پیالی	گاجر (باریک کٹی ہوئی)	تین کھانے کے چمچے	
چار عدد	ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)	حسب ذائقہ	
تین عدد	ہری پیاز (باریک کٹی ہوئی)	دو کھانے کے چمچے	
ایک کھانے کا چمچ	سویا ساس	آدھی پیالی	
تین کھانے کے چمچے	لال مرچوں کا پیسٹ	سجانے کے لئے	
ایک عدد	چکن کیوب	چھڑکنے کے لئے	
تین کھانے کے چمچے	شہد		
حسب ذائقہ	نمک		
تین کھانے کے چمچے	تیل		

ترکیب: کڑاہی میں تیل گرم کر کے لہسن سنہری کریں، پھر قیمہ ملا کر بھونیں۔ اس میں شہد ملا کر ڈش میں نکال لیں۔ اسی کڑاہی میں لال مرچوں کا پیسٹ، کالی مرچ، سبزیاں، سویا ساس، چکن کیوب اور تھوڑا سا پانی ڈال کر چند منٹ تک پکائیں۔ اس میں قیمہ

ترکیب: بوٹیوں کو کسی بھاری چیز سے ہلکا ہلکا کوٹ لیں۔ اس میں پھنجا، ادراک، بہادری مصالحہ، لال مرچ، سفید زیرہ، لیموں کا رس، دہی اور نمک ملا کر ایک گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور بوٹیوں کو ہلکی آگ پر پانی خشک ہونے تک پکائیں، اس میں گھی ملا کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار بیف بوٹی ڈش میں نکالیں، اس پر پودینہ اور ہری مرچیں

لوکی گوشت

پودینہ (چوہڈ) : ایک کھانے کا چمچ
 کچا پیتا پیسٹ : دو کھانے کے چمچ
 سرخ مرچ پاؤڈر : دو کھانے کے چمچ
 سفید مرچ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
 ادراک لہسن پیسٹ : دو چائے کے چمچ
 جاتقل : پون چائے کا چمچ
 آئل : حسب ضرورت
 ہری مرچ (کٹی ہوئی) : چار عدد
 پیاز (فرائیڈ) : ایک عدد

اجزاء
 بکرے کا گوشت : آدھا کلو
 لوکی درمپانی (چھلی اور کٹی ہوئی) : ایک عدد
 پیسی ہوئی ہلدی : ایک چائے کا چمچ
 پیسی ہوئی لال مرچ : ایک کھانے کا چمچ
 پیاز (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد
 ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد
 ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا) : ایک گڈی
 پینا ہوا گرم مصالحہ : آدھا چائے کا چمچ
 پانی : دو پیالی
 نمک : حسب ذائقہ
 تیل : ایک پیالی

ترکیب: میرینیشن کے تمام اجزاء بیف پر لگا کر کم از کم 6 گھنٹے تک میرینیٹ کریں۔ پھر پانی ڈال کر ہلکی آٹھ پر گلا لیں۔ چاولوں کو ابلتے ہوئے پانی میں نمک اور 1 کھانے کا چمچ آئل شامل کر کے تھوڑا گل جانے تک ابا لیں پھر چھان کر الگ کر لیں۔ ایک بڑی دیشی میں آئل لگا کر گوشت پھیلائیں اور اوپر ابلے ہوئے چادل ڈال کر ہری مرچ، ہرا دھنیا، پودینہ اور فرائیڈ پیاز چھڑک کر 10 منٹ کے لیے ہلکی آٹھ پر پکنے دیں۔ تیار ہونے پر گرم گرم سرو کریں۔

ترکیب: دیشی میں گوشت، ہلدی، لال مرچ، لہسن اور ک، پیاز، تیل پانی اور نمک ملا کر گوشت گلنے تک پکائیں۔ اسے بھون کر ہری مرچیں، لوکی اور تھوڑا سا پانی ڈالیں اور ہلکی آٹھ پر پکنے دیں۔ لوکی گل جائے اور تیل اوپر آجائے تو گرم مصالحہ اور ہرا دھنیا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔

بوتلک مصالحہ

بیف دم بریانی

اجزاء
 بوتلک کا گوشت (بڑے) : ایک کلو
 (پیس)

سرخ مرچ پاؤڈر : دو کھانے کے چمچ
 کریم : چار کھانے کے چمچ
 ادراک لہسن پیسٹ : تین کھانے کے چمچ
 پیاز (چوہڈ) : تین عدد
 ہری مرچ (باریک کاٹ) : چار عدد
 (پیس)
 دہی : آدھا کپ
 کالی مرچ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
 سفید زریہ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ

اجزاء
 بیف : ایک کلو
 چاول (بھگو لیں) : تین پاؤ
 آئل : حسب ضرورت
 نمک : حسب ذائقہ
 میرینیشن کے لیے : ایک پاؤ
 دہی : ایک کھانے کا چمچ
 خشخاش : ایک کھانے کا چمچ
 لیموں کارس : ایک کھانے کا چمچ
 نمک : ایک کھانے کا چمچ
 ہرا دھنیا (چوہڈ) : ایک کھانے کا چمچ

1 کھانے کا چھج	دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چھج	گرم مصالحہ
1 چائے کا چھج	گرم مصالحہ پاؤڈر	پون چائے کا چھج	ہلدی
1 کھانے کا چھج	چاٹ مصالحہ	ایک کپ	آئل
2 کھانے کے چھج	لہسن پیسٹ	حسب ذائقہ	نمک
2 کھانے کے چھج	ادرک پیسٹ		بگھار کے لیے:
1 کھانے کا چھج	سرخ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چھج	ادرک (جو لین)
4 کھانے کے چھج	پیتا پیسٹ	چار کھانے کے چھج	دیسی گھی
4 کھانے کے چھج	سرکہ	دو عدد	پیاز (تلی ہوئی)
4 کھانے کے چھج	سویا ساس	ایک کھانے کا چھج	گٹی کالی مرچ
حسب ذائقہ	نمک	تین عدد	چھوٹی الائچی
		دو عدد	لونگ

ترکیب: میرینیشن کے تمام اجزاء مکس کر کے ران پر لگائیں اور 1 دن کے لیے رکھ دیں۔ اب ران کو پانی میں ڈال کر ہلکی آج بھجائیں۔ پھر گرم آئل میں فرائی کر لیں۔ اولیو آئل گرم کر کے تمام سبزیوں کے ساتھ کر لیں۔ نمک شامل کر کے اتار لیں۔ ران پر وہی ٹیلو ڈال کر سرو کریں۔

ترکیب: دیگی میں آئل گرم کر کے چوڑے پیاز ڈال کر گولڈن براؤن کر لیں۔ اب اس میں ادرک لہسن پیسٹ، نمک، سرخ مرچ پاؤڈر، ہلدی، کالی مرچ پاؤڈر، زبیرہ پاؤڈر، دہی اور گوشت ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ پانی ڈال کر گوشت گلے تک پکائیں۔ اب ہلکی آج پر گرم مصالحہ اور کریم ڈال کر بھونیں۔ فرائی پن میں دیسی گھی گرم کر کے ادرک، چھوٹی الائچی، لونگ، تلی ہوئی پیاز اور گٹی کالی مرچ ڈال کر بھونیں اور اس کا بگھار کر 15 منٹ تک دم پر رکھیں۔ ہری مرچ اور دھنیے سے گارنش کر کے پیش کریں۔

دودھ سویا

ایک کلو کا پیکٹ	اجزاء
دو کلو	سویا
حسب ذائقہ	دودھ
آدھا پاؤ	چینی
چائے کا ایک چمچ	گھی
دس بارہ عدد	سبز الائچی کے دانے
ایک پاؤ	بادام
	کھویا

ترکیب: دودھ کو ابالیں، کھویا بھون لیں، چینی کا قوام تیار کر لیں۔ گھی میں الائچی ڈال کر کڑکڑائیں اور اس میں سویاں ڈال کر سرخ کر لیں، پھر اس میں چینی کا قوام ڈالیں، ساتھ دودھ اور کھویا بھی ڈال دیں۔ دودھ خشک ہو جائے تو بادام کاٹ کر ڈال دیں۔ گرم گرم نوش فرمائیں۔ ☆ ☆

1-172 کلو	اجزاء
2 کھانے کے چھج	مشن ران
1 عدد	اولیو آئل
1 عدد	پیاز (سلاکسز کاٹ لیں)
1 عدد	شملمہ مرچ (اسٹریپس کاٹ لیں)
1 پاؤ	گاجر (اسٹریپس کاٹ لیں)
حسب ذائقہ	نمک
حسب ضرورت	آئل
	میرینیشن کے لیے:

سنگھار

میک اپ کا دشمن پسینہ

گری میں جب بھی میک اپ کریں اس سے پہلے کسی اچھے آئل کنٹرول فیس واش سے منہ دھو لیں یا پھر آئل کنٹرول ٹونر لگائیں۔ خاص طور پر اپنے نئی زون ایریا میں (یعنی تھوڑی، ناک، پیشانی) پر آئل کنٹرول پروڈکٹ کا استعمال ضرور کریں کیونکہ ان جگہوں پر خاص طور پر زیادہ آئل نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اسی وجہ سے میک اپ نہیں ٹھہرتا۔ فاؤنڈیشن استعمال کرنے کے علاوہ آپ ٹینڈ (Tinted) کنسیلر کا استعمال کریں یہ ایسا کنسیلر ہے جس میں سن بلاک اور سورج کی شعاعوں سے محفوظ رہنے کے لئے S.P.F 60 ڈالا جاتا ہے اور یہ بھی آئل کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کنسیلر استعمال کرنے کے دو فائدے ہیں پہلا چہرے کے داغ دھبے ایک ہی وقت میں چھپ جائیں گے اور دوسرا آپ کو میک اپ بیس کی (Base) بھاری تہہ چہرے پر نہیں لگانی پڑے گی گرمیوں میں کم سے کم بیس لگائیں۔

باتا۔ اگر بیس لگانا ہی چاہتی ہیں تو پاؤڈر بیس یا جس کو میک اپ فاؤنڈیشن کہا جاتا ہے وہ لگائیں ایک فاؤنڈیشن آپ کی جلد کو ایک ہموار اور قدرتی خوبصورتی عطا کرتا ہے اور آپ کے چہرے کو غیر قدرتی طور پر چکنا اور چمکدار دکھائی دینے سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک فاؤنڈیشن کی بعض اقسام گیلے کے بجائے خشک اسٹیج سے بھی لگائی جاسکتی ہیں، اگر آپ کی جلد بہت زیادہ چکنی ہو تو ایسی ایک فاؤنڈیشن پر محض پاؤڈر لگانے سے جلد کا چکنا پن چھپ جاتا ہے اور اگر آپ کبھی غلطی سے چہرے پر بہت فاؤنڈیشن لگا بیٹھیں تو صرف ایک دفعہ چہرے پر اسٹیج پھیر لیں تاکہ زائد فاؤنڈیشن اتر جائے، اس کے بعد اسٹیج پر مزید فاؤنڈیشن نہ لگائیں۔

گرمیوں میں آنکھوں کا میک اپ کرنے کے لئے ایسے آئی شیڈو استعمال کریں جن میں سلیکون کا استعمال کیا گیا ہو، ماہرین کا کہنا ہے کہ سلیکون میں جلد پر ٹھہرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور یہ لگانے کے بعد اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔

جب مسکارہ لگائیں تو اس سے پہلے اپنی پلکوں پر تھوڑا سا عام پاؤڈر لگائیں اور اس پر مسکارہ لگائیں اس طرح کرنے سے مسکارہ آپ کی پلکوں پر اچھی طرح ٹھہر جائے گا اور

گرمیوں میں اسٹیک فاؤنڈیشن اور کریم کی شکل میں ملنے والا فاؤنڈیشن کم استعمال کریں، کیونکہ اس میں پسینہ روکنے کی کم صلاحیتیں ہوتی ہیں اور یہ خود پسینے کی وجہ سے چہرے پر نہیں ٹھہر

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

30 منٹ بنا سیکل چلائیں یا 20 منٹ چہل قدمی کریں اس سے آپ کے جسم کا فالتو مادہ نکل جاتا ہے۔

سلاد

سلاد اور سبزیوں کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں۔ یہ آپ کو توانائی پہنچاتی ہیں اور چہرے کی تازگی کو برقرار رکھتی ہیں۔

میوہ جات

میوہ جات کا استعمال بھی آپ کے چہرے اور جسم کے لئے نہایت مفید ہے اس کے استعمال سے جسم میں قوت اور چہرہ نکھر نکھر نظر آتا ہے۔

بچن میں کام کے دوران

بچن میں کام کی زیادتی کی وجہ سے بھی خواتین کی جلد متاثر ہوتی ہے، گرم موسم میں جہاں مسلسل چولہا جلنے کی وجہ سے درجہ حرارت بہت زیادہ ہو جاتا ہے گھریلو خواتین کو چاہئے کہ وہ کو کنگ کرتے وقت جلد کی حفاظت کا بھی خیال رکھیں اس کے لئے آپ کو چاہئے کہ بچن کا درجہ حرارت بہت زیادہ نہ بڑھنے دیں اس مقصد کے لئے بچن میں کھڑکی ہو تو ضرور کھولیں یا ایگزاسٹ فین چلائے رکھیں چوہے کے قریب کھڑے ہونے کی وجہ سے آگ سے نکلنے والی حرارت جلد کو متاثر کرتی ہے، بچن میں کام کے دوران موجود اشیا کو بھی اپنی جلد کو حفاظت کے لئے استعمال کریں جیسے ٹماٹر کے سپیٹ کو چہرے پر ماسک کی طرح پھیلائیں کو کنگ کے دوران یہ خشک ہو جائے گا تو فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔

پینے آئے کی صورت میں آنکھوں کے ارد گرد نہیں لگے گا اور پللیں بڑی بھی لگیں گی، لپ اسٹک لگاتے وقت پہلے ہونٹوں پر کنسیلر یا فاؤنڈین لگائیں اور اس کے بعد لپ اسٹک یا آؤٹ لائن کا استعمال کریں اس طرح وہ کافی دیر تک رہتی ہے کوشش کریں گرمیوں میں لپ گلوں کا استعمال نہ کریں بجائے لپ گلوں یا گلوں لپ اسٹکس استعمال کرنے کے آپ میٹ لپ کا استعمال کر سکتی ہیں، مندرجہ بالا ہدایت پر عمل کرنے سے آپ کا میک اپ گرمیوں میں بھی اپنی جگہ قائم رہے گا۔

چکنی جلد کے لئے:

جن کی جلد چکنی ہو انہیں چاہئے کہ وہ 2 سیب چھیل کر اسے پیس لیں اور اس میں 1 چمچ شہد شامل کر کے مکس کر لیں پھر اس مکسچر کو 15 سے 20 منٹ کے لئے چہرے پر لگا رہنے دیں اس کے بعد دھولیں۔

خشک جلد کے لئے

3، 5 باوام کو چھلکے سمیت پیس لیں اور اس کا مکسچر چہرے پر لگائیں، اس سے چہرے کا روکھا پن ختم ہوگا اور چہرے کے داغ دھبوں کا خاتمہ ہوگا۔

نارمل جلد کے لئے

کھیرے کو کدو کش کر لیں اور چھان لیں تاکہ اس کا عرق نکل جائے اب اس میں وہی ملا کر چہرے اور گردن پر 15 منٹ کے لئے لگائیں اس کے علاوہ کھیرے کے عراق کو دودھ اور کلیزنگ میں ملا کر بھی لگا سکتی ہیں۔

ورزش

ہلکی پھلکی ورزش جسم کے لئے بہت ضروری ہے، 40 منٹ کی ورزش کریں یا